

# صداقت

رقیبہ بیگم





# صالح

رضیہ بیٹ

# صاعقه

تعبیرات



فیروز سنز اینڈ لیمیٹڈ

ایم۔ اے۔ پبلیشز - کراچی

ریاض بھائی کے نام!  
جن کے پُر خلوص مشورے سے  
صاعقہ کا حُسن اور نکھر گیا۔  
رضیہ بیٹ



اُونچی نیچی کُل پوش پہاڑیوں کے دامن میں پھیلے ہوئے طویل و عریض میدان میں  
 الحمراء کی خوبصورت عمارت اک وقار سے استادہ تھی۔ چاروں طرف قدرت نے حسن کے  
 انمول خزینے لٹائے تھے۔ یہ قطعہ زمین قدرت کی صنّاعی کا شاہکار تھا۔ سبزے کا  
 تخمیلیں فرش، رنگ برنگے پُھول، لہلہاتی میلیں، جھومتے درخت اور ہلکی سی آبشاریں  
 صورت میں کرتا ہوا پہاڑی ندی کا چمکتا ہوا پانی۔ چاروں طرف حسن ہی حسن تھا۔  
 رعنائی ہی رعنائی تھی۔

ایسی جگہ میں رہائشی عمارت کی تعمیر کسی سُن پسند طبع ہی کا انتخاب تھا۔ سرخ  
 گنبدوں اور سنہری ستونوں والی عمارت اس دلفریب ماحول میں گہری ہوئی کسی البیلی  
 حسیّت کی طرح دکھائی دیتی تھی۔

کشادہ کمرے، وسیع برآمدے، خوب صورت گیلریاں، نفیس ڈرائنگ روم،  
 طویل ڈائننگ ہال، آراستہ پیراستہ عمارت اپنے مکینوں کے اعلیٰ ذوق، امارت اور عظمت  
 کی ضامن تھی۔

نواب فاروق علی خاں کو وفات پائے تقریباً بیس برس گزر چکے تھے لیکن اُن کی بیوہ  
 حسن بانو حیات تھیں، اُن کی عمر تقریباً ساٹھ برس سے متجاوز تھی۔ سرخ و سپید  
 پہرے اور چاندنی کی طرح چمکتے ہوئے سفید بالوں نے ان کے رعب، دبے اور وقار  
 میں اضافہ کر دیا تھا۔ صدیوں پرانی روایات کی قائل تھیں۔ زمانہ بدل چکا تھا۔ ذہن  
 بدل چکے تھے۔ سوچ کی راہیں بدل چکی تھیں۔ لیکن ان کے سوچنے کے ڈھنگ نہیں  
 بدلے تھے۔

نام و نمود، وقار اور ظاہری آن بان کے لیے جان کی بازی لگا دینے کی حامی تھیں۔  
 زندگی میں اس نظریے کی بناء پر بڑے بڑے رُوح فرسا حادثات سے دوچار بھی ہو چکی



تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے نظریے میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

خدا نے سعادت مند اولاد دی تھی۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، منجملہ بیٹا ظاہر اپنی یادگار صاعقہ کی صورت میں دے کر دلخ مزارقت جوانی ہی میں دے گیا تھا۔ بڑا بیٹا اظہر اور چھوٹا فخر۔ دونوں بیٹیاں انجم آرا اور حسن آرا سب کی جوان سال اولادیں تھیں۔ لیکن ماں کے ادب و احترام میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

حسن بانو کی پھلواری بڑی شاداب تھی۔ لہلہاتے پھولوں، کھلی کونپلوں اور پھوٹے شگوفوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی تھیں۔ بچوں کے بچے انھیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ دونوں بیٹوں سے سکی بھانجیاں سیابی تھیں۔ اس لیے محبت اور مستحکم ہو گئی تھی۔

یوں تو سبھی بچے ان کی آنکھوں کا تارہ تھے لیکن سب پر فوقیت رحمان کو حاصل تھی۔ جوان سال رحمان تو جیسے ان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کے بڑے بیٹے کا پہلا بیٹا تھے۔

رحمان دادی کے التفات کو جاتے تھے۔ شوخ تو بچپن ہی سے تھے۔ اس التفات نے اور شہ دے رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب اور جو بات بھی کہہ دیتے، دادی کو ماننا پڑتی۔ دادی حضور کے رعب اور دبے نے اگر کسی سے مرعوب ہونا سیکھا تھا تو وہ صرف رحمان کے چو نچلے تھے۔ ورنہ اور سب کے لیے تو وہ ایک مطلق العنان فرمان روا سے کم نہ تھیں۔

محل کی فضا بڑی خوش گوار تھی۔ فخر کے چھوٹے بچوں اور حسن آرا کی آخری بچی کے علاوہ سبھی حصول تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ فراغت قبچہ ہوں کے طوفانوں اور خوشیوں کے سیلابوں کی صورت میں پھوٹ رہی تھی۔ الحمراء کے در دیوار، فکر فردا سے بے نیاز اور غم ماضی سے نا آشنا حال کی آسودگی سے ہم کنار جوانیوں کے مہکتے شب و روز کے گاتھے تھے۔

ہر دن عید اور ہر شب شہ رات تھی۔ زندگی ان کے لیے کھانے رنگین لہجہ ہوا کھدستہ تھی۔ پھول ہی پھول بکھرے تھے چاروں طرف، حسن ہی حسن کی گروہ پیش۔ کھیل تماشے، سیر و تفریح، دلچسپ صحبتیں، خوش گوار نشستیں اور

ماحول فردوسی رعنائیوں کا حامل تھا۔ لیکن

اس فردوسی رعنائیوں کے ماحول میں۔۔۔ جہاں قہقہے طوفانوں کی صورت میں اٹھتے تھے۔ جہاں نوشیوں کے بحرناہید کنار ٹھانٹیں مارتے تھے، جہاں زندگی کے حسن پر کوئی تلخی سایہ لگن نہ تھی، جہاں اہل خانہ تو ایک طرف گنیزس اور خدام بھی لطف زندگانی لے رہے تھے، اک ہستی ایسی بھی تھی جو اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی اس کی دل فریبیوں سے فیض یاب نہ ہو سکتی تھی۔ وہ تھی صاعقہ۔

صاعقہ

صاعقہ۔۔۔ ظاہر مرحوم کی واحد یادگار۔ بن ماں کی بچی جس نے اس عشرت کدے میں جنم لیا۔ پٹی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ لیکن اسے زندگی کے کھانے رنگین نہ ملے۔ چاروں طرف کاٹے ہی کاٹے منظر آئے۔ طنز و تمسخر نے قدم قدم پر اس کا پیچھا کیا۔ نفرت و حقارت بر سائی، نظروں نے ہمیشہ اس کا تعاقب کیا۔

میس سال

پورے میس سال گزر چکے تھے۔ یہ سال اس کے لیے لمحات نشاط کے حامل تھے۔ جو گزرتے پتہ نہ چلتے۔ یہ میس سال تھے جن میں ہزاروں دن، لاکھوں گھنٹے اور کروڑوں منٹ تھے۔ یہ ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں اذیتیں تھیں جو صاعقہ نے سہیں۔ زندگی کے لمحے لمحے نے اس کے خون کے قطرے قطرے کا امتحان لیا تھا۔

صاعقہ دست قدرت کا شاہکار تھی۔ اس کا ملکوتی حسن اک خاص شان کا حامل تھا۔ چھٹی رنگ جو دائمی اداسی سے اک کشش بے پناہ لیے ہوئے تھا۔ حسین سرمئی آنکھیں جن میں خوابیدہ جاوید چوک اٹھنے کو بیتاب تھا۔ نرم و گداز جسم، انتہائی موزوں قد، رعنائی و دل فریبی کا مرقع تھی وہ۔

آواز میں لغووں کا رس تھا۔ زیر و بم میں شگفتہ ہوا و فمحل دل میں کسک پیدا کر دیتا تھا۔ عمر کے محشر ہدایاں دور میں داخل ہو چکی تھی۔

لیکن

اس کے حسن کی محشر سلانیوں سے جیسے کوئی اکاہ ہی نہ تھا۔ نہ رحمان نے کبھی اسے



اپنے قصور میں بسایا تھا نہ اسد و فرخ نے اپنے سپنوں میں اسے بھولے سے جگہ دی تھی۔ نہ فریدوں و شاہد نے اس کے متعلق کسی رومانی خیال کو ذہن میں آنے دیا تھا۔ یہ تو خیر بہت دور کی بات ہے۔ کسی نے بھی اسے بچاؤ لطف و کرم تک نہ بخشا تھا۔ صاعقہ نے ہمیشہ ان کی نظروں میں اجنبیت پائی تھی یا طنز کی چمک دیکھی تھی۔

وہ جب تک شعور کو نہ پہنچی تھی، اس ناروا سلوک کو نہ سمجھتی تھی۔ دادی سے لے کر گھر کے آخری فرد تک اس سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ صرف انجم پھوپھی تھیں یا خیر چچا جن کا رویہ اہل خانہ سے کچھ مختلف تھا۔ لیکن اس سے صاعقہ زندگی کا سکون نہ پاسکی تھی۔ انجم پھوپھی دور رہتی تھیں۔ کبھی کبھار آنا ہوتا تھا اور خیر چچا ماں کے جلال اور بیوی کے تیوروں کو دیکھ کر اس سے کھلم کھلا فیاضانہ سلوک نہ کرتے تھے۔

صاعقہ بچی تھی۔ تو کچھ نہ سمجھ سکتی تھی۔ اپنے ہم عمروں سے کھیلنے کو دینے کی تمنائی تھی اور بار بار اس تمنائی کے تلخ سزا ملی تھی۔ اس کے شعور نے جلد ہی ان تلخیوں کو جانچنا سیکھ لیا۔ وہ خود بخود اپنے ہم عمروں سے دور ہوتی گئی۔ اس نے اپنی ذات کو الگ تھلگ کر لیا۔ اس کے مزاج میں اپنے باپ کا سا شاہانہ وقار تھا۔ وہ بلا ضرورت کسی سے بات کرتی نہ کسی کے پاس بیٹھتی۔

اس کھنڈ کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ ہم عمروں کا رویہ گو بدل نہ سکا، ہاں کچھ نرم ضرور ہو گیا۔

لیکن

ان کے رویے کی معمولی سی تبدیلی صاعقہ کی المناک زندگی سے رنج و غم کے مہیب سائے نہ ہٹا سکی۔ اس کی ذات کو اب تک اسی شدت سے منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ متفرق اپنی جگہ موجود تھا۔

بعض اوقات تو اس کا بے اختیار جی چاہتا کہ اس ناقابل برداشت ماحول سے کہیں دور۔۔۔ بہت دور بھاگ جائے۔

لیکن اس کے لیے جالے پناہ کہیں بھی نہ تھی۔ اکثر مایوس ہو کر سوچا کرتی کہ اپنے آپ کو پہاڑی ندی کے تیز رفتار پانی کے حوالے کر دے۔ محل کی پچھلی بالکنی سے اس ندی میں کود جائے جو محل کے نشیبی حصے سے گرا کر گزرتی ہے۔

لیکن سوچی اور شے ہے اور عمل اور۔۔۔۔۔ زندگی ہزار بار بے رنگ رہی۔ پھر بھی

اپنی جاؤیت نہیں کھوتی۔ انسان جیتا ہے اور بٹے چلا جاتا ہے۔ صاعقہ بھی انسان تھی۔

سینے میں گوشت پوست کا دھڑکتا دل تھا۔

دل۔۔۔ جو

زندگی کی تال سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکنے کی آرزو تو رکھتا تھا۔

اور۔۔۔ اور جب سے اس دل نے ایک مرکز چن لیا تھا۔ صاعقہ کی زندگی بے شک بوجھل تو کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ تاہم اس بوجھ میں بھی اک حسن نکھر آیا تھا۔ رنگینی ابھر آئی تھی۔ جینے کی تمنائیں کی بجائے کچھ شدید سی ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے دل نے انجان پنہ میں جو مرکز منتخب کیا ہے۔ وہ اس کی دسترس تو کیا سوچ سے بھی دور ہے۔ ریحان۔۔۔ کہاں وہ اور کہاں ریحان۔

ریحان! جس نے تنفن طبع کی خاطر ہمیشہ اسے تنہا مشق بنایا تھا۔ جس کی آنکھوں میں اس نے ہمیشہ اجنبیت پائی تھی۔ جس نے ہمیشہ اسے حقارت سے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ سب کچھ جانتی تھی۔ لیکن دل تو آخر دل ہی تھا۔ کہے سنے میں آنے کی چیز تھوڑی ہی تھی۔

صاعقہ کی زندگی کچھ عجیب طرح ڈوبتے ابھرتے گزر رہی تھی۔ احمق دل کی گستاخانہ حرکت پر کبھی تو ہنسی آجاتی۔۔۔ کبھی رونا۔۔۔ کوئی مونس و ٹکسانہ تھا۔ حالات کی یہ نئی افتاد تو بعض اوقات اسے اس قدر پریشان کر دیتی کہ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھیگی۔

لیکن ان پریشانیوں کے لمحوں میں تسکین کا سہارا آیا کی آغوش تھی اس کی آیا واحد ہستی تھی جو اس کے زخموں پر پھیلا رکھ دیتی تھی۔ آیا نے اسے پالا پوسا تھا۔ اس کے دکھ کو دکھ جانا تھا۔ ماں کی سی شفقت کے دامن اس کے لیے پھیلائے تھے۔ تیز اور قہر ساقی نظروں سے اسے حتی المقدور دور رکھنے کی کوشش تھی۔ آیا کا وجود ہی تھا جو صاعقہ ایسے ناساز کار ماحول میں زندگی کی ڈوری تھامے بڑھتی چلی گئی تھی۔

دیکھنے میں آیا جتنی کریہہ المنظر تھی، دل کی اتنی ہی حسین تھی۔ کسی حادثے میں جل جانے سے اس کی ہیئت ہی پرل پکی تھی۔ پھر سے کانچا کچا گوشت کہیں سے سفید کہیں سے سیاہ تھا۔ ایک آنکھ اوپر کو کھینچ گئی تھی۔ بال ہموئے ہموئے اور کھر دے سے تھے۔



دیکھنے میں غامض ہیبت ناک تھی۔ لیکن صاعقہ نے اس کی آغوش میں ہمیشہ پیار کی  
ٹھنڈک اور سکون پایا۔ وہ اس کی سچی بہن اور غم کسار تھی۔ اس کا دل جب کبھی اٹا تو آیا کی  
میتا بھری آغوش میں اسے حقیقی سکون ملتا۔ رونے کو دل مچلتا تو آیا کا دامن پھٹکتے  
آنسوؤں کو سہارا دیتا۔ گھر والوں کے بے رحم رویے اور ناروا سلوک سے جب وہ دل  
برداشتہ ہو جاتی تو صرف آیا ہی اس کی تپتی ہوئی ذہنی کیفیتوں پر پیار کی ٹھنڈک کے پھینٹنے  
دیتی۔

زندگی اسی ڈھنگ سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ صاعقہ ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہی  
تھی۔ ان واقعات کی تلخی سہہ رہی تھی جو اس کی پیدائش سے قبل وقوع پذیر ہونے  
تھے۔ اس کا کوئی دوش نہ تھا۔ کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن وہ مورد الزام ٹھہرائی گئی تھی۔  
استقامتی جس اک ناکردہ گناہ کو کچل کر شاید تسکین پا رہی تھی۔

اکیس بائیس برس ادھر کی بات ہے۔  
نواب فاروق علی خاں زندہ تھے۔ ائمہ کی حیات افزو رونقین انہی کے قدم سے  
تھیں۔ لیل و نہار کی گردشیں ان دنوں اک خاص حسن کی حامل تھیں۔ ضابطہ اور اصول  
ان کی زندگی کے اہم جزو تھے۔ لیکن یہ گھریلو زندگی کی دلکشی پر اثر انداز نہ ہوئے تھے۔  
بڑے لڑکے اور دونوں لڑکیوں کی شادیوں سے فارغ ہو چکے تھے۔ ان دنوں منجھلے  
بیٹے طاہر کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ چوبیس پچیس سالہ خوب رُو طاہر فاروق علی خاں  
کو دوسرے بچوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی عزیز تھے۔ اسی پیار نے طاہر کی طبیعت میں  
ہٹ اور ضد کو جنم دیا تھا۔ من مانی کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔  
ماں کی مخالفت کے باوجود پچھلے سال یورپ کے تفریحی دورے پر محل گئے تھے۔  
فوٹو گرافی کا شوق جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ یورپ سے جب لوٹے تو آدھے سے زیادہ  
سامان چھوٹے بڑے کیمروں۔۔۔ اپنی بنائی ہوئی بے شمار تصویروں اور فوٹو گرافی کی  
دوسری چیزوں پر مشتمل تھا۔

طاہر جب سے یورپ سے لوٹے تھے۔ شغل ہی یہی رہ گیا تھا۔ اکثر صبح ہی صبح کیمرہ  
کندھے پر ڈال کر محل جاتے۔ قدرت کے بکھرے ہوئے انمول غزنیوں کو سلولائیڈ پر  
منعکس کرتے۔ اونچی اونچی محل پلاش پہاڑیاں گنگنائی ندی۔۔۔ مترنم شور پیدا کرتے  
ہوئے بھرتے۔۔۔ جنگلی خورد و ہوا دے، دیہاتی دو شیرنائیں جانوروں کے ریلوں سورج کی  
ذوہتی ابھرتی روشنی، سبھی کچھ ان کے کیمرے کی آنکھ میں مقید ہو جاتا۔

پاندنی راتوں کا فوس خیز حسن انھیں لگا رہتا اور وہ چپ چاپ اپنا کیمرہ اٹھا کر باہر محل  
جاتے۔ رات گئے تک ماحول کے حسن عکس کیمرے کی آنکھ میں جلوہ کر رہتے۔  
فرق کی لگن فکاہ کو اپنی ہستی سے بے کلمہ بنانے جا رہی تھی اور یہی۔۔۔ کنگی جہانگیر



منظروں میں فٹنٹے لگی۔  
 حسن بانو بحیثیت ماں اس بھانگی کو آوارہ گردی سے تعبیر کرتی تھیں جس کی فوری  
 روک تھام کے لیے ان کی نظر میں شادی ضروری شے تھی۔  
 وہ موسم کی ایک خوش گوار رات تھی۔ چاند کا سفید سینہ چرخ پر آہستہ آہستہ ابھر رہا  
 تھا۔ خشک ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ دن بھر سورج کی تمازت سے گھبرایا ہوا  
 ماحول فرحت بخش سکون میں ڈوب رہا تھا۔  
 الخراء کے دائیں چمن میں نواب فاروق علی خاں اور حسن بانو بیٹھے تھے۔ پانچ سالہ  
 ریحان ان کی توجہ و دل چسپی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کی طفلانہ حرکتوں سے دونوں محفوظ ہو  
 رہے تھے۔  
 ”اسے دیکھ کر مجھے اکثر ظاہر کا بچپن یاد آ جاتا ہے۔“ حسن بانو بڑی شفقت سے ریحان  
 کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں:  
 ”بالکل اسی پر کیا ہے۔۔۔۔۔“ نواب فاروق علی خاں پیار سے پوتے کو دیکھ کر  
 بولے۔ ”شکل و صورت میں بھی تو انیس بیس ہی کا فرق ہے۔۔۔ وہی ناک منقشہ۔۔۔  
 بچپن میں وہ بھی تو ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔“  
 ”بال تو ہو ہو ظاہر کے ہیں۔۔۔۔۔“ حسن بانو نے ریحان کو گود میں لے لیا۔ جو تھک  
 کر اب سو جانے کو تھا۔  
 ”مزاج بھی اسی کا ہے۔“  
 ”ہائے اللہ۔۔۔۔۔ مزاج تو اس جیسا نہ ہو۔ فتنہ کی جہاں کا۔۔۔۔۔“  
 ”فتنہ ضرور ہے۔ لیکن گستاخ نہیں۔“  
 ”میں نے کب کہا گستاخ ہے۔ لیکن فتنہ۔۔۔۔۔ تو یہ یا اللہ جو بات ایک بار کہہ دے، پھر  
 پلکیر ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ کیا بھال جو پوری نہ ہو اس کی بات۔“  
 ”یہ تو اس کے کردار کے نمونے کی نشانی ہے میٹکم۔“  
 ”اوہ۔۔۔۔۔ آپ نے یہی کہہ کہہ کر اسے ہر چڑھا رکھا ہے۔ شروع ہی سے اس کی ہر  
 جائز ناجائز خواہش پوری کرتے آئے ہیں۔“  
 ”یہ سراسر زیادتی ہے۔ میٹکم۔“ نواب پیار سے بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔  
 ”اس کی جائز بات ہم نے ہمیشہ مانی ہے۔ میں تو کہوں گا اس نے ناجائز خواہش کبھی ک

ہی نہیں۔۔۔۔۔“  
 ”کیا کہنے“  
 ”اور کیا۔۔۔۔۔ اس کا مطالبہ ہمیشہ جائز اور معقول ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم ذرا قراخ  
 دلی سے کام لے لیتے ہیں۔۔۔ مناسب۔۔۔۔۔“  
 ”خاک مناسب۔۔۔۔۔“  
 ”کیوں؟“  
 ”اور کیا“  
 ”کوئی نامناسب مطالبہ ہم نے پورا کیا اس کا؟“  
 ”ابھی کچھ زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔“  
 ”کس بات کو؟“  
 ”اس کی ہٹ۔۔۔۔۔ جو آپ نے پوری کر دی۔“  
 ”کوئی؟“  
 ”ابھی پچھلے سال کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔“  
 ”اوہ۔۔۔۔۔“ نواب پھر دھیرے سے مسکرا کر بیوی کی طرف دیکھ کر بولے ”تمہارا  
 مطلب اس کے یورپ جانے سے ہے۔“  
 ”اور کیا“  
 نواب فاروق علی خاں نے ہنس کر کرسی کی پشت سے کمر کھادی۔  
 ”بڑی جائز بات تھی نا“ بیوی پیار بھرے شکی انداز میں بولی۔  
 ”نامناسب بھی تو نہ تھی۔ اس عمر میں سیر و سیاحت کا کسے شوق نہیں ہوتا۔“  
 ”یہاں شادی کی بات شروع تھی اور وہ سیر کے پروگرام بنا رہا تھا۔ کتنا سہرا ٹٹکا میں  
 نے۔۔۔۔۔ لیکن بات آخر اسی نے منوانی۔“  
 ”کوئی بات نہیں میٹکم۔۔۔۔۔ شادی بھی کروں گے۔“  
 ”جانے کب کر دیں گے۔۔۔۔۔“  
 ”انشاء اللہ اب کے سردیوں میں اس فرض سے بھی سبک دوش ہو جائیں گے۔“  
 ”اور اگر سردیوں میں اس نے پھر کوئی مناسب و معقول مطالبہ سیر و تفریح کا کر دیا  
 تو۔۔۔۔۔؟“ میٹکم نے تکیھی، مسکراتی اور پیار بھری نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

”تو پھر شادی اگلی سردیوں تک ملتوی کر دی جائے گی۔“ نواب فاروق نے دانستہ  
سیکم کو چھیڑا۔

”اگلی کیوں۔۔۔ اس سے بھی اگلی سردی میں کہیئے۔“ سیکم خفا ہو گئیں۔ گو دو میں  
سوئے ہوئے ریحان کو سنبھالا۔ وہ اٹھنے کو تھیں کہ نواب نے ہنستے ہوئے ہاتھ پکڑ لیا۔  
”خفا ہو گئی؟“

”خفی کس بات کی؟“۔۔۔ وہ بدستور خفا تھیں۔۔۔ ”پچھ سو گیا ہے گو دو میں نیند  
خراب ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“

”کنیز لے جائے گی۔ ٹھہرو میں بلا تا ہوں۔۔۔۔۔ وہ جا رہی ہے۔۔۔۔۔“  
انہوں نے بیٹھے بیٹھے کنیز کو پکارا۔ وہ لپک کر آئی اور حسن بانو کی گو دو سے ریحان کو لے  
کر چلی گئی۔

حسن بانو روٹھی روٹھی بیٹھی رہیں۔ نواب فاروق چند لمحے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر  
کھٹکھٹا کر ہنس دیئے:

”معاذ کیوں ہو گئیں۔ کہہ جو دیا۔ اب کے سردیوں میں شادی ہو جائیگی۔ کبھرانے  
کی کیا بات ہے۔“

”ابھی کوئی بات ہی نہیں۔۔۔۔۔ چھ سال ہو گئے منگنی کو۔۔۔۔۔“  
”وہ تو ہونا ہی تھے۔ کل گیارہ برس کی تھی فوزیہ۔۔۔۔۔ جب ہم نے یہ نسبت  
ٹھہرائی۔“

”اب تو سترہ اٹھارہ برس کی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“

معقول عمر ہے۔۔۔۔۔ طاہر بھی ماشاء اللہ پچیس سال کا ہو گیا ہے۔“  
”چھ بیسوس میں ہے۔ اس کی عمر میں تو افلہر کے ماشاء اللہ تین بچے بھی ہو گئے  
تھے۔“

”وہ تو ہم نے اس کی کم عمری ہی میں شادی کر دی تھی۔ بیس برس کا بھی نہیں ہوا  
تھا۔“

”کوئی بری بات تو نہیں۔ کس خوب صورتی سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھا رہا ہے، اکہ  
ہے کہ سارا دن آوارہ گردی۔۔۔۔۔“

”سیکم۔۔۔ اس کے شوق کو آوارہ گردی نہ کہو۔ تمہارا بیٹا ایک عظیم فن کار ہے۔“

”تمہیں اس بات پر فخر ہونا چاہیئے۔“  
سیکم نے برا سامند بنایا۔ طاہر کی فن کارانہ صلاحیتوں کو پر کھنے یا ان کی تعریف کرنے  
سے زیادہ انہیں اس کی شادی کا فکر تھا۔

دیر تک حسن بانو اور نواب فاروق اسی شادی کی باتیں کرتے رہے۔ حسن بانو کی بہن  
کی دونوں لڑکیاں انہوں نے اپنے بیٹوں سے بچپن ہی میں منسوب کر دی تھیں۔ بڑی کی  
تو شادی ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ ریحان۔۔۔۔۔ ماہ رخ اور شاہ رخ تین بچے بھی  
ہو گئے تھے۔ لیکن فوزیہ کا حاملہ التواء میں تھا۔

حسن بانو یہ شادی جلد کرنے کی متمنی تھیں۔ بہن کی طبیعت اکثر ناساز رہا کرتی تھی۔  
”نگہت بانو بیمار رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ جیتے جی اس فرض سے سبکدوش ہو  
جائیں۔۔۔۔۔“ حسن بانو نے کہا۔

”بہن خود اس بات کا احساس ہے۔۔۔۔۔“ نواب سنجیدگی سے بولے۔ ”اس دفعہ  
سردیوں میں یہ کام بھی نہٹ جائے گا۔“

”نگہت بانو سے کہہ دوں۔ بیٹی والی ہیں۔ تیاری کے لیے بھی توجہ دے رہا ہے۔  
پھر چند مہینے ہی تو ہیں۔۔۔۔۔“

”ضرور کہہ دو۔۔۔۔۔“ نواب نے فیصلہ کن آواز میں کہا۔ ”تم خود بھی تیاری شروع  
کر دو۔۔۔۔۔ ہم یہ شادی اک خاص شان سے کرنا چاہتے ہیں۔“  
”کیوں؟“ سیکم تکی تکی نظروں سے دیکھ کر مسکرائی۔

”ہمارے طاہر کی شادی جو ہے۔“  
”بڑا آیا لاڈلا۔۔۔۔۔“

”وہ تو سب جانتے ہیں۔۔۔۔۔ ہمیں اعتراف بھی ہے۔۔۔۔۔ ساری اولاد سے زیادہ  
عزیز ہے ہمیں۔۔۔۔۔“

سیکم نے اک فخر سا محسوس کیا۔ محبوب شوہر کے عزیز ترین بیٹے کی ماں جو تھیں۔



دوپہر کچھ گرم تھی۔ طاہر حسبِ عادت کیمبرہ کندھے پر لٹکائے اونچی نیچی نکلپوش پہاڑیوں پر گھوم رہے تھے۔ دھوپ چھاؤں کے امتزاج کو مختلف زاویوں سے جانچ رہے تھے۔ آج کچھ ایسے دلاؤز اور دلکش مناظر دیکھنے میں آ رہے تھے کہ طاہر کو وقت اور گرمی کا احساس ہی نہ رہا۔ چاکلیٹ پتلون اور سفید قمیص پہنے کبھی پہاڑیوں کے نشیب میں نظر آتے کبھی چوٹیوں پر۔

سپہر ڈھل رہی تھی۔ لیکن ڈوبتے سورج کی آڑی ترچھی کرنوں کی حدت بھی کافی تھی۔ یہاں کا موسم گرمیوں میں بھی خاصا خوش گوار ہوا کرتا تھا۔ صرف چند دن سورج کی عکاسی ماحول کو جھلسا دیا کرتی تھی۔ پھر کہیں نہ کہیں سے ابر و باراں آ جاتے۔ تیز ہوائیں چلتیں۔ بارش برستی اور موسم پر جاننا پہچانا نکھار آ جاتا۔

آج گرمی خاصی تھی۔ طاہر کو اس کی شدت کا احساس اس وقت ہوا جب ان کا حلق سوکھ گیا۔ پیاس محسوس ہوئی۔ وہ اس وقت ٹورو پھولوں کے کنج کے قریب کھڑے تھے۔ وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے گرد و پیش نظر دوڑائی۔ کوئی قدرتی جھرنہ قریب دکھائی نہ دیا۔

وہ گھوم کر دوسری طرف مڑ گئے۔ کچے راستے پر چلتے ہوئے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ پیاس شدت اختیار کر گئی۔ اپنے ٹھک ہوٹوں کو انھوں نے کئی بار زبان سے ترکیا۔ قدرے ہموار حصے میں آ کر انھوں نے پھر متجسس نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ ادھر دو تین موڑوں پر چند کچے مکانوں کے کواڑ نظر آ رہے تھے۔ پیاس نے اس حد تک تشہل کر دیا کہ وہاں تک جانے کے خیال ہی سے انھیں گھبراہٹ ہونے لگی۔ مگر دائیں جانب دیکھا۔ دوسری پہاڑی پر سبزے میں گھرا ہوا جھرنہ دکھائی دیا۔ پانی پھوٹ پھوٹ کر بہ رہا تھا۔

چمکتا ہوا پانی دیکھ کر انھیں سکون اور ٹھنڈک کا احساس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحہ ان پر وہی پہلی سی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس جھرنے تک پہنچنے کے لیے انھیں پھر نیچے اتر کر دوسری پہاڑی پر چڑھنا تھا۔

طاہر تھک چکے تھے۔ درختوں میں گھرے ہوئے بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر سنانے لگے۔ چند منٹ آرام کرنے سے بدن میں تازگی آ سکتی تھی جو انھیں جھرنے تک پہنچنے کی ہمت دلا سکتی۔

درختوں کی چھاؤں میں ہوا کچھ خوش گوار سی تھی۔ طاہر نے کیمبرہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور درخت سے کمر ٹکا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اٹلینان سے نیم دراز ہو گئے۔ آنکھیں بند کر کے وہ پیاس بجھانے کا کوئی نفسیاتی علاج سوچنے لگے۔

اچانک انھیں یوں محسوس ہوا جیسے قریب ہی کہیں شرقی گھنٹیاں جھنجھٹا اٹھی ہوں۔ بلکہ بلکہ نسوانی قہقہوں کا مترنم اور نغمہ بار شور سکوت کے سینے میں گہری سی کرنے لگا۔ طاہر نے آنکھیں کھول دیں۔

اب سکوت طاری تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف متجسس نظروں سے دیکھا۔ کوئی منظر نہ آیا۔

اب بار پھر وہی نغمہ بار اور مترنم شور گونجا جیسے رنگین ساغر کشک گئے ہوں۔ اب آواز اور قریب سے آرہی تھی۔

اس قربت نے سمت سے آگاہ کیا۔ طاہر کی نظریں اس میڑے میڑے کچے پہاڑی راستے کی طرف اٹھ گئیں۔ جو اوپر کی طرف سے آرہا تھا۔ اور جس کے کنارے دو بڑے سے ایک پتھر پر خود بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ راستہ اوپر کے کاؤں کو جاتا تھا۔

طاہر کی نظریں اس راستے پر لگی تھیں۔ قہقہوں اور باتوں کی آواز قریب۔ آتی جا رہی تھی۔ طاہر کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے فضا میں شہنائیوں کی گونج بس مری رہے۔

اور  
پھر



اور

تیسری نے جیسے دو قدم اک لمحے میں اٹھا کر جست سی بھری اور دوسری کو دھکیل کر پہلی کے برابر ہو گئی۔

پھر چوتھی لڑکی بھی بڑھی۔

”مجھے تھوڑا سا پانی پلا دیجئے۔“ ظاہر انھیں اس بے اعتنائی سے جاتے دیکھ کر قدم بڑھا کر چوتھی لڑکی کے برابر آگئے۔

وہ لڑکی رُکی۔

اور پھر تینک اگر کھڑی ہو گئی۔

ظاہر نے اس کے سراپا کو دیکھا۔ حسن و جمال کی مکمل تصویر ان کے سامنے تھی۔ سرخ و سپید چہرے پر بھیکے بالوں کی لٹیں چمک رہی تھیں۔ شبہی آنکھوں میں فسوں خیز چاندنی کا عکس تھا۔ ظاہر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی لڑکی نہیں بلکہ فطرت کا ایسا رو پہلی جال ہے جو روحوں کو مقید کرنے کے لیے ساری فضا میں پھیلایا گیا ہے۔

ظاہر شدہ سے اس ہیکر جمال کو دیکھتے رہے۔

”کیا کہتے ہو“ لڑکی نے خالص دیہاتی انداز میں پوچھا۔ اس کی ساتھی لڑکیاں اٹھاموڑ مڑتے ہوئے وحشت زدہ ہرنبیوں کی طرح گردنیں گھما کر انھیں دیکھ رہی تھیں۔

”تھوڑا سا پانی پلا دو“ طاہر نے اس کی شبیہی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ لڑکی کا اکھڑا سا بوجھ جانے کیوں دل کو بھاسا گیا۔

”پانی“ وہ ابرو کھینچ کر بے مکانگی سے پوچھنے لگی۔

۴۴

”کیا کرو گے؟“

”سور کا“

"*Chrysomelidae*"

42

”وہ سامنے دیکھو بلوریں گردن کو دائیں رخ موڑ کر اس نے دوسری پہاڑی پر بھٹ بھٹ کر پہننے والے جھرنے کی طرف اشارہ کیا۔

ظاہر کے قریب ہی موڑ پر عین چار نسوانی مجسمے ابھرے۔ پہاڑی مکاؤں کی الہڑ جوانیاں سروں پر پانی کی مٹاگرس اٹھائے خرماں خرماں اوپر چلی آرہی تھیں۔ ان کے جواں سال جسم سر پر رکھے ہوئے بار کی وجہ سے بار بار رڑکی طرح لچک کھا رہے تھے۔ پانی چھلک چھلک کر گر رہا تھا۔ اور ان کے لال پیلے ڈھیلے ڈھالے لباس جسم سے چپک چپک جاتے تھے۔

ظاہر نے ایک منظر انہیں دیکھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کے افق پر ایک وقت کئی جاندار طلوع ہو گئے ہوں۔

لڑکیاں ہنستی مسکراتی ایک دوسرے سے میٹھی میٹھی چھیڑ چھاڑ کرتی بے دھڑک چلی  
آ رہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو طاہر اس حسین جلوے کو ضرور سلولائیڈ پر منتقل کر  
لیتے۔ لیکن اس وقت انہیں شدت سے پیاس لگ رہی تھی۔ مگروں سے چھلکتے پانی  
نے بے صبر بنا دیا۔ زندگی کی ازلی ضرورت پورا کرنے کا خیال مقدم تھا۔

جھگڑنے کی طرف جانے کا تکلیف دہ مسئلہ قدرت نے خود ہی حل کر دیا۔ ظاہریالوں کو جھٹک کر ماتھے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

لڑکیاں موڑ مڑتے ہی ان کے سامنے تھیں۔

اک اجنبی کو اس طرح راستے میں کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئیں۔ بے اختیار سب کے ہاتھ اپنے دوپٹوں کی طرف گئے۔ بھیگے دوپٹے لاشعوری طور پر سب نے اپنے سینوں پر پھیلانے کی کوشش کی۔

وہ سمجھیں

کترامیں

184

سنگ راستہ پر آگے پہنچے ہو کر طاہر کے قریب سے گزرنے کے لیے بڑھیں۔  
انھیں اوجھ جانا تھا۔

”فراشتیے“ ظاہر نے بڑی لجاہت سے پہلی لڑکی کو مخاطب کیا۔  
لیکن وہ بغیر اس کے آگے نہ بڑھی۔

طرح محسوس کی تھی یہ بات۔۔۔۔۔ اس کے حواس پر کبیرا ہٹ تھی۔ طاہر نے ابھی

کے لئے بھی اسے بغیر آکر دے گا



”وہ تو منتظر آرہا ہے۔“

”تو جاؤ۔۔۔ پانی پی لو۔“

”وہاں تک جاسکتا تو بات ہی کیا تھی۔“ طاہر جلدی سے بولے۔

”کیوں نہیں جاسکتے؟“ حیرت سے لڑکی کی حسین آنکھیں کچھ پھیل سی گئیں۔ طاہر کو سر جاپا بڑی معصومیت سے گھور کر دیکھا۔

”لکھنؤ کا یہ حسین انداز دل ہی میں تو اتر گیا۔ پیاس کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی روح بھی تشنہ محسوس ہوئی۔“

”میں وہاں تک نہیں جاسکتا۔ پیاس سے زبان سوکھ رہی ہے۔ مجھ میں ہمت نہیں۔“

”ہونہ۔“ لڑکی نے تسخراہ انداز میں اپنی کومل سی ناک سکوڑی اور پھر انھیں گھور کر بولی ”اتے بٹے کئے تو ہو۔ وہاں تک نہیں جاسکتے۔“

وہ اک شان بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ تیز قدم اٹھا کر وہ اپنی ہم جولیوں سے جا ملی جو موڑ پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

طاہر اس کافر حسینہ کو دیکھتے رہ گئے۔

”کیا کہتا تھا؟“ لڑکی کی ہجولی کی لمبی سی سرگوشی ابھری۔

”کہتا تھا پانی پلا دو۔ پیاس لگی ہے۔“ لڑکی بے پروائی سے بولی۔

”پلا دو انھیں ناجی۔ بیچارے کو اللہ جانے کتنی پیاس تھی۔“

”تم پلا دو“ ناجی الجھ پڑی۔

”مجھ سے تو اس نے مانگا ہی نہیں۔۔۔۔۔“ پہلی لڑکی بولی۔

”کھڑی کیوں ہو گئی ہو۔۔۔۔۔ آگے بڑھو۔“ دوسری لڑکی نے کہا۔

”دیکھو تو بیچارہ کتنی حسرت سے دیکھ رہا ہے۔۔۔۔۔“ تیسری لڑکی نے مڑ کر دیکھنے ہوئے کہا۔ ناجی نے ہکا سمیت گردن موڑ کر دیکھا۔ طاہر کی ہکھاپیں انھیں پر لگی تھیں۔

”ناجی“

”کیا ہے؟“

”ہی بات ہے۔“

”کیا؟“

”اے پانی پلا دو بیچارہ بیٹے۔“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ ہمارے پاس پانی ہے۔“

”کسی کی پیاس بجھانا ثواب کا کام ہے۔“

”بیچارہ آدمی“

ناجی کے خوبصورت ماتھے پر شکنیں ابھریں۔۔۔ ”بیچارہ بیچارہ نہ کہو۔ یہ شہری لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ ماں کہتی ہے ان سے بچ کر رہنا چاہیے۔ پانی کے بہانے باتیں کرنا چاہتا ہے۔“

”ہوں“ لڑکیوں نے اپنی آنکھوں کو اس طرح گردشیں دےں جیسے ناجی کی بات سے متفق ہو گئی ہوں۔

چاروں سست سست قدم اٹھاتی ہوئیں سرگوشیاں کرتی جانے لگیں۔

پھر

جانے کیا ہوا

چاروں رگ گئیں۔

پانی پلانا ثواب کا کام ہے۔ شاید اس بات پر چاروں متفق ہو گئی تھیں۔

”تم جاؤ!“

”نہیں تم!“

”ناجی تم ہی چلو جاؤ۔ چھوٹی سی تو کاکر ہے تمہاری۔ ہمارے سروں پر تو دو دو ہکا کر رہیں۔“

”ہاں ہاں جاؤ بھی۔ دیکھو تو بیچارہ اب بھی ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔ ہم یہاں رکتی ہیں۔“

تم جلدی سے پانی پلا کے آ جاؤ۔“

”جاؤ بھی ثواب کا کام ہے۔“

اور

مجبور ناجی کو اپنی چھوٹی سی ہکا سمیت مڑنا پڑا۔

طاہر کے چہرے پر مسرور کن جذبات کی جھلک سی دکھائی دی۔ انہیں پہلی مرتبہ

احساس ہوا کہ جذبات کی کشش واقعی اثر انگیز ہوتی ہے۔



ناجی سر پر ہکا کر اٹھانے محشر خیز چال چلی، طاہر کے قریب آ رہی تھی۔ طاہر نے اسے مڑتے دیکھ کر ہی منہ دانستہ پھیر لیا تھا۔ جیسے اس کی آمد سے بے خبر ہوں۔  
”اے باؤ! ناجی ان کے قریب آتے ہی بولی۔

”کیا ہے؟“ طاہر مڑے اور چہرے پر مصنوعی ستاؤ پیدا کیا۔

”پانی پی لو“ سر پر سے ہکا کر اتارتے ہوئے وہ بولی۔ اس کا گداز جسم چمک چمک گیا۔ طاہر جھکی جھکی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

”پی لو نا۔۔۔۔۔ ہاتھ میں ہکا کر پکڑے وہ کھڑی تھی۔

طاہر بغیر کچھ کہے تک ٹک اسے دیکھ گئے۔

”کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔۔۔؟ پی لو نا پانی!“ ناجی جیسے لڑ پڑنے کو تھی۔

”مجھے نہیں چاہیے تمہارا پانی۔۔۔۔۔ ہٹا کٹا تو ہوں۔ جھرنے پر جا کر پی لوں گا۔“ طاہر اس کی حسین آنکھوں کے سحر سے مسحور ہوتے ہوئے بولے۔

”نہیں پیتے تو نہ بیتو۔۔۔۔۔ بڑے آگے کہیں سے۔“ اس نے بازو کو گردش دے کر ہکا کر سر پر رکھی۔ چمکتا ہوا پانی چمک کر اس کے بالوں کو بھگوتا کپڑے تر کر گیا۔ وہ جانے کو مڑی۔

لیکن قدم اٹھانے سے پہلے ہی طاہر نے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔  
”لاؤ پلا دو۔“

ناجی نے قبر آلود ہچکچاہٹوں سے انہیں دیکھا۔

غصے میں وہ کتنی دلکش نظر آ رہی تھی۔ طاہر کا جی چاہتا تھا کہ وہ یونہی کھڑی رہے۔ اور وہ اسے دیکھتے رہیں، دیکھتے رہیں۔ حتیٰ کہ ساری عمر یہیت جائے۔

تبدیلی چڑھا کر اس نے پھر طاہر کو گھورا۔  
”لو نا۔۔۔۔۔ پلا دو اب۔“

ناجی تذبذب میں تھی۔

طاہر نے اسی ہاتھ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اوک سی بنا دی۔

ناجی نے ان کی طرف دیکھا۔ کچھ ہندہ تر مہم آنکھوں میں ابھرا۔ بغیر کچھ کہے اس نے ہکا کر سر سے اتاری اور ایک ہاتھ سے ہکا کر کا منہ پکڑتے ہوئے دوسرے سے ہکا کر کو بچنے سے باز رکھا۔

اور

پھر

اس نے اوک میں دھیرے دھیرے پانی ڈالنا شروع کر دیا۔

پانی کی غمیدہ سی دھار اوک میں پڑنے لگی۔ قدرے جھکی ہوئی ناجی کسی شاعر کا لہجہ جوتا تحلیل معلوم ہو رہی تھی۔ جھکنے سے بالوں کی لمبی لمبی آوارہ سی لٹیں شانوں سے کھسک کر آگے کو جھک آئی تھیں۔ دو ایک بار بالوں کے سرے طاہر کے ہاتھوں سے بھی چھو گئے۔ پانی جتنا اوک میں گر رہا تھا۔ اتنا ہی زمین پر بھی گر رہا تھا۔ طاہر عالم وار فحشگی میں اس بت طنز کو دیکھے جا رہے تھے۔ پانی پینے کا ہوش ہی کہاں رہا تھا۔  
”بس“ ناجی ان کی نظروں کے انہماک سے شاید گھبرا گئی تھی۔  
”نہیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“ طاہر اسی طرح دیکھتے ہوئے بولے۔

ناجی نے دوسرے ہاتھ سے ہکا کر کو قدرے اونچا کیا۔ اور پھر پانی انڈیلنے لگی۔ ہکا کر آدھی ہو گئی تھی۔ لیکن طاہر کی پیاس اب تک نہ بجھی تھی۔ پیاس پانی سے بجھنے کا سوال ہوتا تو کب کی بجھ چکی ہوتی۔ یہاں تو روح کی تشنگی تھی جو اس قرت سے اور بھڑک اٹھی تھی۔

”بس؟“ ناجی نے ہکا کر میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں؟۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“ طاہر وارفتہ سے تھے۔

”پیٹ ہے یا تنور۔۔۔۔۔ ساری ہکا کر خالی کر دی اور پیاس ہی نہیں بجھتی۔“ جھٹاکر ناجی نے ہکا کر سیدھی کر لی۔ اس کے ماتھے پر واضح شکنیں تھیں۔ آنکھوں میں غصہ کی چمکاریاں۔

”احسان کر کے جتلیا نہیں کرتے۔“ طاہر مسکراتے ہوئے اٹھے۔ جیب سے رومال نکال کر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔ ”شکریہ“

ناجی نے غصہ سے ان کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ ”سارا پانی ختم کر دیا۔ اب مجھے پھر نیچے جانا پڑے گا۔“

ناجی کی معصومیت، سادہ لوحی۔۔۔۔۔ اور اکڑ سا انداز مخاطب طاہر کے سینے میں گدگد کی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

”لاؤ میں بھر کے لا دوں“ طاہر نے ہکا کر لینے کو ہاتھ بڑھایا۔







ظاہر دل میں اک جہانِ آرزو لیے جھرنے کی طرف جا رہے تھے۔ ان کا قیافہ تھا کہ وہ



یوں بھی جو فسون ناجی کے حسن میں تھا، جو تپش ناجی کی جوانی میں تھی اور کسی میں نہ تھی۔

لڑکیوں کو شرارت سو جھی۔۔۔ پانی کے چھینٹے اڑانے لگیں۔۔۔ ناجی نے شادو کو بھگو دیا۔ شادو نے ناجی کو گھسیٹ کر عین جھرنے کے نیچے لاکھڑا کیا۔ سانولی نے لپک کر شادو کی مدد کی اور دونوں نے ناجی کو اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک وہ سر تاپا بھیج نہ گئی۔

بھیگی ہوئی ناجی کو دیکھ کر طاہر کو جل پر یوں کے وجود کا یقین آگیا۔

کافی دیر تک لڑکیاں پانی میں کھیلتی رہیں۔

سورج کافی اونچا ہو گیا۔ لڑکیوں کو وقت کا احساس ہوا۔ کھیل چھوڑ کر سب نے بجے دوپٹے اور کھیر دار قمیضوں کے دامن غچوڑے۔ دوپٹے لہرا لہرا کر سکھائے۔ پھر باری باری سب نے اپنی اپنی گاگڑیں بھریں۔ اور پھر باری باری گاگڑیں سروں پر اٹھا کر آگے پیچھے کئی لمبے لمبے پیر چل دیں۔

چند لمحوں بعد فضا سوئی ہو چکی تھی۔ ماحول کا حسن اب ماند پڑ چکا تھا طاہر یوں چوٹے جیسے خواب سے بیدار ہوئے ہوں۔ جل پر یوں کا قص ختم ہو چکا تھا۔

طاہر نے نیچے دیکھا۔ پہاڑی کے دامن میں چاروں لڑکیوں کے دامن لہرا رہے تھے۔ جانے کیا سو جھی۔ جگہ سے بٹے اور دوسری ڈھلان پر تیزی سے اترنے لگے۔ درمیانی راستے کو پھلانگتے ہوئے ختم کر کے وہ اسی پہاڑی کے عقب سے اوپر چڑھنے لگے جس پر لڑکیاں محو خرام تھیں۔

ہاتھروں کو پھلانگتے بڑے بڑے قدم اٹھاتے طاہر اپنی کل والی جگہ پر پہنچے۔۔۔ لڑکیوں کو اوھر سے ہی تو گزرنا تھا۔ دل میں ناجی سے باتیں کرنے کی خواہش ہو رہی تھی۔

اسی ہاتھ پر بیٹھے ہوئے طاہر نے گھاس کے کچھ تنکے نوچے اور ان سے اس بے بیانی سے کھیلنے لگے۔ جیسے لڑکیوں کی آمد سے قطعاً بے خبر ہوں۔

تھوڑے قریب آگئے۔ اپنے آپ کو اور بے تعلقی نظر کرنے کے لیے طاہر نے چند لکڑیاں اٹھائیں۔ اور دوسری جانب کو یوں نہیں پھینکنے لگے۔ آواز میں قریب تر ہو گئیں۔

طاہر بظاہر انجان بنے بار بار دُزدیدہ نظروں سے کچے راستے کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے لڑکیوں کی آمد متوقع تھی۔

پھر

لڑکیاں آگئیں۔ آگے پیچھے گاگڑیں اٹھائیں۔

طاہر کو دیکھ کر وہ کچھ سمٹ گئیں۔ گھبرائیں۔ اور کتر کتر ٹھٹھنا چاہا۔

”اے لڑکی!“ طاہر نے ایک دم اٹھ کر ناجی کو پکارا۔

لڑکیاں تیز قدم اٹھا کر بڑھنے لگیں۔ لیکن ناجی رک گئی۔

”تھوڑا پانی چاہیئے“ ناجی کو رکے دیکھ کر طاہر کی ہمت بندھ گئی۔

ناجی کے گداز جسم میں اک قہرمانی تناؤ آگیا۔ چہرے پر ناگوار سے تاثرات کی جھلک واضح نظر آئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ طاہر کے بظاہر لپروا اور اندازِ تحفظ کی حقیقت کو جان گئی ہو۔

غصیلی نظروں سے طاہر کو گھور کر دیکھا۔

شادو بھی رک گئی تھی۔ ناجی کے تیور دیکھ کر اس کی کمر میں ٹھوکانا دیا ”چلو بھی!“ لیکن ناجی قہر آلود نگاہوں سے طاہر کو گھورنے لگی۔

”پانی پلا دو“ طاہر مسکراہٹ دباتے ہوئے بولے۔

”آؤ ناجی“ شادو شیر مسکراہٹ سے بہت کچھ سمجھ گئی۔

لیکن ناجی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

”خواہ مخواہ منہ نہ لکانا آؤ!“ شادو نے سرگوشی کر کے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”ٹھہرو تم“ ناجی نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

شادو آگے بڑھ گئی۔ چند قدم پر دوسری لڑکیاں بھی کھڑی تھیں۔ جو گاگڑوں کے

بوجھ سے دبی دبی گردنیں بشکل موڑ کر طاہر و ناجی کو دیکھ رہی تھیں۔

”کیا کہتے ہو؟“ ناجی بھنوس کھینچ کر بڑے اکھڑے لہجے میں بولی۔

”ہیاس لگی ہے“ طاہر شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر بولے۔

”پانی پیو کے؟“

”ہاں“

”اتنی صبح صبح تمہیں ہیاس لگی ہے؟“







مسکرا دیتی جیسے اس دن کی چھیڑ کا کوئی سرا اب تک اس کے ہاتھ میں ہو۔ ظاہر سنبھل سنبھل کر پیر رکھتے اوپر چڑھ رہے تھے۔

"رائی۔۔۔ رائی۔۔۔ او۔۔۔ و۔۔۔ رائی۔۔۔ شہر۔۔۔ چا  
۔۔۔ را۔۔۔ فی۔۔۔!"

کوئی دور سے پکارتا چلا آ رہا تھا۔ آواز نسوانی تھی۔ گھبراہٹ کا عنصر غالب تھا۔ آواز وادی میں گونج رہی تھی۔

طالب نے اس سمت دیکھا جدھر سے آواز آرہی تھی۔

"رائی۔۔۔۔۔اے فی!"

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی تیزی سے پھسلتے ہوئے چنچ رہا ہو۔ طاہر متعجب تھے۔  
چند ہی سیکنڈ بعد انھوں نے دیکھا۔

بکری کا خوبصورت ساپچہ پتھروں کو پھلانگتا۔۔۔ اچھلتا، کودتا انہی کی طرف آ رہا تھا۔ ”ر۔۔۔۔۔“ انی “چیڑ کے درختوں میں کلابی آنچل بہائے۔  
ظاہر نے دیکھا۔

ناجی گجرات اور سراسیمکی کے عالم میں رانی رانی پکارتی، درختوں کا سہارا لیتی، پتھروں سے ٹکراتی، اترنے سے زیادہ لڑھکنے کے انداز میں ادھر کو لپک رہی تھی۔

بابو۔۔۔۔۔ نالے میں گر جائے گی۔“

ظاہر نے اک منظر ناہی کو دیکھا اور پھر بکری کے بچے کو جو ان سے چند قدم کے فاصلہ پر کسی بے جان پتھر کی طرح لڑھکتا ہوا نالے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ر۔۔۔۔۔ فی!“ ناچی کی لمبی سی چیخ گونج گئی!

ظاہر نے بکری کے بچے کو دیکھا۔ برق کی سی تیزی سے بڑھ کر وہ اسے پکڑنے لیتے تو وہ یقیناً تیز رفتار نالے میں گر جاتا۔

بکری کا بچہ اب طاہر کے ہاتھوں میں تھا۔ ناجی اپنا توازن بمشکل قائم رکھتے ہوئے ایک پتھر سے دوسرے پر چھلانگیں لگاتی نیچے اتر رہی تھی۔

میری رانی۔۔۔۔۔ بڑے والہانہ انداز میں وہ اس کے ملائم جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قریب آتے ہی اس نے طاہرے جھپٹ کر بکری کا پیٹا راسا پچھ لے لیا۔ ”رانی۔۔۔۔۔“

رات تیز بارش ہوئی۔ فضا وحل کر نکھر گئی۔ صبح بارش تھم گئی تھی۔ لیکن تاپہ نوزاہر آلود تھا۔ گل پوش پہاڑیوں پر جو بن آگیا تھا۔ پھول اور سبزے سے دھکی ہوئی پہاڑیاں عیاں کو حلاوت و طراوت بخش رہی تھیں۔

پہاڑی نالے کا سرخ پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جھاگ اور چھینٹے اڑاتا نالہ بستیوں کی طرف جا رہا تھا۔ شااں شااں کی آوازیوں محسوس ہوتی تھی۔ جیسے خود دار نالہ بلند یوں سے بستیوں کی طرف جانے پر غصے سے چیخ رہا ہو۔

ظاہر حسبِ عادت کیمبرہ کندھے پر ڈالے اس گھائی میں گھوم رہے تھے۔ جس سے کف بدہن نالہ سر کے بل نیچے گر رہا تھا۔ نالے کے کنارے نوکیلے پتھروں اور خاردار جھاڑیوں میں سے راستہ بناتے ظاہر اوپر چڑھ رہے تھے۔ ظاہر نالے کے اس حصہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ جہاں جھکے جھکے درختوں نے ایک محراب سی بنا رکھی تھی۔ اور پہاڑی نالہ اس تنگ جگہ سے رہائی پانے کے لیے بڑے جوش و خروش سے جدوجہد کر رہا تھا۔

دورین آنکھوں سے لکھانہوں نے پھر اس فردوسی محراب کو دیکھا۔ قدرتِ کاملہ کے خاموش حسن نے ہمت دلائی۔ اور پھر دشوار گزار کنارے پر راستہ بناتے اوپر چڑھنے لگے۔ ظاہر اکثر اس جگہ آیا کرتے تھے۔ لیکن اب تو اک کشش تھی۔ جو کشاں کشاں یہاں کھینچ لاتی۔ گھائی میں گھومتے پھرتے کہیں نہ کہیں تو ناجی منظر آبی جاتی۔ گو اس دن کے بعد وہ اس کے راستے میں نہ آئے تھے۔ لیکن اس کے ارد گرد منہ لاتے ضرور رہتے تھے۔ دن میں ایک دو بار ضرور وہ منظر آجاتی۔ کبھی بھرنے کے قریب۔۔۔ کبھی گھائی میں، اور کبھی پہاڑی راستے کے کچے موڑ پر۔ وہ کہیں دور بھی ہوتی تو دورین ایک منظر دوست کی طرح اسے ان کی آنکھوں میں لایٹھاتی تھی۔

اس سے پھر یہ کہ...



”چھوڑ دو اسے!“ طاہر غصیلہ بنتے ہوئے بولے۔ ”میں اسے نالے میں پھینک کر ہی دم لوں گا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں بابو۔۔۔۔۔!“ ناجی کی آنکھوں میں آنسو چمک آئے۔  
طاہر نے بکری کے بچے کو کھینچا۔

ناجی نے بے اختیار طاہر کی دونوں کلاٹیاں پکڑ لیں۔ بھیکی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بڑے ظالم ہو بابو۔۔۔۔۔ بڑے ظالم ہو۔۔۔۔۔“

طاہر جیسے بچلی کے تنگے تاروں سے چھو گئے۔ نرم و گداز حندلی ہاتھوں کا ٹکس رنگ میں برقی رو کی طرح دوڑ گیا۔ لیکن یہ احساس کسی کرب کا حامل نہ تھا۔ بلکہ یہ احساس لطف و انبساط کے نقطہ عروج کو چھو رہا تھا۔ مضبوطی سے ان کی کلاٹیاں پکڑے ناجی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر التجا کر رہی تھی۔

طاہر کی نظریں ان نظروں سے ملیں۔ جانے کونسا خاموش پیغام تھا جو دلوں میں اترا اور روحوں میں جذب ہو گیا۔  
ناجی کی ہکلیاں جھک گئیں۔  
سر بھی جھک گیا۔

اور  
اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔  
جانے کب

اور  
کیے

ناجی کے ہاتھ طاہر کے مضبوط ہاتھوں میں آ گئے۔  
ساری فضا، سارا ماحول اور ساری کائنات اک طلسماتی سکتے میں آ گئی۔ اس سکتے میں بڑی ہی خاموشی سے روحوں کے ابدی بندھن کا معاہدہ ہو گیا۔  
بکری کا بچہ میسایا۔

سکتہ ٹوٹ گیا۔

ناجی نے آہستگی سے اپنے ہاتھ پھرا لیے۔ جھکی جھکی جیبار نظروں سے اس نے طاہر کو دیکھا۔ اور پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

بولی۔  
طاہر ایک تک ناجی کو دیکھے جا رہے تھے۔ ہانپتی ہوئی ناجی کا یہ انداز بالکل نیا تھا۔ تیز تیز سانس لیتے ہوئے اس کے سینے کا تہ و جزر طاہر کے جذبات کی دنیا میں بل چل چلا رہا تھا۔ براق سی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس پر گھبراہٹ اب تک طاری تھی۔ رانی کو ہراساں کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔  
جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر اس نے طاہر کو دیکھا۔ اس کے بھیکے بھیکے لبوں پر اک دل نواز تبسم بکھر گیا۔

وہ قریب ہی پتھر پر بیٹھ گئی۔ رانی کے پاؤں دوپٹے کے آنچل سے باندھ کر پاؤں کے قریب رکھتے ہوئے بولی۔ ”تو اگر نالے میں گر جاتی تو میں کیا کرتی رانی۔۔۔۔۔“  
سرائٹھا کر رانی نے پھر طاہر کی طرف دیکھا۔ شاید یہ نظریں اظہارِ تشکر کے طور پر تھیں۔

طاہر اسے تنگے جا رہے تھے۔ ڈھیلے ڈھالے کلابی کپڑوں میں وہ سبزہ میں میٹھی کلاب کا نو شگفتہ پھول لگ رہی تھی۔

”تم بڑے اچھے ہو بابو۔۔۔۔۔!“ لجا کر ناجی نے کہا۔  
”اچھا ہوں“ طاہر دلچسپی سے اسے دیکھ کر بولے۔  
”ہاں بابو۔ تم نے میری رانی کو بچایا ہے نا۔۔۔۔۔“  
”رانی کو بچایا تو ہے۔ لیکن اسے پھرائٹھا کر نالے میں پھینکوں گا۔“ شوخ ہکاہوں سے ناجی کو گھور کر بولے۔  
”کیوں؟“ ناجی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اور غیر شعوری طور پر اس نے جھک کر بچے کے اوپر ہاتھ رکھ لیے۔

”میں آج اپنا بدلہ لوں گا۔“ طاہر نے غصیلی آواز بنا کر اسے گھورا۔  
”ہل۔۔۔۔۔!“ وہ سہم گئی۔

”اس دن مجھے جھگڑایا کیوں تھا۔۔۔۔۔“  
ناجی سہم کر ہلکی جھپکا جھپکا کر انہیں دیکھنے لگی۔  
طاہر جھکے اور بکری کے بچے کو اٹھانا چاہا۔  
”اسے بابو!“ وہ منت سے بولی۔



”اگر تم پھسل جاتیں تو؟“ طاہر نے ڈھلانی رستے کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
”کیوں؟“

”جس بے احتیاطی سے اس کم بخت بکری کے بچے کے لیے بھگی آرہی تھیں۔ گرنا یقینی ہی تو تھا۔“

ناجی کھلکھلا کر ہنس دی۔

”ہنستی کیوں ہو؟“

”تم مجھے بچہ سمجھتے ہو۔“

”کیوں؟“

”جیسے مجھے کھائی میں اترنا نہیں آتا۔“

”اترنا اور بات ہے تمہاری طرح بھاگتے آنا اور بات۔۔۔ ذرا سا پاؤں پھسلا تو بس۔۔۔!“

”رائی اگر ڈوب جاتی تو؟“

”رائی کے لیے جان کی بازی لگا دی!“

”ہائے میری رائی“

”بڑا پیار ہے اس سے؟“

”ہاں“

”کتنا؟“

”استنا! اس نے معصومیت سے دونوں بازو پھیلادیئے۔

”اور بھی کسی سے استنا پیار ہے“ طاہر نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولے۔

”ہاں“ وہ آنکھیں گھما کر مسکرائی۔

”کس سے؟“ طاہر نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”اپنی ماں سے“ وہ اسی سادگی سے بولی۔

”صرف ماں سے باپ سے نہیں۔۔۔۔“

”باپ تو ہے ہی نہیں؟“

”اوہو۔۔۔۔“

”ماں کہتی ہے۔ میں اتنی سی تھی۔“ اس نے زمین سے فٹ بھر کی اونچائی پر ہاتھ سے

ناجی نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی سی چھلک آئی تھی۔ اور وہ اس مہوش شرابی کی طرح بہکی بہکی نظر آرہی تھی جس نے اپنی شدید پیاس پانی کے بجائے تیز و تند شراب سے بجھانے کی کوشش کی ہو۔

”ابھی نہ جاؤ!“ طاہر آہستگی سے بولے۔

”ماں غصے ہوگی“ ناجی نے بڑی سادگی سے کہا۔

”پھر آؤگی؟“ لجاجت آمیز التجا تھی۔

ناجی میں نہ اقرار کی ہمت تھی نہ انکار کی۔

”ضرور آنا ناجی۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ وہ جذباتی لہجے میں میں بولے۔

”ماں آنے نہ دے گی بابو۔۔۔۔“ وہ اکھڑے سے انداز میں بولی۔

”ناجی!“ طاہر پریشان ہو گئے۔

”ماں کہتی ہے غیر مردوں کے پاس نہیں بیٹھا کرتے۔“ اس نے بڑی ہی

معصومیت سے کہا۔

طاہر نے اس کی آنکھوں میں اس طرح دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں ”مجھے اب بھی غبر

ہی سمجھتی ہو؟“

ناجی شاید ان نظروں کی پُکار سمجھ گئی۔ اس کے ہوشوں پر اک شر میلہ سا تبسم پھیل

گیا۔ اور اک جھکا ہوا بظاہر سادہ سی تھی، طاہر پر ڈالتے ہوئے پھر سے مسکرا دی۔

”کل آؤگی نا؟“ طاہر نے اس کے قدم اٹھاتے ہی بے صبری سے اس کا آنچل پکڑ

لیا۔

”ہاں“ وہ آنچل چھو کر چل دی۔۔۔۔ اس کی ہاں میں اک اعتماد تھا۔

دوسرے دن ناجی حسب وعدہ آگئی۔ وہی شوخ و شنگ ناجی۔

اپنے سب پر وا اور اپنے حسن سے غافل ناجی۔۔۔ آج اس پر کل والا جذباتی سکڑ نہ تھا۔ وہ

بات بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ بے تکلفی سے طاہر سے باتیں کر رہی تھی۔

اور

طاہر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ناجی انہیں اب ہی نہیں ملی بلکہ وہ تو ان کے ہنر چنر

ساتھی ہے۔

دونوں نالے کے کنارے اس وقت



اشارہ کیا۔ ”جب میرے بابا مر گئے۔“  
 ”بہت چھوٹی سی تھیں۔ تمہیں تو یاد بھی نہ ہو گا۔“  
 ”بالکل ہی نہیں۔۔۔۔۔ ماں کہتی ہے بابا مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ شہر میں میرے  
 لیے ڈھیروں چیزیں لاتے تھے۔“  
 ”شہر میں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ بابا شہر میں کام کرتے تھے نا۔ وہ مر گئے۔ تو ماں اکیلی کیسے رہتی وہاں۔ مار  
 کاؤں میں آگئی۔۔۔۔۔“  
 سیدھی ساوی ناجی ابھی خاصی باتونی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنے گھر بار۔۔۔  
 کاؤں اور سہیلیوں کے متعلق طاہر کو بہت کچھ بتا دیا۔  
 طاہر اس کی دلچسپ باتوں میں کھو گئے تھے۔ زندگی کی حقیقت کو اتنے قریب سے دیکھنے  
 آج پہلی بار موقع ملا تھا۔ فطرت اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر تھی۔ تصنع اور بناوٹ نے زندگی  
 کو ملوٹ نہ کیا تھا۔ ظاہر داری نے فطرت کی شکل مسخ نہ کی تھی۔  
 گھنٹہ بھر کی معصوم قربت کے بعد دونوں کل کے وعدے پر جدہ ہو گئے۔

”اے بابو۔۔۔۔۔“ پتھر پر بیٹھے ہوئے ناجی نے طاہر کو پکارا!  
 ”میرا نام بابو نہیں ہے“ طاہر کیمرہ کھولتے ہوئے بولے۔  
 ”تو پھر کیا کہوں تمہیں؟“  
 ”طاہر۔۔۔۔۔“  
 ”طاہر۔۔۔۔۔!“ ناجی نے برا سامنہ بنالیا۔  
 ”کیوں پسند نہیں آیا میرا نام؟“ طاہر مسکرائے۔  
 ناجی نے شفقی میں سر ہلادیا۔ طاہر اس سادگی پر مسکرا دیئے۔  
 ”میرے اور بھی کئی نام ہیں۔۔۔۔۔ طاہر پسند نہیں تو کسی اور نام سے پکارا  
 کرو۔۔۔۔۔“

”اور نام بھی ہیں؟“

”ہاں“

”کون سے۔۔۔۔۔ بتاؤ نا!“

”بتاؤں؟“

”ہاں“

”سننتی جاؤ“

ناجی ہمہ تن کوشش ہو گئی۔

”طاہر کے علاوہ میرے نام ہیں۔ ”سجمن۔۔۔۔۔“ ”سجنوا۔۔۔۔۔“ ”سیا۔۔۔۔۔“

”اتنے بہت سے نام ہیں تمہارے۔۔۔۔۔؟“

”جو پسند ہو۔۔۔۔۔ اسی سے پکارا کرو۔۔۔۔۔“

ناجی نے زیر لب سارے نام دہرائے۔ جیسے ناموں کی فہمکی کا جائزہ لے رہی ہوں۔



پھر خوشی سے بھرپور آواز میں بولی۔ ”سیاں۔۔۔ میں تمہیں سیاں کہوں گی۔۔۔“

”اچھا نام ہے تمہارا۔۔۔“

”مجھے پکارو۔۔۔“ طاہر جوش مسرت سے بولے۔

”سیاں“ فضا میں ترنم بکھر گیا۔ آواز میں موسیقی کا رس تھا۔ طاہر مسرت سے جھوم جھوم گئے۔

ملاقاتیں بڑھیں۔ راز و نیاز ہوئے اور دونوں ایک دوسرے میں کھو کر رہ گئے۔ اس دن موسم سہانا تھا۔ طاہر کافی دیر سے ناجی کے حسن کو سلولائیڈ پر منتقل کر رہے تھے۔ وہ ان سے کتنی باتیں پوچھ رہی تھی۔ کیمرا اس کے لیے عجیب سی شے تھی۔ حیرانگی سے وہ اس کے متعلق طاہر سے سوال پہ سوال کیے جا رہی تھی۔ طاہر اس کے معنوم سوالوں کے بڑے دل نشیں انداز میں جواب دے رہے تھے۔

”تمہارے پاس کتنی عجیب عجیب چیزیں ہیں سیاں۔۔۔؟“ ناجی نے کیمرا طاہر کے دے کر دور بین اٹھالی۔

”بہت“

”اور بھی ہیں؟“

”ہاں“

”کہاں ہیں؟“

”گھر پر۔۔۔۔۔“

”تمہارا گھر کہاں ہے سیاں؟“

”میرا گھر؟“

”ہاں“

”شہر میں؟“

”کیسا ہے؟“

”بڑا خوب صورت“

”ناجی چپ ہو گئی۔“

”دیکھو گی؟“

”میں شہر کہاں جاؤں دے گی۔۔۔؟“

”یہاں سے بھی نظر آتا ہے۔“

”جھوٹے۔۔۔۔۔“

”آؤ دکھاؤں تمہیں“

طاہر اُٹھے۔ ناجی کا ہاتھ کھینچ کر اسے بھی اٹھایا۔

”کہاں جاؤ گے؟“

”ڈرائیجے۔۔۔ وہاں سے میرا گھر صاف نظر آتا ہے۔“

”سچ؟“

”میں نے جھوٹ کبھی بولا ہے۔“

دونوں نشیب کی طرف اترنے لگے۔ نالے کے پہلے گھماؤ پر طاہر رک گئے۔

”اس پتھر پر کھڑی ہو جاؤ۔“

ناجی اونچے سے پتھر پر چڑھ گئی۔ پھر طاہر بھی اس کے برابر کھڑے ہو گئے۔

”ادھر دیکھو۔۔۔۔۔“ طاہر نے نیچے شہر کی طرف اشارہ کیا۔

شہر کی آبادی کے غیر واضح سے نشان یہاں سے نظر تو آتے تھے۔ لیکن اتنی دور سے طاہر کا گھر کیسے نظر آ سکتا تھا۔ ناجی آبادی کی بجائے عدم اعتمادی سے طاہر کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ دیکھو“ طاہر نے دور نشیبی علاقے کی طرف اشارہ کیا۔

ناجی یوں ہی دیکھنے لگی۔

”اس طرف نہیں۔۔۔۔۔ ادھر۔۔۔۔۔“ طاہر نے پھر اشارہ کیا۔ سرخ سرخ گنبد نظر آ رہے ہیں؟

”ہاں“

”گول گنبد؟۔۔۔۔۔ سرخ سرخ۔۔۔۔۔ چمک رہے ہیں نا۔“

”ہاں ہاں“

”وہی میرا گھر ہے۔“

ناجی نے پلٹ کر طاہر کی طرف دیکھا۔ اور پھر جیسے اسے طاہر کی بے نیکی بات کا پتہ چل گیا ہو۔ مسکراہٹ روکنے کی کوشش میں آنکھوں کی شوخی چمک کر اجاگر ہو گئی۔ تین تین نظروں سے ان کا مذاق اڑاتے ہوئے بولی ”وہ تمہارا گھر ہے؟“



”ہاں“ ظاہر متعجب سے اسے دیکھنے لگے۔

”لال لال گنبدوں والا“ وہ جیسے ہنسی روک رہی تھی۔

”ہاں ہاں وہی“ ظاہر حیران ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔ سنہری ستون بھی تو دیکھ رہے ہیں۔“

”وہ تمہارا گھر ہے۔۔۔؟“ ناجی بے قابو ہنسی کو روک رہی تھی۔

”ہاں“

اور

ناجی

کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ہنسنے سے فی سی آگئی۔

”جھوٹے“

”کیوں“

”جیسے میں جانتی نہیں۔۔۔۔“ اس نے آنکھیں مٹکا کر گردن ہلائی۔

”ناجی“ ظاہر اس کی ہنسی کا مطلب نہ سمجھ سکے۔

”وہ تو محل ہے محل“ ناجی نے شوخی سے ان کی ٹھوڑی کو چھو کر اس طرح کہا جیسے  
کے جھوٹ کا پول کھول دیا ہو۔۔۔۔“ نواب صاحب کا محل ہے۔ نواب صاحب کا۔“

اور

ظاہر کے لب متہسم ہو گئے۔ چھلانگ لگا کر وہ پتھر سے کودے۔ پھر ہاتھ کاٹا۔  
دے کر ناجی کو اتارا۔

ناجی اپنی فتح پر نازاں تھی۔ اٹھلائی ہوئی بولی ”میں نے نواب صاحب کو دیکھا ہے۔“

”کہاں؟“ شوق سے ظاہر بولے۔

”شہر گئی تھی ایک دفعہ ماں کے ساتھ۔۔۔ محل بھی دیکھا تھا۔ نواب صاحب  
بھی۔ مجھے تو بڑا ڈر لگا ان سے۔“

”کیوں؟“

”ہنس ان کی شکل دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔“ ناجی یوں کہہ رہی تھی جیسے اس ڈر کا احساس  
اب بھی ہو رہا ہو۔

”ڈرنے کی کیا بات تھی“ ظاہر تجسس سے کرید رہے تھے۔

”ان کی شکل ہی ایسی تھی۔ میں تو ڈر کر ماں کے پیچھے چھپ گئی۔ موٹی موٹی لال  
آنکھیں۔ اتنی بڑی بڑی مونچھیں۔ اور اتنے موٹے۔۔۔ توہ۔۔۔ توہ۔“

ناجی باتوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں پھیلانے ہاتھوں سے اشارے بھی کر رہی تھی۔  
ظاہر ہنسی روکے سن رہے تھے۔ جب اس نے ہاتھ پھیل کر نواب صاحب کی موٹائی کا انداز  
بتایا تو ظاہر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

”وہ میرے ابا ہیں ناجی۔“

اور ناجی نے چونک کر ایک دم ظاہر کی طرف دیکھا۔  
ظاہر مسکرائے۔

ناجی شہر رسی رہ گئی۔ تذبذب کے عالم میں اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر ظاہر کو  
دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی کچھ عدم اعتمادی کی جھلک تھی۔

ظاہر نے اس کی ذہنی و قلبی کیفیت بخانپ لی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے  
متعلق اسے سب کچھ بتا دیتے۔

ظاہر نے سنجیدگی سے مختصر الفاظ میں اپنے متعلق بہت کچھ بتا دیا۔  
لیکن

ناجی۔۔۔۔۔ خوش ہونے کی بجائے اداس ہو گئی۔ گرے پتلون اور سلک کی قمیص  
میں ملبوس ظاہر اسے پہلی بار نواب زادے کی شکل میں دکھائی دیئے۔ شاید لاشعوری طور  
پر اسے اپنے اور ان کے درمیانی خلا کا احساس ہو گیا تھا۔

”ناجی!“ وہ بے تاب ہو کر بولے۔

”ہوں“ ناجی سر جھکانے چپ چاپ کھڑی تھی۔

”چپ کیوں ہو گئی ہو؟“

”کچھ نہیں“

”پھر بھی؟“

”سوچ رہی ہوں۔“

”کیا۔۔۔۔۔ ناجی۔۔۔ کیا سوچ رہی ہو۔۔۔؟“

”تم بہت۔۔۔۔۔ بڑے آدمی ہو۔۔۔۔۔“ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ظاہر کو دیکھنے



لگی۔ ”تو اب ہونا۔۔۔ محل میں رہتے ہو۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے ناجی“ طاہر نے بے قرار ہو کر کہا۔

”مجھے چھوڑ تو نہ دو گے سیاں“ اچانک ناجی نے طاہر کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر روپانسی آواز میں کہا۔

”ناجی۔۔۔“ طاہر کی ٹرپ دید کے قابل تھی۔ ناجی کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ اس کے قلبی ہیجان کا غماز تھا۔

”تم نے ایسی بات کیوں کر سوچی ناجی“ طاہر کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔

”ماں کہتی ہے۔ امیر غریب کا کوئی جوڑ۔۔۔ نہیں سیاں۔“ ناجی سسکنے لگی۔

”ناجی! طاہر نے جوش جذبات سے کانپتی آواز میں کہتے ہوئے ناجی کے دونوں ہاتھ اس مضبوطی سے پکڑ لیے جیسے اس طرح اسے اس آن ٹوٹ بندھن کا احساس دلانا چاہتے ہوں جو دنیا کی دسترس سے دور زوحوں کو جکڑے ہوئے تھا۔

”تم میری روح ہو ناجی۔۔۔ ایسا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔۔۔ تمہارے بغیر میں۔۔۔ میں زندہ رہنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا ناجی۔۔۔ تم نے کیا بات کہہ دی“ اور بڑی ہی عقیدت سے طاہر نے اپنی آنکھیں ناجی کے ہاتھوں سے لگا دیں۔ ناجی بڑی متاثر ہوئی۔ اک انجانے سکون کا احساس اس کے حواس پر چھا گیا۔

”ناجی“ طاہر نے سرائٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”میں تمہارا ہوں، تم میری ہو۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ تم میری رانی بنو گی۔ میں اپنی خاندانی اور روایتی شان و شوکت کے ساتھ تمہیں اپنے محل میں لے جاؤں گا۔“

ناجی کی آنکھیں اس اقرار پر یوں چمکنے لگیں جیسے چودھویس کے پورے چاند کی چاندنی گھل گھل کر ان آنکھوں میں سما رہی ہو۔

(۷)

دن گزر رہے تھے۔

طاہر و ناجی دنیا و مافیہا سے بے خبر راہِ عشق پر رواں دواں تھے۔۔۔ اس راہ پر تو نہ انہیں کانٹے نظر آئے نہ پتھر ملی رکاوٹیں۔ انہیں تو چاروں طرف بہاروں کا حسن دکھائی دیتا تھا۔

لیکن

ماں کی جہاں دیدہ ہمایوں ناجی کی بہکی بہکی حرکات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ ناجی کی ماں تھی۔ ناجی کو اس نے جہنم دیا تھا۔ پالا پوسا تھا۔ پروان چڑھایا تھا۔ وہ اس کی ایک ایک عادت سے واقف تھی۔ اس کے ذہنی رجحانات سے آگاہ تھی۔ ناجی اس سبک رفتار ندی کی طرح تھی جو اک متعینہ رفتار سے متعینہ راستے پر ہی چلی جاتی ہے۔

لیکن

اب

ماں کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ندی کا پانی چڑھ رہا ہو۔ سبک رفتار ندی سیلاب زدہ ہوتی جا رہی ہو۔

ماں سخت متفکر تھی زندگی نے تلخیوں سے دوچار رکھا تھا تجربے کا اک وسیع اثاثہ انہی تلخیوں نے اسے بخشا تھا۔ ناجی کی نا سمجھی و معصومیت ہی تو اسے ڈبو سکتی تھی۔ وہ اشارتاً، کنایتاً اسے سمجھانے لگی۔ زیادہ سے زیادہ دیر گھر کے کاموں میں مشغول رکھنے لگی۔ گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا لیکن ناجی پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دھوپ کے اندازے سے اپنے باہر جانے کے اوقات میں تبدیلی نہ کر سکی۔ کبھی روٹھ کر، کبھی لڑکر کبھی سانولی کے گھر اور کبھی شادو کے یہاں گھر سے نکل جاتی۔

ماں اس کی دبی دبی کبراہٹ اور کھوئے کھوئے انداز سے، سوچ میں ڈوب



میں ہار دی ہے۔ لیکن اسے بار بار ایسا شک گزرا ضرور۔ اس نے اپنے رویے میں غیر معمولی سختی برتی گھر سے ناجی کا ٹکٹا بند کر دیا۔

اپنی دانست میں اس نے ناجی کو بہکنے سے بچانے کا مؤثر قدم اٹھایا لیکن ناجی محبت کی سحر آفرینیوں کے سامنے بے بس ہو چکی تھی۔ سیلاب طوفانی صورت اختیار کر جائے تو کوئی بند اس کے بہاؤ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ شوریدہ سر موجیں کنارے توڑ کر اپنا راستہ بنا لیتی ہیں۔

ناجی کو دن میں ٹھکنے سے روکا گیا۔ تو وہ اپنی منزل کی طرف رات کو کھنچنے لگی۔ ناجی کی سہیلیاں اس کی کھیل میں عدم دلچسپی اور بے توجہی سے نالاں تھیں۔ سارا مزہ تو اس کی پنچل چھیر چھاڑ اور مستی میں تھا۔ وہ اس مسئلے کو سلجھانے کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ ماں سے بار بار وہ ناجی کے گھر سے نہ ٹھکنے پر شکوہ کر چکی تھیں۔ لیکن اب ناجی نے رات کو آنا بھی چھوڑ دیا۔ گھڑی بھر کو دکھائی دیتی پھر غائب۔۔۔

اور

اب تو متواتر تین راتوں سے وہ کسی کو نظر نہ آئی تھی۔ لڑکیاں ماں کی پابندی پر تبصرہ کرتی ہوئیں اس کے گھر چلے گئیں۔ آج وہ ماں کو منکر ناجی کو اپنے ساتھ لانے کا تہہ کر چکی تھیں۔

ماں ابھی ابھی بستر میں لیٹی تھی۔ ناجی کھیل کھیلنے کو جا چکی تھی۔

”ماں جی“ چھوٹا سا دروازہ کھولتے ہوئے شادو نے اندر جھانکا۔

”اؤ شاداں بیٹی“ ماں نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اور پھر لڑکیوں کو اندر آتے دیکھ کر بستر میں سے اٹھ بیٹھی۔

لڑکیوں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ دوسرا بستر خالی تھا۔ سرسوں کے نیچے کا چھوٹا سا دیوار ہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے کی تاریکی سے الجھ رہی تھی۔

”ناجی کہاں ہے ماں جی؟“۔۔۔ شادو نے پوچھا۔ ماں کے جواب دینے سے پہلے سانولی نے شکوہ کیا۔ ”آپ اسے کھیلنے کیوں نہیں دیتیں ماں جی۔“

”پہلے تو دن کو نہیں ٹھکنے دیتی تھیں۔ اب رات کو بھی بند کر دیا۔“۔۔۔

”سارا لطف تو اسی کے دم سے ہے۔ آج تین راتیں ہو گئیں۔ اللہ کی قسم اس کے بغیر جو کھیل کا لطف آیا ہو۔“

لڑکیاں بغیر ماں کے جواب سنے شکوہ کیے جا رہی تھیں۔

اور

ماں

ماں کا جیسے کسی نے گلا دبا دیا۔ حیرت زدہ سی وہ سب کا منہ دیکھ رہی تھی۔ سردی کی کپکپی سی اس کے وجود پر طاری ہو گئی۔ اس کا دماغ سن سا ہو گیا تھا۔

”وہ اکیلی تو نہیں ماں جی۔ ہم سبھی ہوتے ہیں نا۔۔۔ تم خواہ مخواہ اسے روک لیتی ہو۔۔۔ اپنا ہی تو کھاؤں ہے۔ سب ہی لڑکیاں تو کھیلنے آتی ہیں۔ دن کو نہ سہی رات کو تو کھیلنے دیا کرو۔۔۔“

”زیادہ نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے ہی ماں جی۔۔۔ آخر بالکل تو آنا بند نہ کرو۔۔۔ ہماری سسکی ہے۔ ہمیں اس کے بغیر کیسے مزہ آسکتا ہے۔“

چاروں لڑکیاں بگڑے جا رہی تھیں۔ ماں کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ دئے کی ناکافی روشنی اس کے چہرے کے تاثرات چھپانے میں مددگار ثابت ہو رہی تھی۔

چہرہ

جو وسوسوں اندیشوں اور خدشوں کے کھمبیر سلیوں سے بھیانک نظر آ رہا تھا۔

ناجی لڑکیوں کے کھیل میں شریک نہ ہوتی تھی۔ وہ کونسا کھیل کھیل رہی تھی۔ ماں کی تجربہ کار نظریں بہت کچھ سمجھ گئی تھیں۔ اس کے ان شبہات کو تقویت مل گئی تھی جو ناجی کے بدلے تیوروں کو دیکھ کر ایک عرصہ سے اس کے ذہن میں رنگ رہے تھے۔

لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں۔ اور ماں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گدے لے پانی کے چھینٹے اڑا اڑا کی اس کی بیوگی کی چادر کو دائرہ بنا رہی ہوں۔

گھبرا کر اس نے سب کے چہروں کو گھورا۔

”ناجی ہے کہاں ماں جی؟“

”وہ“ ماں کا دماغ چکر ا گیا۔

”کمرے میں تو نہیں۔ کہیں باہر گئی ہے۔“

”ہاں“ ماں نے جلدی سے کہہ دیا۔



”ریشماں کے گھر“ ماں نے جلدی سے بات بنائی۔ اپنی دور پار کی رشتہ دار کاہم

لیا۔

”ریشماں کے گھر۔۔ اتنی دور۔۔۔؟“

”ہاں“

”کوئی کام تھا ماں جی۔۔؟“

”ہاں“

”اکیلی گئی ہے۔۔؟“

”آں۔۔ نہیں۔۔ نہیں تو۔۔ ریشماں کی ماں آئی تھی۔۔“

”رات کو آجانے کی؟“

”شاید۔۔ شاید رات وہیں رہ جائے۔۔ ماں ہٹکارہی تھی۔

”کل آنے دو کی ناماں جی اسے؟“ لڑکیوں کا لہجہ التجا آمیز تھا۔

”دیکھوں گی۔۔“

”ضرور بھیجنا ماں جی۔۔ تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی۔“

”اچھا“

لڑکیاں وعدہ لے کر ماں جی کو سلام کر کے رخصت ہو گئیں۔ ان کے جانے پر ماں اس عمارت کی طرح بستر میں دھڑام سے گر گئی جس کی بنیادیں کسی نے کھوکھلی کر دی ہوں۔

ناجی بھلاب کا مہکتا ہوا پھول تھی۔ اس کی شادابی و رعنائی ماں کی نظروں سے مستور نہ تھی۔ لیکن استہیجاتی تھی کہ باوجود سموم کا ایک ہی جھومکا یہ شادابی و رعنائی کر دے گا۔ ماں پر کسی وحشت ناک خیال سے بار بار لرزہ طاری تھا۔ اضطراب بڑھتا گیا۔

بیقرار ہو کر بستر میں سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے خون میں تیزی آ رہی تھی۔ غصہ کی لہریں اس کے دماغ سے ٹکرا رہی تھیں۔

ناجی۔۔۔ ناجی۔ اس کی زندگی کا روشن چراغ تھی۔

لیکن۔۔۔

یہی چراغ اگر اس کی عزت کا دامن جلائے کو لپکے تو وہ اپنے ہاتھوں اس چراغ کو گل کر دے گی۔

ابال اٹھتا رہا۔ ہونٹ کاٹتے، دانت پیستے خشک مٹیں ٹکڑوں سے دروازے کو کھورتے وہ ناجی کا انتظار کر رہی تھی۔

اک اک لمحہ اس کے دل و دماغ پر سنگ گراں کی طرح پڑ رہا تھا۔ اس کا جگر چھلنی ہو رہا تھا۔ اس کی بندشوں اور پابندیوں کے باوجود ناجی بہک گئی تھی۔

ناجی۔۔ جو اس کی سولہ سالہ بیوگی کی پارسائی اور ریاضت کا ثمر تھی۔

ماں کی بے قراری بڑھتی گئی۔ ناجی ابھی تک نہ آئی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر اپنی موٹی سی چادر اوڑھی اور گھر سے باہر نکل گئی۔

کھیل کا میدان کسی ویرانے کی طرح سنسان تھا۔ رات کی سیاہی کھل رہی تھی۔ بوڑھے درخت سو گوار سے منظر آرہے تھے۔ ماں کتنی ہی دیر عالم اضطراب میں وہاں پھرتی رہی۔ آج اس کے اعتماد نے کس بری طرح شکست کھائی تھی۔

”ناجی۔۔ کاش ناجی تو پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی۔۔“ پتھر پر میٹھی ماں سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور اس کی بے قابو سسکیوں سے ویرانے کا سکوت ٹوٹ رہا تھا۔

رو لینے سے دل کو کچھ ڈھارس بندھی۔ اب وہ بیجانی جذبات سے دوچار نہ تھی۔ وہ اطمینان سے سوچ رہی تھی کہ ناجی معصوم تھی۔ اسے سمجھا بھجا کر سیدھے راستے پر لے آنا اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ اپنی بچی کو سمجھالے گی۔ اپنے تجربے کی روشنی میں زندگی کے اتار چڑھاؤ کی جھلک دکھائے گی۔ ناجی راہِ راست پر آجائے گی۔ ضرور آجائے گی۔

وہ چپکے سے انھی موٹی چادر کے کھردرے کونے سے بیسگی آنکھوں کو پونچھا اور بہت کچھ سوچتے ہوئے گھر کی طرف چل دی۔

گھر سے کچھ ہی فاصلے پر اسے دو سائے سے درختوں کے جھنڈ میں نظر آئے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ درختوں کی اوٹ میں بولتے ہوئے وہ دبے قدموں ان کے قریب پہنچ گئی۔ گھمبیر سیاہی میں شناخت مشکل تو تھی لیکن پہلی ہی نظر میں وہ پہچان گئی کہ دو سایوں میں ایک سایہ ناجی ہے۔



ہتھ خود کو چھپائے وہ دونوں سالیوں کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔

ایک واقعی ناجی تھی اور دوسرا۔۔ دوسرا کوئی اجنبی۔ اسکے لباس سے ماں نے جانچ لیا کہ وہ کوئی شہری ہے۔

ماں کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہیں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر زمین پر بیٹھ گئی۔

”کل بھی آؤ گئی نا؟“ اک سرگوشی ابھری۔

”تم روز ہی کیوں پوچھتے ہو سیاں؟“

”یاد دلاتا ہوں۔“

”میں کبھی بھول سکتی ہوں۔“

”تم کتنی اچھی ہو ناجی۔“

اور پھر اجنبی نے ناجی کو خداحافظ کہا۔

ناجی چلی گئی۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ نظروں سے اوجھل ہو جانے پر وہ مڑا اور کچے راستے کی طرف چل دیا۔

ماں انھی آندھی کی طرح اٹھی۔۔ میدان پار کر کے اس نے درمیانی فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا۔ ناجی اوپر سے ہو کر گھر جا رہی تھی۔ ماں راستہ قطع کر کے اس سے پہلے گھر جا پہنچی۔

معمول کے مطابق وہ بستر میں لیٹ گئی۔ اپنے سارے ہنگامی جذبات کو سینے میں چھپائے یوں لیٹی جیسے کوئی خاص بات وقوع پذیر ہی نہ ہوئی ہو۔

۸

ناجی بڑے محتاط قدم رکھتی گھر میں داخل ہوئی۔ آہستگی سے کواڑ کھول کر اپنے کمرے میں جھانکا۔ ماں بستر میں پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

ناجی اطمینان سے اندر داخل ہوئی۔ دروازے کی کنڈی چڑھائی اور اپنے بستر کی طرف بڑھی۔

کھدر کی موٹی چادر بستر پر پڑی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے چادر کھول کر اپنے اوپر ڈالی۔

”ناجی“ ماں نے اچانک پلٹ کر اسے پکارا۔

”کیا ہے ماں؟“ ناجی نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

”آگئی ہو“ ماں نے سر قدرے اونچا کر کے اسے دیکھا۔

”ہاں ماں“ وہ اٹھ کر ماں کے پاس آئی۔ اس کی چارپائی پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”میں آگئی ہوں۔ ماں کیا بات ہے؟“

”کب آئیں۔“

”ابھی ابھی۔ کچھ ہی دیر ہوئی۔“

”اتنی دیر سے کہاں تھی۔“ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پٹی پر بٹھالیا۔ ناجی کا

دل بری طرح کانپ گیا۔

”کھیل رہی تھی ماں۔“ وہ تھوک نکل کر اپنے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے

بولی۔

”اندھیرے میں کونسا کھیل کھیل رہی تھی؟“

”آنکھ مچولی۔“

”آنکھ مچولی؟“



”اندھیرے میں تو یوں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس پر آنکھوں پر پٹی بچہ باندھ لی جائے تو۔۔“ ماں چپ ہو گئی۔

ناجی ماں کے وقار، دبدبے اور انداز سے سہم گئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔ دے کی ٹٹماتی لومیں اس نے ہل بھر کو ماں کی طرف دیکھا۔ لیکن پھر نکلیں اٹھانے کی ہمت نہ کر سکی۔

”ہوانی میں ایسے کھیل من کو بھاتے ضرور ہیں۔ لیکن ان کا انجام خطرناک ہو رہا ہے۔“ ماں نے سنجیدگی سے کہا۔ ناجی گھبرا کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

”سو جاؤ ماں“ ناجی نے گھبراہٹ چھپاتے ہوئے جلدی سے ماں کی چادر درست کی۔

”اب تک سوئی ہی رہی ہوں۔“ ماں نے ناجی کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اب جانے کی ضرورت ہے۔“

”ماں“ ناجی کی حسین شبیمنی آنکھوں میں خوف، معصومیت، حیرت اور پریشانی تھی۔

”تم نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے۔ تمہیں راستہ دکھانے کے لیے مجھے جاگ ہی پڑے گا۔“

”ماں“ ناجی رو ہانسی ہو گئی۔ ماں کی عجیب عجیب باتوں سے وہ کتنی پریشان رہ گئی تھی۔

ماں نے گہری نظروں سے ناجی کو دیکھا۔ یہ نظریں ناجی کے دل کا ہر راز پالینے کی طاقت رکھتی تھیں۔

ناجی بری طرح گھبرا رہی تھی۔ من میں چور تھا۔ اس کا دم الجھنے کا۔ رنگ فق تھا۔ سنندلی پریشانی پر پسینے کے تھے تھے قطرے چکنے لگے۔

”ہوانی دوانی ہوتی ہے“ ماں بستر میں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اس عمر میں کاتے بھی پھول نظر آتے ہیں۔“

”ناجی۔۔ آج میری عزت کا دامن شعلوں کی لپیٹ میں آگیا ہے۔“

”ماں“

”ناجی۔۔ سچ سچ بتا دے تو اس وقت کہاں سے آتی ہے۔“

اس نے چابکا کہہ دے کہ کھیل کے میدان سے، لیکن جانے کیوں وہ جھوٹ نہ بول سکی۔ اس کا سر جھک گیا۔ ڈر اور خوف کی سرد سی لہر اس کے وجود میں سنسناہٹ پیدا کر گئی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بیہوش ہو کر گرا چاہتی ہو۔

”کہاں تھی تو اس وقت؟“ ماں کے ہلچے میں گرج تھی۔

ناجی کانپ گئی۔

”بتا دے ورنہ جان لے تیری ماں کے ہاتھوں میں ابھی اتنی سکت ہے کہ اپنی عزت کے دامن کو داغ سے بچانے کے لیے تیرا گلا کھونٹ دے۔“

”ماں“ ناجی اس کی گود میں منہ چھپا کر بے اختیار رو دی۔ یہ اس کے جرم کا کھلا اعتراف تھا۔

ماں چند لمحوں کے لیے سکتے میں آگئی۔ ناجی سسک سسک کر روتی رہی۔

”تو نے آخر وہی کیا جس سے خبردار میں تجھے پھین سے کرتی آرہی تھی۔۔“

ماں صرف اسی قدر کہہ سکی۔ اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

”ماں“ بے بس ناجی ہچکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔

”کون ہے وہ ذلیل۔۔ جو رات کے اندھیرے میں تجھے ورغلائے آتا ہے؟“

”اے۔۔۔ اے کچھ نہ کہو ماں۔“

”ناجی!“

”وہ بہت اچھا ہے ماں۔۔ بہت اچھا ہے۔“ ہچکیاں بھرتے ہوئے ناجی کہہ رہی تھی۔

”تیری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ اچھے برے کی تیزی کہاں ہوگی تجھے۔۔ اس بات کا احساس تجھے اس وقت ہو گا جس وقت بمونرا پھول کا رس چوس کر اڑ جائے گا۔ کلی کو روند کر بیٹھ کے لیے منہ موڑ لے گا۔“

”تمہیں ماں۔۔“ ناجی سسکیاں بھرتے ہوئے بولی ”وہ ایسا نہیں ہے وہ۔۔“

وہ مجھ سے۔۔ سچا پیار۔۔ کرتا ہے ماں۔۔

”اسی آڑ میں تو مرد تم جیسی نادان لڑکیوں کو لوٹا کرتے ہیں بہت۔“



”نہیں ماں وہ جھوٹ نہیں کہتا۔“ ناجی نے عزم سے چمکتی ہوئی نظروں سے  
ماں کو دیکھا اور پھر سر جھکا کر بولی۔۔۔ ”وہ۔۔۔ وہ لال محل میں رہتا ہے ماں۔۔۔ وہ  
موٹے سے نواب صاحب تم نے ایک دفعہ مجھے دکھائے تھے نا۔۔۔“  
”ہاں“

”وہ ان کا بیٹا ہے ماں۔“ ناجی نے بھیگی آنکھوں سے پھر ماں کو دیکھا۔  
”ناجی!!“ ماں حیرت و استعجاب سے پہنچ اٹھی۔  
ناجی حیران ہو کر ماں کو دیکھنے لگی۔

”وہ نواب کا بیٹا ہے۔“ وہ ناجی کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔  
”ہاں ماں“ ناجی مسکرا دی۔ روتے روتے مسکرا دی۔ بھیگی بھیگی مسکراہٹ  
جیسے برستی کھٹاؤں کا سینہ پیر کر چمکتی دھوپ نکل آتی ہو۔  
ماں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ”تجھے ڈوبنا ہی تھا تو ایسی جگہ پر  
ڈوبتی جہاں کچھ نشان تو باقی رہتا۔۔۔ سر بھی پھوڑا تو ہتھکری دیواروں سے۔“  
”ماں“ ناجی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ماں کا کندھا ہلایا۔

”وہ اک نواب زادہ اور تو ایک بے آسرا بیوہ کی لڑکی۔۔۔ میں نے جس ڈر سے  
ہمیشہ تجھے متنبہ کیا وہی پیش آیا۔۔۔ آہ۔۔۔ ناجی۔۔۔!“  
ماں سر تھامے بڑبڑا رہی تھی۔ ناجی کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی۔۔۔ لیکن یہ بات وہ  
سمجھ گئی کہ نواب زادے محبت نہیں کرتے۔ لیکن اس کا سیاں تو لڑسا نہ تھا۔ وہ ماں کی  
چرباٹ پر کیونکر ایمان لے آتی۔ وہ لمبی چوڑی باتیں تو سمجھنے کی بے شک صلاحیت نہ  
رکھتی تھی۔ لیکن محسوسات کا آئہ تو ہمیشہ اسے سیاں کی محبت کا احساس دلاتا رہتا تھا۔  
ماں کی ساری باتوں کے جواب میں اس نے بڑے سرشار لہجے میں سیاں کی بے  
پشہار محبت کا اسے یقین دلانا چاہا۔

”پیارے ہنوانوں کا کھیل ہے ناجی“ ماں کرخت لہجے میں بولی۔ ”تو اس کے لیے  
ایک رنگین کھلونا ہے بس۔“

ماں کے لہجے میں ڈانٹ تھی۔ ناجی پھر رونے لگی۔  
”اس کا خیال دل سے نکال دے۔ ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا۔ تیرا اور اس کا کوئی  
جوڑ نہیں۔“

ناجی ماں کی گود میں منہ چھپائے روتی رہی۔

”تو اس کے چنگل میں کیسے پھنس گئی ناجی۔۔۔؟ وہ کہاں سے آگیا“

ماں کے بار بار استفسار پر ناجی نے روتے دھوتے بلا کم و کاست اپنی معصوم  
محبت کا فسانہ ماں کے سامنے دہرایا۔

ماں تیز نظروں سے ناجی کو دیکھتے ہوئے سن رہی تھی۔ ناجی کے آنسوؤں سے  
بھیکے چہرے پر تقدس کا نور تھا۔ روتی آنکھیں محبت کی جوت سے چمک رہی تھیں۔  
صداقت اور معصومیت کے استراج نے اس کے چہرے کو اس حد تک پُر نور بنا رکھا تھا کہ  
اس کا ضمیر اس کی پاکیزگی کے احتراف میں جھج اٹھا۔

پھر بھی دل کی تسکین کے لیے ماں نے ہر طریق سے اسے کرید اناجی کی صف  
گوئی اور ماں کی ہر بات کے بے دھڑک جواب نے اس کے مشکوک ذہن کے زاویے  
بدل دیے۔ وہ معصوم تھی۔ اس کی محبت پاک تھی۔ ابھی تک کچھ نہیں بگڑا تھا۔  
لیکن اس آنکھی دوراہے پر ناجی کو اب چھوڑنا عقلمندی نہ تھی۔ اسے تھام کر راستہ بدل  
دینے کے لیے ماں کو عقلمندی سے کام لینا تھا۔

”یہ بہت برا ہوا بیٹی“ ماں کے رویے میں نرمی آگئی۔

”کیوں ماں“ ناجی نے معصومیت سے کہا۔ وہ اب تک سسکیاں بھر رہی  
تھی۔

”پیارے کا سوانگ بھر کر یہ مرونا سمجھ لڑکیوں کو ہر باد کر دیتے ہیں بیٹی۔“  
”نہیں ماں۔۔۔ وہ میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ مجھے اپنی  
دانی بنا کر محل میں لے جائے گا۔“ ناجی نادام سی ہو کر پھر ماں کی گود میں جھک گئی۔  
”محل میں؟“

”ہاں ہاں“

”ہونہ۔۔۔ محلوں کے خواب دکھا کر وہ تجھے جھوٹے دیوں کے قابل بھی نہیں  
رہنے دے گا۔ وہ تو۔۔۔“

”اے سانا کہو ماں“ ناجی نے گھبرا کر ماں کی بات کاٹ دی۔  
”اس کا فریب بڑا رنگین ہے ناجی تیرا من بہلائے کو اس نے محلوں کے پہنچے  
دکھائے ہیں۔“



”مگر نے سے پہلے سنبھل جا۔۔۔ اس سے ملنے کا اب خیال بھی دل میں نہ لانا۔“  
 ”ماں“ ناجی کی روح ہمہ پکار بن کر چیخ اٹھی۔ وہ ماں کی گود میں منہ چھپا کر ہلکے  
 ہلکے کر رونے لگی۔ ماں نے اسے دونوں شانوں سے پکڑا اور جھٹک کر سیدھا بٹھلایا۔  
 ”کبھی میری بات۔۔۔“

ناجی ہچکیاں لینے لگی۔

”کان کھول کر سن لے اگر اب بھی تو نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو مجھ جیسے  
 گراں پتھر سے ٹکرا کر تجھے راہ بنانا ہوگی۔“

”ماں“ ناجی کے ہلچے میں منت والتجا تھی۔

لیکن ماں کا دل نہیں پسینا۔۔۔  
 وہ روتی رہی۔

ماں نے چپ نہیں کرایا۔ پانی کے اس ریلے کا رخ یہیں سے موڑ لینے کی  
 ضرورت تھی۔ ماں اس ضرورت کی اہمیت کو خوب سمجھ چکی تھی۔ وہ کوئی اور ہوتا تو  
 شاید ماں کے رویے میں لچک کی گنجائش بھی ٹھل آتی لیکن وہ اک نواب زادہ تھا۔ جس  
 سے ناجی کے مستقبل کی وابستگی کا خیال بھی ماں کے فہم و ادراک میں نہ آسکتا تھا۔  
 ناجی روتی رہی۔

ماں نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئی تو ماں اسے زہر دے کر  
 اپنی نیند سعادے گی۔

ناجی کے آنسو، آہیں، التجائیں، کوئی بھی تو ماں کی آہنی پابندی کو موڑ توڑ نہ  
 سکیں۔

ناجی ساری رات روتی رہی۔ صبح اٹھی تو اس کی آنکھیں اس حد تک متورم تھیں  
 کہ کھولنا محال تھا۔ ماں اس کا درد سمجھتی تھی لیکن یہ تقاضائے مصلحت وہ تلخ اور سخت  
 رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھی۔

صبح سے دوپہر ہو گئی۔ ناجی سراپا غم بنی بستر میں پڑی رہی۔ کبھی رونے لگتی،  
 کبھی خاموشی سے کچھ سوچنے لگتی۔

ناجی نے صبح سے کچھ کھایا پیانا نہ تھا۔ دوپہر بھی ڈھل رہی تھی۔ ماں کی سامتا  
 پکھلنے لگی۔ تھال میں ساگ روٹی رکھ کر وہ ناجی کی چارپائی پر آ بیٹھی۔

”روٹی کھا لو بیٹی“ اس نے پیار سے ناجی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔  
 کشتہ غم ناجی کو بھلا کھانے سے کیا سروکار تھا۔

”اٹھو بیٹی“ ماں نے تھال زمین پر رکھ کر اس کا کندھا ہلایا۔  
 ناجی پھر سسکنے لگی۔

”اٹھ میری نا سمجھ بیٹی“ ماں نے جھٹک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

ماں کی نرمی سے اور پیار سے مغلوب ہو کر ناجی بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر  
 جھکائے وہ اب بھی روتی تھی۔

ماں نے پیار سے اس کے الجھے بال درست کر کے دوپٹے اس کے سر پر ڈال  
 دیا۔

”تو نا سمجھ ہے میری بیٹی۔ زمانے کے رنگ نہیں دیکھے۔ ان مردوں کا کیا  
 بھروسہ۔ پیار کے نام پر لوٹ لیتے ہیں۔ جب عورت کے پاس لٹائے کو کچھ نہیں رہتا  
 تو اسی طرح منہ پھیر لیتے ہیں جیسے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ عورت کہیں کی نہیں رہتی۔  
 لوگ اسے فاحشہ اور بدکار کہہ کر اس کے سایے سے دور بھاگتے ہیں۔ اس کے واسن پر



ایسا سیاہ دل لگ جاتا ہے جسے وہ اپنی زندگی دے کر بھی نہیں مٹا سکتی ۔

ناجی سر جھکائے آنسو بہاتی رہی ۔

”ناجی میں نے اپنی بھرپور جوانی اس کھاؤں میں گزاری ہے ۔ بیوگی میں جوانی کا تئادو بھر جاتا ہے ۔ لیکن میرا دامن آج تک بے داغ ہے ۔ کھاؤں بھر میں میری عزت ہے ۔ لوگ میرے نام پر شرافت کی قسم کھاتے ہیں ۔ تیری ذرا سی لغزش میرے سیاہ دل و دنوں پر سیاہی پھیر دے گی ۔ کھاؤں میں کسی کے کانوں میں ذرا بھی بھٹک پڑے گی تو راتوں کے اندھیرے میں کسی سے ملنے جاتی ہے تو قیامت مچ جائے گی ۔ جینا دو بھر جاتے گا ۔ تیرے پیار کی پاکیزگی کو کوئی نہیں دیکھے گا بلکہ تجھے ۔۔۔ تجھے !“

”ماں“ ناجی نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا ۔۔۔ اس کا دل پکھل پکھل کر آنسو بنا جا رہا تھا ۔ سیاں کو کیسے چھوڑ سکے گی وہ ۔۔۔ یہ تو خیال بھی سو بان روح تھا ۔ ماں نے اسے اپنی محبت کی شفقتوں سے سنبھالا دینے کی کوشش کی ، بہلیا ، پھسلیا ۔ کھاؤں میں چند سال پہلے شیدو کا واقعہ پیش آیا تھا ۔ شہری بابو اسے کہیں کاہ چھوڑ کر اپنے راستے پر چل دیا تھا ۔ شیدو اپنے گناہ کی سیاہی چھپانے کے لیے پہاڑی ندی میں ڈوب مری تھی ۔

اور

وہ جوشی کی کہانی تو کھاؤں بھر میں مشہور ہے ۔ کیسے کیسے سبز باغ دکھا کر وہ بے روز مرد اس معصوم کو لے اڑا تھا ۔ محبت کے سنہری سپنوں کی تعبیر ڈھونڈتی جوشی کے ہاتھ کچھ بھی تو نہ آیا تھا ۔ ماں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھی تھی ۔ اور جب لٹی لٹائی وہ پھر اس کھاؤں میں سر چھپانے کے لیے آجھی تھی تو اس کے گھر والوں نے اسے وہ عبرت ناک سزا دی تھی کہ کھاؤں والوں کے دل کانپ کانپ اٹھے تھے ۔

ماں نے ناجی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شیدو اور جوشی کے واقعات سنائے ۔ ناجی سر تاپا کانپ گئی ۔

”کیا تو بھی اپنا ایسا ہی مشردیکھنا چاہتی ہے ۔“ ماں نے کہا ۔

”ماں ۔۔۔ وہ ایسا نہیں“ ایک بار پھر پورے وثوق کے ساتھ وہ کہا اٹھی ۔ ”وہ ان سب سے بڑھ کر ہو گا ۔“ ماں ترشی سے جیسے چلا اٹھی ۔ ”وہ نواب“

کا ۔ ایسی بات بھی نہ سوچو ۔۔۔ یہ تو اک جال ہے جس میں پھنسانے کے لیے وہ تجھے پھسلا رہا ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری لالچ رکھ لی اور تجھے بچا لیا ۔۔۔ ورنہ ۔۔۔“ انجام کا خیال کر کے ماں کو جھرجھری آگئی ۔

ماں کی باتیں ناجی کے دل سے سیاں کی محبت تو زائل نہ کر سکیں ہاں وہ اس سے اس طرح چھپ چھپ کر ملنے کی قباحت کو ضرور سمجھ گئی ۔ اس نے آنسو دوپٹے کے آئینل سے پونچھ لیے ۔

ماں کے اصرار پر اس نے منہ دھویا ۔ چند نوالے زہر مار کیے اور پھر بستر پر آکر لیٹ گئی ۔

دن جوں توں کر کے گزر گیا ۔

رات آئی ۔

ناجی کا سینہ جذبات کے تلاطم سے شق ہو جانے کو تھا ۔

ماں کی دور رس منظریں اس کی ذہنی کیفیت سے پوری طرح واقف تھیں ۔ ناجی ماں کی عائد کردہ پابندیاں توڑ کر اپنے سیاں کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی ۔ لیکن ماں اک خاموش پہریدار کی طرح اس کی نگرانی کر رہی تھی ۔ ناجی میں ماں سے ٹکرائے کی بھی تو ہمت نہ تھی ۔ وہ اس کی ماں تھی ۔ جس نے اسے جنم دیا تھا ۔ اور بیوگی میں اپنی جوانی کے خون سے اس کے غل جیات کو سینچا تھا ۔ ناجی ماں سے بغاوت کیوں کر دیتی ۔

ناجی کا ذہن کچے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا ۔ دل و دماغ کیلی لکڑیوں کی طرح سلگ رہے تھے ۔ اپنی چارپائی پر پڑی وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی ۔ جوں جوں رات گزر رہی تھی ۔ اس کی تڑپ میں اضافہ ہو رہا تھا ۔

جذبات کی کش مکش میں تڑپتے تڑپتے جانے کب ناجی کی آنکھ لگ گئی ۔ ماں نے آہستگی سے اسے پکارا جواب نہ پا کر اٹھی اور ناجی پر جھک گئی ۔

وہ سو رہی تھی ۔ مضطرب سی نیند ۔

ماں نے اس کی پیشانی چوم لی ۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے گر کر ناجی کے بالوں میں جذب ہو گئے ۔

ہٹ کر وہ اپنی چارپائی پر آہٹھی ۔ مامتا کی چش سے اس کے سینے میں جلن سی



پوری تھی۔ کاش وہ اپنی بچی کی ہر خواہش پوری کرنے کی قدرت رکھتی۔  
وہ کافی دیر تک جاگتی رہی۔ اپنی بے بسی پر رونا بھی آیا۔ کاتب تقدیر سے  
اس نے اپنی بیوگی پر کبھی اس دکھ اور بے بسی سے گلہ نہیں کیا تھا جتنا آج کر رہی تھی۔  
کاش ناجی اس نواب زادے کے ہم پلہ ہوتی یا وہی نواب زادہ ہونے کی بجائے اسی کی طرح  
کوئی عام سا آدمی ہوتا۔ وہ اپنی بچی کا مستقبل اس کی خواہشوں کے سانچے میں ڈھال  
دیتی۔

ناجی بدستور سو رہی تھی۔ ماں نے اسے پھر دیکھا۔ اٹھ کر اس پر چادر ٹھیک کی  
اور پھر مطمئن ہو کر خود بھی لیٹ گئی۔ جلد ہی اس کے تھکے ہوئے ذہن اور اچھے ہونے  
وہم کو نیند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اور

کافی رات ڈھلے۔ جب پچھلی تاریخوں کا مضمحل چاند سینہ چرخ پر معلوم دم  
سی روشنی بکھیرنے کی سعی کر رہا تھا۔ ناجی ہر بڑا کر اٹھ بیٹھی۔  
”سیاں“ اس کے ہونٹوں سے فریاد سی نکلی۔ گھبرا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔  
دلے کی دم حم سی روشنی تحرک تحرک کر بچھنے کو تھی۔ دروازہ بند تھا اور ماں گہری نیند  
میں خراٹے لے رہی تھی۔

اس نے دونوں ہتھیلیوں پر اپنی آنکھیں رکھ دیں۔ ذہن پوری طرح بیدار  
چکا تھا۔ حقائق کی تلخی سامنے آگئی تھی۔  
لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کی روح ”سیاں، سیاں“ پکار رہی تھی۔  
پکار کالوہ پلہ تیز ہو رہی تھی۔

”سیاں انتظار کر رہا ہو گا۔“ وہ اس خیال پر تڑپ اٹھی۔

روح کی پکار اک خاموش شور بنتی گئی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں“ ناجی نے سر جھٹک دیا۔ گھبرا کر اس نے اپنے کانوں  
میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ لیکن یہ شور رکنا نہیں۔ رکتا بھی کیسے؟ یہ شور تو اس کی دنیا  
کی گہرائیوں سے اٹھ رہا تھا۔

ناجی اس شور میں ڈوبتی گئی۔

ماں کی نصیحتیں ڈوبتی گئیں۔  
دھمکیاں ڈوبتی گئیں۔

اور

پھر ساری پابندیاں اس شور میں ڈوب گئیں۔ ناجی چادر ہٹا کر بستر سے اٹھ  
بیٹھی۔ ماں گہری نیند سو رہی تھی۔  
اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

اپنے اور سیاں کے درمیان ماں اک سنگ لٹخ چٹان نظر آئی۔  
وہ مشتعل جذبات سے ماں کو گھورنے لگی۔ اس نے چاہا کہ ایک ہی جست میں  
اس چٹان کو پھلانگ جائے۔

دلے کی تحرکتی کو میں اس نے قریب آکر ماں کو دیکھا۔ ماں اس وقت چٹان  
نہیں دکھائی دی بلکہ ایسا قابل تحریم مرقد معلوم ہوئی جسے پھلانگنا تو ایک طرف اس کی طرف  
پشت کر کے کھڑا ہونا بھی گناہ کبیرہ ہو۔

بے دم سی ہو کر ناجی پیچھے ہٹی۔ اپنے بستر پر گر کر وہ بے اختیار رونے لگی۔ وہ  
کیا کرے کیا نہ کرے، الجھن نے جیسے اس کے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔  
وہ پاکلوں کی طرح اٹھ کر پھر نے لگی۔

اور

پھر اس نے سیاں کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آخری بار جانے کا۔ اس  
کے بعد اس سے نہیں ملے گی۔۔۔ کبھی نہیں ملے گی۔ لیکن آج آخری بار ضرور جائے  
گی۔۔۔ سیاں کو اونچ نیچ سمجھانے، ماں کے خیالات سے مطلع کرنے۔ زمانے کی ہوا کا  
رخ بتانے۔

اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

وہ کشاں کشاں اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ ماں کا ڈرول سے نکل چکا تھا۔

ماں نے پوچھا بھی تو وہ سچ سچ بتا کر پھر سیاں سے نہ ملنے کی قسم کھالے گی۔

ظاہر حسب معمول درختوں کے جھنڈ میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ناجی وقت

پر نہ آئی تو ان کا دم گھٹنے لگا۔ وقت گزر گیا۔ رات کی ہنسیاں ڈوبتی گئیں۔ ظاہر مابہی ہے

آب کی طرح کبھی کھلے میہ ان میں اور کبھی نشیبی حصے میں تڑپتے پھر رہے تھے۔



دکھ کی آمیزش تھی۔

ناجی نے سر جھکا لیا۔ آنچل سے آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ طاہر کے بازوؤں کی گرفت سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ طاہر نے اسے وہیں سبزے پر اپنے قریب بٹھالیا۔ پھر طاہر کے بار بار پونچھنے پر اس نے ساری بات طاہر سے کہہ دی۔  
 ”ماں کہتی ہے“ وہ بوجھل آواز میں بولی ”تم مجھے برباد کر کے چھوڑ دو گے۔“  
 ”ناجی“ طاہریوں چہچہے جیسے کوئی بے گناہ جرم عائد ہونے پر چہچہا اٹھے۔  
 ”سیاں۔۔ میں کیا کروں۔۔!“ وہ پھر رو دی۔۔ ”ماں کہتی ہے یہاں دھنواؤں کا کھیل ہے۔۔“

طاہر کے چہرے پر آثارِ کرب تھے۔ ہوشوں کو کاٹتے پریشانی کے عالم میں وہ اپنی اٹھکیاں مسل رہے تھے۔

ناجی نے آنچل سے اپنے آنسو پونچھے۔

”میں جاتی ہوں سیاں۔۔ ماں جاگ جانے لگی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 طاہر کسی دقیق سوچ میں الجھے تھے۔ ناجی کی آواز پر چوٹے۔ اور پھر اٹھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

”جاری ہو ناجی؟“ طاہر نے افسردگی سے کہا۔

”ہاں“ کلوگیر سا جواب تھا۔

”جاؤ“ آہستگی سے کہا گیا۔

ناجی نے ان کی طرف دیکھا۔ بے قرار ہو کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر کالوں پر پھسل گئے۔

طاہر نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔۔ ”ناجی۔۔ ایوں رورو کر اپنے آپ کو بھگان نہ کرو۔۔ تمہارے لیے میں زمانے سے ٹکرا جاؤں گا۔۔ میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا ناجی۔۔ تمہاری ماں پر یہ ثابت کروں گا کہ یہاں دھنواؤں کا کھیل ہی نہیں، ان کی زندگی بھی ہوا کرتا ہے۔“

”سیاں“ وہ فوراً جذبات میں ناجی کی آواز گھٹ گئی۔ اس کی روتی آنکھوں میں جیسے دھن سے جل اٹھے۔

”جاؤ ناجی“ طاہر نے اپنے ہاتھ ہٹا دیے۔ ”کل سے تم یہاں نہ آیا کرنا۔۔“

تاب ہو کر کئی بار انہوں نے ناجی ناجی پکارا تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور طاہر کی سبے جالی جنون بنتی جا رہی تھی۔

رات کا چمکلا پہر تھا۔ طاہر سبزے پر سر تلے دونوں ہاتھ باندھے پخت پڑے تھے۔ ناجی کے نہ آنے سے وہ بے جان سے منظر آرہے تھے۔ سوچ سوچ کر ان کا دل مڑا مڑا ہوا جا رہا تھا۔

”سیاں“ ناجی کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز خاموشی کے سینے میں گونجتی ہوئی آئی۔  
 طاہر بے اختیار اٹھ کر آواز کی سمت دوڑے۔ ناجی کا سایہ دیکھ کر وہ مقناطیس کشش سے اس کی جانب کھنچے۔

”ناجی!“ طاہر نے لاشعوری طور پر اپنے بازو پھیلائے۔ ناجی بے اختیار ان بازوؤں کے حلقے میں سما گئی۔

”ناجی۔۔ تم کہاں تھیں ناجی“ طاہر نے اس کے حسین پیکر کو پوری قوت سے سمیٹ کر درد بھری آواز میں کہا۔

ناجی ان کے کندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

”ناجی“ طاہر بے تاب ہو گئے۔

”سیاں“ ناجی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

طاہر کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ اس کے نہ آنے سے ہی سمجھ گئے تھے وہ کیا ہے۔ اب ناجی رو رہی تھی۔ طاہر جیسے زیرک انسان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ ان کا دل فلک کی رفتار کو گولہ نہیں۔

ناجی ہچکیاں لے رہی تھی۔ طاہر نے اس کے کانپتے وجود کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اور پھر بڑی عقیدت سے اپنے لب اس کے بالوں پر رکھ دیئے۔  
 ناجی کے آنسوؤں سے ان کے کوٹ کا کالر اور قمیص بھیگ رہی تھی۔ طاہر کی حالت جانفزاں تھی۔

پشیمانی اپنے آپ کو سنبھالا دے کر طاہر نے ناجی کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ سے تھام لیا۔

”سیاں“ ناجی پشیمانی فریاد بن گئی۔  
 ”کیوں ناجی“ طاہر نے اس کی متوزم آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز



ناہی نے ڈنڈہ ہالی آنکھوں سے طاہر کو دیکھا۔  
 "اب میں تمہارے گھر آؤں گا" طاہر نے ہاتھ عزم سے کہا۔  
 "میرے گھر" آؤ اور ہر ت سے ناہی کا اپ گئی۔  
 "ہاں۔۔۔ تمہارے گھر۔۔۔ تمہاری ماں سے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے  
 مانگئے۔۔۔"

ناہی نے حالات کو بھول کر فردا کے حسین تصور سے مجھوم گئی۔  
 "تمہیں پسند دن انتظار کرنا پڑے گا۔۔۔ لیکن گھبراانا نہیں۔۔۔"  
 "سیاں" سراسیمگی سے ناہی کہہ اٹھی۔

"میری ریلیں بڑی کٹھن ہیں ناہی۔۔۔" طاہر نے اس کی سراسیمہ نظروں میں  
 پر تیش نظر سے دیکھا۔ لیکن مشکلات حل کرنے کی جی کو ہوتی ہیں۔ میرے  
 والدین میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوں گے۔ انہیں رام کرنے کے لیے  
 کچھ دن ضرور لگیں گے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات مان جائیں گے اور میں  
 تمہیں اپنی خواہش کے مطابق اپنے خاندانی وقار کے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں گا۔"  
 انہوں نے ناہی کے ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے دبائے۔ "وعدہ کرو تمہارا انتظار  
 نہیں توڑے گا۔"

ناہی نے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ "میں تمام عمر تمہارا انتظار کر  
 سکتی ہوں۔" ناہی کا ہاتھ تھاٹھا طاہر آج اسے گھر کے دروازے تک چھوڑنے گئے۔  
 دونوں ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھتے رہے۔  
 آج دونوں ایک غیر معین عرصہ کے لیے جدا ہو رہے تھے۔ گو اس عارضی جدائی  
 کے عقب میں خوشیاں مسکرا رہی تھیں۔ تاہم جدائی جدائی ہی تھی۔ دونوں  
 جانگسل دونوں کے خیال سے افسردہ واداس نظر آرہے تھے۔  
 انتظار کا وعدہ لے کر طاہر نے ناہی کو خدا حافظ کہا۔  
 وہ لوٹ گئے۔

ناہی کی آنکھیں ایک بار پھر ٹپک اٹھیں۔  
 طاہر کا دل بھی ڈوب رہا تھا۔ مگر ناہی کو دیکھنے کی بجائے انہوں نے اپنی  
 تیز کردی۔

(۱۰)

الحماء میں جیسے کوئی ہم پہنٹا۔

طاہر نے فوزیہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ جشن کے پروگرام بن رہے تھے شادی کو  
 روایتی آن بان سے کہیں بڑھ چڑھ کر منانے کے اہتمام ہو رہے تھے۔ طاہر نواب فاروق  
 علی خاں کے چہیتے اور منظور غفر تھے۔ اس لیے یہ شادی اک تاریخی اہمیت رکھتی تھی۔  
 حسن بانو بڑے ارمانوں سے تیاریوں میں مصروف تھیں۔ رحمان کی والدہ  
 سعدیہ ان کا ہاتھ بٹانے میں پیش پیش تھیں۔ ایک طرف دیور دوسری طرف بہن خوشی  
 سے شادی کی گہما گہمیوں میں شریک تھیں۔

طاہر نے اچانک اس شادی سے انکار کر دیا۔

اس انکار سے اک ہنگامہ پیدا ہو گیا۔

اور

جب انہوں نے اپنے انتخاب کو والدین کے سامنے رکھا تو یہ ہنگامہ ایک قیامت  
 خیز دور میں داخل ہو گیا۔

صدیوں سے اک خاص آن بان کا حامل خاندان اپنے وسیع دامنوں تلے ایک  
 پہاڑی کنوارن دوشیزہ کے لیے جگہ نہ بنا سکتا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کو جسے تہذیب و تمدن  
 کی روشنی نہ ملی ہو۔ جس کا غیر معروف خاندان کسی طرح بھی اس عالی مرتبت خاندان  
 سے مناسبت نہ رکھتا ہو، کیسے قبول کر لیا جاتا۔

یہ اس پر شکوہ خاندان کی بے عزتی تھی۔

یہ وقار کی ہتک تھی۔

یہ جاہ و جلال کی توہین تھی۔



ظاہر کی نادانی سمجھ کر انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے نرمی سے سمجھایا گیا۔  
منت و سماعت بھی کی گئی۔ ساحرانہ کشش کے حامل سبز باغ بھی دکھانے گئے۔ لیکن  
ظاہر اپنے عزم سے ذرہ بھر بھی ادھر ادھر نہ ہوئے۔ ایک بار جو فیصلہ کر لیتے وہ پتھر پر کھینچ  
ہوا کرتا تھا۔ یہ تو ان کی زندگی کا سوال تھا۔ ان کے پیار کا معاملہ تھا۔  
نرمی سے سمجھانا بھٹانا اس نہ آیا۔

تو

پدرائے وقار جلال میں آگیا۔

مستاز غمی ناگن کی طرح پھٹکاری۔

خانہ افی وقار، نام نمود، ظاہر داری، عظمت و آن کی خون آشام تلوار۔

ہر اہیں۔

لیکن

کوئی بات بھی ظاہر کو اپنے عزم صمیم سے ہٹانا نہ سکی۔ کوئی بات بھی انہیں  
مترزل نہ کر سکی۔ ان کا ایک ہی جواب تھا کہ شادی ہوگی تو صرف ناجی سے ہوگی۔  
معاملہ کسی طرح بھی نہ پیٹ سکا تو نواب فاروق علی خاں نے آخری وارڈ کے بارے  
میں اپنی خواب گاہ میں طلب کیا۔

رات کے کھانے کے بعد سب اپنی اپنی خواب گاہوں میں جا چکے تھے۔ ابھی  
ایک مضمحل سا سکوت اور تہجم سی اداسی الحمراء کے در و دیوار پر چھائی رہتی تھی۔  
شام ہی گہری رات کا احساس ہوتا۔ رونقیں دم توڑ چکی تھیں۔ کھانے کے بعد  
بٹھنے کا شایہ کوئی تمنائی ہی نہ رہا تھا۔

نواب فاروق اپنی خواب گاہ میں بے تابی سے ٹہل رہے تھے۔ ظاہر کی سرکشی سے  
ان کے وقار کو جو گزند پہنچی تھی، اس کے آثار ان کے پُر رعب چہرے پر بڑے  
نظر آتے تھے۔ وسیع اور شہانہ ٹھکانہ سے آرامتہ خواب گاہ میں بھی انہیں لاشاد  
محسوس ہو رہا تھا۔

بیٹے کا پیار دل میں دروین کر سلگ رہا تھا لیکن خانہ افی آن کے محافظ اور روایت  
ہر دست فاروق اپنے نظریے میں چمک کے روادار ہی نہ تھے۔  
ظاہر اجازت کے کر اندر داخل ہوئے۔

فاروق کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔

باپ بیٹے کی نفائس ملیں۔ ظاہر نے نظریں جھکالیں۔  
لیکن

اس جھکاؤ میں شکست نہ تھی۔ احترام تھا۔  
”ظاہر“ پُر رعب آواز کمرے میں گونج پیدا کر گئی۔  
”جی“ مؤدبانہ جواب تھا۔

”میں نے جس مقصد کے لیے تمہیں بلایا ہے، تم جانتے ہو۔“ سنگین لہجے میں  
کہا گیا۔

”جی ہاں“ جواب میں اٹل فیصلے کی گونج تھی۔

”پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”جو پہلے تھا“

”ظاہر!“

”ابا حضور“

”خوب سوچ لو۔ یہ سودا خسارے کا ہے۔ اس وقت عالم بنون میں تم کچھ سوچ  
نہیں سکتے۔ لیکن یہ بنون جتنی تیزی سے آتا ہے، اسی طرح سے اتر بھی جاتا ہے۔۔  
اپنے کئے پر تمہیں کچھ تانا پڑے گا۔“

”میں نے بہت سوچ بچار کر لی حضور!“

”تو اس دیہاتی کنوارن لڑکی کے۔۔“

”ابا حضور۔۔“

”یہ لڑکی غالباً حسین ہوگی“ باپ نے بیٹے کو قطعاً منظر انداز کر کے پھر طنز کیا ”لیکن  
یاد رکھو کہ یہ کنوار حسن تہذیب یافتہ ماحول میں کبھی نہیں پنپ سکتا۔ جنگلی پھول کاٹے  
دار جھاڑیوں میں ہی زیب دیتے ہیں۔ نکھرے ہوئے آراستہ پھنوں میں وہ بھد سے اور بد  
تریب دکھائی دیتے ہیں۔“

ظاہر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔ آدابِ فرزند ی مانع تھے۔ بمشکل ضبط  
کیے کھڑے تھے۔ ورنہ وہ نواب فاروق کو اپنے الفاظ واپس لینے کا حکم دے دیتے۔

ظاہر نہ نرمی سے مرعوب ہوئے نہ طنز سے۔ باپ کی برداشت جواب دے



نہی۔  
 فاروق جلال میں آگئے ان کی آواز شیروں کی چٹکھاڑ اور طوفانوں کی گرج تھی۔  
 طاہر اپنے برافروختہ جذبات کو قابو میں رکھنے کی سعی کر رہے تھے۔  
 ”تو اس دیہاتی لڑکی کے لیے تم ہم سے ٹکرا رہے ہو؟“  
 ”میں اس کے لیے زمانے سے ٹکرا سکتا ہوں۔“  
 ”بنو ان حدود کو چھو رہا ہے۔“  
 ”آپ کی دور رس نظریں بہت کچھ دیکھ سکتی ہیں۔“  
 ”اس کا انجام جانتے ہو؟“  
 ”جو ہو گا۔ ذمہ دار میں خود ہوں۔“  
 ”پھر سوچ لو۔۔!“

”اتنی دفعہ سوچا کہ اب سوچنے کی گنجائش ہے نا ضرورت۔“  
 ”طاہر۔۔۔“

”جی“

”تم خود سری پہ آمادہ ہو۔“

”اگر آپ نے بخوشی اجازت نہ دی تو میں ایسا کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“  
 ”یاد رکھو تمہاری مجبوری ہماری مجبوری سے ٹکرائی تو انجام تمہارے لیے خطرناک ہو گا۔“

طاہر نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔۔۔ چپ ہو گئے۔۔۔ لیکن بے چینی ان کی رگ میں سے مترشح تھی۔ سرخ انکارہ سی آنکھیں، پھرکتے ہونٹ۔۔۔ اور سفاک جسم کی ہر جنبش سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی بات پر اسی طرح قائم ہیں۔

نواب فاروق بھی اپنے مشتعل جذبات پر قابو پانے کی کوشش میں تھے۔۔۔ کے بیٹیاں اور بے حرک جو بات سے ان کی آتش غضب بری طرح بجھوک اٹھی تھی۔۔۔ بھی دل کے کسی گوشے میں درد بن کر سلگتا ہوا پیار طاہر کو سوچ کا اور موقع دینا چاہتا تھا۔ ان کی آنکھیں سرخ انکارہ ہو رہی تھیں۔ ہاتھوں میں خفیف سارے تھا۔  
 ”طاہر“ وہ گدے سے دار کرسی پر بیٹھتے ہوئے قدرے نرمی سے بولے ”ہم تباہ“

غور کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ اپنی تقدیر پر سیاہی پھیرنے سے پہلے پھر ایک بار اچھی طرح سوچ لو۔ جس راستے پر آنکھیں بند کر کے کامزن ہو، آنکھیں کھول کر اچھی طرح جائزہ لے لو۔۔۔ جاؤ سوچو۔۔۔ اور پھر ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع کرنا۔۔۔ جاؤ۔۔۔!“  
 طاہر کھڑے رہے۔ باپ کی نرمی نے ان کے سینے کا نقشہ ختم کر دیا تھا۔ پھرے ہوئے جذبات اس نرمی سے درد بن گئے تھے۔  
 ”تم جاسکتے ہو“ نواب فاروق نے آہستگی سے کہا۔  
 لیکن طاہر واپس جانے کی بجائے بے تابانہ باپ کی طرف بڑھے۔  
 ”ابا حضور!“ وہ معصوم بچے کی طرح باپ کے قدموں پر گر گئے۔  
 بیٹے کی اس حرکت پر باپ کا دل پگھل گیا۔ لیکن وہ اپنے اٹل فیصلے پر سختی سے کاربند تھے۔

”ابا حضور! مجھے مجبور نہ کیجئے“ طاہر نے سر اٹھا کر باپ کے زانو پر ٹکا دیا۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح سسک رہے تھے۔

”طاہر“ باپ کی گلوگیر آواز ابھری۔۔۔ وہ اپنے ہاتھ بے ساختہ طاہر کے بالوں پر شفقت سے پھیرنے لگے۔

وہ چپ تھے۔ اور خواب گاہ کا خوابیدہ ماحول طاہر کی سسکیوں سے لرزیدہ تھا۔

”میرے بچے!“ کافی دیر چپ رہنے کے بعد نواب فاروق بولے ”حالات کو سمجھو بیٹے، ہمارے خاندانی حالات کیا ہیں۔ تمہیں فوزیہ سے منسوب ہونے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ تمہاری خالہ زاد ہے۔ تمہاری خالہ بیمار رہتی ہیں۔ یہ خبر ان کے لیے سم قاتل ہوگی۔ منگنی ٹوٹ جانا کتنی معیوب بات ہے۔“

”میں فوزیہ کو ایک مستقل آزار کے کچھ نہ دے سکوں گا ابا حضور! اتنی زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔۔۔ فوزیہ کے لیے اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے میں۔۔۔ میں نابی کے بغیر۔۔۔ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا ابا حضور۔۔۔ مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔۔۔ میں آپ کی شفقتوں کے سایہ سے محروم نہیں رہنا چاہتا ابا حضور۔!“

طاہر نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔  
 باپ نے منہ پھیر لیا۔ شاید بیٹے کے ملتجیانہ تاثرات سے ان کے سینے کا پتھر



”ابا حضور! مجھے بخوشی اجازت دیجئے۔“ طاہر نے پھر اسی طرح باپ کی طرف

دیکھا۔

”جاؤ بیٹے“ باپ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہارے جذبات پہلے

ہونے ہیں۔ جا کر آرام کرو۔“

”ابا حضور!“

”معاذے کو نبھانے کے متعلق سوچو۔ ہمارا فیصلہ اٹل ہے اور۔۔ ہم مرتے دم

تک اس پر کاربند رہیں گے۔۔ آوازیوں محل رہی تھی۔ جیسے کوئی زبردستی ان کے

مند سے یہ باتیں اگلا رہا ہو۔“

طاہر مایوس ہو گئے۔

وہ اٹھے اور کمرے سے یوں محل گئے جیسے روح قالب سے مرنے کے بعد سب

بند حق توڑ کر محل جاتی ہے۔

”یہ حیلہ بھی کارگر نہ ہوا۔ خواہ مخواہ کی خفت ہی اٹھانی وہاں جا کر۔“

”آپ نے جلد ہی سے کام لیا حضور۔۔ ورنہ میں ناجی کی ماں کو ضرور مجبور کر

دیتا۔۔ پیسہ بڑی چیز ہے جناب۔۔ ایمان بک جاتا ہے۔ وہ ضرور لہنتی مٹنی کو صاحب

زادے کی راہ سے ہٹانے کی حامی بھر لیتی۔“

”یہ تمہاری بھول ہے سیفوا۔ ہم نے اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا۔ وہ ایک

غیرت مند عورت ہے۔ دولت اسے خرید نہیں سکتی۔“

”ہے تو غیرت مند“

”توٹ دیکھ کر وہ کس طرح جھپٹتی تھی۔ کتنا جلال تھا اس کے چہرے پر۔“

”اُف کتنے نادام ہونے تھے ہم اس لمحہ۔۔ پتہ ہوتا تو پیسے کی بات ہی نہ کرتے۔ منت

سماجت سے کام لیتے۔“

”پھر تو کام منٹوں میں بن جاتا۔“

”اچھا شیر۔۔ اب اس بات کو چھوڑو۔۔ کوئی دوسرا حل تلاش کرو۔۔ طاہر کو

اس راہ سے ہر طور ہٹانا ہے ہاں طاہر کو علم نہ ہونے پائے کہ ہم کھاؤں گئے تھے۔“

”میں سمجھتا ہوں سرکار۔۔ انہیں کیسے علم ہو گا۔“

شوئی تقدیر دونوں کی باتیں طاہر نے بھی سن لیں۔ وہ خواب کاہ میں آج باپ

سے آخری فیصلہ کرنے آئے تھے۔ آخری دو ٹوک فیصلہ۔ سیفوا اور باپ کی باتوں سے

حقیقت سامنے آئی۔ ان کی اس بے رحمانہ ذہنیت پر ان کا خون کھول اٹھا۔

پھر سے ہونے جذبات لیے وہ خواب کاہ کا پردہ اٹھا کر بغیر اجازت اندر آ پہنچے۔

سیفوا انہیں دیکھ کر بے طرح گھبرا گیا۔ فاروق نے ان کے تیوروں سے ہی

بھانپ لیا کہ ان کا ارادہ کیا ہے۔



شکست خوردہ تو تھے ہی۔ بیٹے کی گستاخانہ حد تک ضد سے جھٹلا گئے۔ پریشانی پر بل پڑے۔ آنکھوں میں غصہ کی چمک لہرائی۔ گھور کر بیٹے کو دیکھا۔  
 ”ابا حضور۔ میں آخری بار آپ کی خدمت۔۔۔“ طاہر غصہ پر قابو پانے کی کوشش میں بولے۔

”یوں وبال جان بننے سے بہتر تھا کہ تمہیں موت آجاتی۔۔۔“ انہوں نے تلخی سے گرج کر کہا۔

”آپ اب بھی یہی سمجھتے کہ طاہر مر گیا۔۔۔“ وہ پلٹے۔

”اس خود سری کی سزا بھینٹک ہوگی۔“ نواب گرجے۔

”مجھے اس کی پروا نہیں۔۔۔“ اسی لمحے میں جواب دیا گیا۔

سیفو جلدی سے اٹھ کر طاہر کے سامنے آیا۔ شانے سے پکڑتے ہوئے انہیں واپس باپ کی طرف لاتا چاہا۔

لیکن جوانی کے طوفانوں کو یوں بھی کبھی روکا جاسکتا ہے۔ طاہر نے اس کا ہاتھ غصے سے جھٹک دیا۔

”انہیں جانے دو سیفو۔۔۔“

”نواب صاحب! آپ ہی ذرا نمٹنے سے دل سے سوچئے۔“

”ہم نے سب سوچ لیا۔ اس خود سری کی سزا اسے بھگتنے دو۔“ وہ رو روکاراں کی طرح کڑکے۔

”ہم انہیں ان کے حق و راحت سے محروم کرتے ہیں۔“

”نواب صاحب!“

”جہاں۔۔۔“ وہ بوجھاؤ۔۔۔ اگر تم لاشی شدہ ہر قائم ہو تو اسی وقت المراء کو چھوڑ کر

پکڑنے کو چکا۔ لیکن وہ است و حکاوت سے کھل گئے۔ سیفو انہیں

سیفو اس غلامان کا پرانا ٹکٹ خوار تھا۔ بات پڑھتے دیکھ کر سید صاحب

پاس پہنچا۔ وہ نشست گاہ سے نواب گاد کی طرف جا رہی تھیں۔ سیفو نے ہانپتے ہوئے ساری روداد انہیں

”آپ چل کر نواب صاحب کو سمجھائیے میکم صاحب۔۔۔ طاہر تو نا سمجھ ہیں۔ ضد کر بیٹھے ہیں۔ وہی اپنے فیصلے میں ترمیم کر لیں۔“

”انہیں جانے دو۔۔۔“ میکم صاحب نے فرمایا۔

سیفو نے منظر اٹھا کر دیکھا۔ میکم صاحب کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ ہونٹ کاٹپ رہے تھے۔ لیکن روایت پرستی میں وہ شوہر سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں۔

”میکم صاحب!“

”سیفو۔۔۔ طاہر والدین سے ٹکرا رہے ہیں۔ انہیں اس خود سری کا نتیجہ بھی دیکھ لینے دو۔“

”نواب صاحب نے انہیں ماق کر دینے کی دھمکی دی ہے۔“

”دھمکی نہیں۔“ حقیقت ہوگی۔ انہوں نے بہتر کیا۔ طاہر کو سیدھی داد صرف اسی صورت میں منظر آسکے گی۔۔۔“

”آپ طاہر میاں ہی کو سمجھائیے۔“

”فضول ہے۔۔۔ طاہر کی بات و شعر پر لکیر ہوتی ہے۔ وہ ہو کہیں، کر گزرتے ہیں۔“

”پھر میکم صاحب۔۔۔ کیا ہو گا۔۔۔“

”ہو ہو گا ہونے دو۔“

سیفو جانتا تھا کہ میکم صاحب بھی بمبوی آن کی خاطر عدالت کے چپے بند ہوں کو موت کی نیند سلانا چاہتی ہیں۔

مایوس ہو کر وہ لوٹا۔ طاہر کے کمرے کی طرف آیا وہ ابھی اپنے کمرے ہی میں تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ باپ کی دھمکی کو عملی جامہ پہنا کر وہ رات المراء کی پیمائشوں کے پر گزرتے گزادیں گے۔

وہ سید صاحب کے پاس گیا۔ بڑا بھائی ہونے کی صورت میں ان پر بھی تو کچھ ذمہ داریاں تھیں۔

طاہر سیفو کے ساتھ آنے۔ سعدی بھی رونہ ادھن کر ان کے پیچھے آئی۔ طاہر اپنے کمرے میں تھے۔ غصے سے کانپ رہے تھے۔ دماغی نسیر جیسے پھٹ جانا چاہتی

ہیں۔ جب والدین کی محبت مرچکی تھی تو پھر انہیں کس بات کی قیہ تھی۔



جوانی کا خون جوش لھا رہا تھا۔

اپنا بڑا سا چرمی صندوق کھولے وہ اپنی ذاتی چیزیں اس میں الٹ پلٹ ٹھونس رہے تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے کا آراستہ کمرہ اب الٹ پلٹ چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔  
طاہر نیم دیوانگی کے عالم میں چیزیں رکھ رہے تھے۔ ہال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے۔ رنج و غم سے زرد چہرہ اور کمزور منظر آ رہا تھا۔ باپ سے انہیں کس قدر محبت تھی، شاید یہ حالت اسی وجہ سے ہو رہی تھی لیکن وہ مجبور تھے۔  
میز کی دراز کھول کر انہوں نے کاغذات الٹ پلٹ کے دیکھے۔ بینک میں ان کی ذاتی رقم کافی تھی۔ فکرِ فردا سے مہینوں بے غم رہ سکتے تھے۔  
اپنا چرمی بکس اٹھا کر جوش غیظ و غضب سے تپتے وہ کمرے پر الوداعی منظر ڈال کر کمرے سے باہر نکلے۔

دروازے پر اظہر اور سیفون مل گئے۔

”کہاں جا رہے ہو طاہر؟“ اظہر نے لپک کر انہیں شانے سے پکڑ لیا۔  
”ہاں تقدر لے جانے۔“  
”پاکل ہو گئے ہو۔“  
”چھوڑ دس مجھے۔“

”طاہر بچہ کیوں بنتے ہو۔“ سعدیہ نے بھی بڑھ کر انہیں تھام لیا۔

بھائی بھانج نے بہتیرا سمجھایا۔ سیفون نے منتیں کیں۔ لیکن طاہر کہاں مانتے والے تھے۔ سبھی کو پہچان گئے تھے۔ یہی بھائی بھانج تو ان کی مخالفت میں ہیش ہیش تھے۔

”تو اب صاحب کو میں منالوں کا صاحب زادے۔ اس وقت وہ غصہ میں تھے۔ کچھ دن صبر کرو۔“ سیفون منت کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے اب کسی کی ضرورت نہیں۔“ طاہر نے بھڑکتے ہوئے جواب دیا۔  
”ایسی خود مرضی بھی اچھی نہیں ہوتی طاہر۔“ سعدیہ نے روپانسی آواز میں کہا۔  
”خود مرضی کیسی۔“ مجھے تو حاق کر دیا گیا ہے۔ آپ ہی کا مفاد ہے۔“  
طاہر ہلکا کر بولے۔

”طاہر تمہاری سوچ کے رخ یوں بدل گئے ہیں۔ ایک لڑکی کی خاطر۔“ اظہر نے

پورا نہ کر سکے۔

”ایک لڑکی نہیں بھائی جان۔ ایک وعدہ۔“ طاہر اپنے وعدے سے نہیں بچ سکتا۔ وراثت تو ایک طرف، مجھے اپنی جان بھی دینا پڑے تو گریزنہ کروں گا۔“  
کندھا جھٹک کر انہوں نے بھائی کا ہاتھ ہٹایا۔ اور ان کی طرف دیکھے بغیر اپنا صندوق اٹھاتے نکل گئے۔

ایک بار انہوں نے مڑ کر ضرور دیکھا۔ سعدیہ اور اظہر ابھی تک برآمدے کے ستون سے لگے کھڑے تھے۔ سیفون گردن جھکائے ہاتھ مل رہا تھا۔  
انہوں نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتے الحمراء کے بیرونی پھانک سے باہر نکل گئے۔

آج ایفائے عہد اور پیسہ کی خاطر طاہر واقعی زمانے سے ٹکرا گئے تھے۔ عارضی قیام کے لیے وہ اپنے دوست آصف کے ہاں چلے گئے۔





رہتے، خاردار جھاڑیوں سے اٹھتے، پھولوں کی چھیرے سے بچتے پھلتے طاہر غیر جموار زمین پر راستہ بناتے بے اختیار جان آرزو کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔  
 ناجی ہاتھ پر میٹھی تھی۔ اس کے سیاہ لائے ریشمی بال ہوا کے جھونکوں سے پریشان ہو رہے تھے۔ دوپٹے سر سے کھسک کر شانوں پر اگرا تھا۔ آنچل اڑ رہے تھے۔ لیکن ناجی بے سدھ میٹھی تھی۔

طاہر دبے قدموں سے بڑھے۔ ناجی کی ان کی جانب پشت تھی۔  
 ناجی بے خبر میٹھی تھی۔ رات بھر رونے سے آنکھیں متورم تھیں۔ ماں نے بہتیرا سمجھایا۔ پیار کیا۔ اپنے اور نواب صاحب کے درمیانی خلا کا احساس دلایا لیکن ناجی تو سیاں کے پیار میں اس طرح ڈوب چکی تھی کہ یہ بہلاوے اسے کنارے پر لانے کی بجائے اور گہرائیوں میں لے جا رہے تھے۔  
 ساری رات تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل کر اس گھاٹی میں آ میٹھی تھی جہاں اس کے سادو سے ذہن پر عشق و محبت کی کل کاریاں ہوتی تھیں۔ جہاں اس کی بے بو و باس زندگی میں پھولوں کی مہک رچی تھی۔

اور

جہاں اس کا تنہا سادل اک انوکھی کسک اور درد بھری لذت سے آشنا ہوا تھا۔ وہ اپنے غم میں ڈوبی تھی۔ طاہر دھیرے دھیرے بڑھے اور چپکے سے اپنے ہاتھ ناجی کی آنکھوں پر رکھ دیئے۔

”سیاں“ ناجی بے اختیار چیخ اٹھی۔ اس نے جلدی سے طاہر کی کلائیوں کو تھام لیا۔

”ناجی“ طاہر کی اٹھکیوں میں آنسو جذب ہو گئے۔ تڑپ کر انہوں نے ہاتھ کھینچے اور گھوم کر اس کے سامنے آ گئے۔

”سیاں!“ ناجی کی جل بھری آنکھوں میں درد بھرا شکوہ تھا۔ فراق کی گھٹن تھی۔ عشق کی چپش تھی۔ وہ ڈبڈباتی آنکھوں سے طاہر کو دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

طاہر نے بازو پھیلا دیئے۔ ناجی ان بازوؤں کی گرفت میں آ گئی۔ طاہر کے کندھے پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔  
 طاہر کی زبان گنگ تھی۔ ہجر کے جاگسل لمحوں کا انہیں اب احساس ہو رہا تھا۔

رات بھر کی اوجھری اور یہ قرار نیند طاہر کی آنکھوں میں سرخی بن کر چھلک رہی تھی۔ اپنے پیار اور وعدے کی خاطر وہ والدین، بھائی بہن اور ایک پُر تعیش ماحول چھوڑ آئے تھے۔ صبح اٹھے تو طبیعت بو جھل تھی۔ سینے میں ہلکی ہلکی کسک بھی تھی۔ والدین سے ٹکراؤ گستاخانہ صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس پر انہیں نہ امت بھی ہو رہی تھی۔

لیکن

اس کے باوجود ان کا عزم راسخ تھا۔ ناجی جو مقام حاصل کر چکی تھی، اس سے اسے ہٹانا ان کے بس میں نہیں تھا۔ افسوس تھا تو صرف اس بات کا کہ والدین نے ان کی خوشی میں خوشی سے شرکت نہ کی۔ وہ ایسا کرتے تو طاہر کی خوشیوں کا رنگ ہی اودھ ہوتا۔

صبح ہی صبح وہ ناجی کی ماں سے ملنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آصف ان کی ہٹ اور فائدے واقف تھا۔ اس لیے انہیں سمجھانے بجھانے کی فضول کوشش نہ کی۔  
 طاہر ناجی کے ہاں چل دیئے۔

دن بڑا روشن تھا۔ آغاز سرما کی یہ صبح بڑی خوش گوار تھی۔ نم آلود سی دھوپ مکمل پوش پہناؤں کے بلند و پست پر پھیلی ہوئی تھی۔

طاہر اپنی دھن میں مست ٹیڑھے پہاڑی راستے پر اک فاتح کے سے انداز سے بڑھے جا رہے تھے۔ پہلے موڑ پر انہوں نے لاشعوری طور پر نیچے گھاٹی میں دیکھا۔

ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ میں انہیں سفید آنچل لہراتے دکھائی دیئے۔  
 انہیں جانتے میں ذرا بھی وقت نہ ہوئی کہ وہ ناجی تھی۔  
 لہر جانے لگی بجائے وہ گھاٹی میں اترنے لگی۔



چند لمحے ناجی کی سسکیاں طاہر کی خاموشی سے ٹکرانی رہیں۔

طاہر نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے ناجی کی ٹھوڑی کو اٹھکیوں کے سہارے

لوٹا لیا۔

”ناجی!“

”تم آگئے یاں۔۔۔ تم آگئے۔۔۔“ وہ روتے روتے مسکرا دی۔۔۔ یوں  
جیسے شبنم سے دھلی گلاب کی پتیاں ہوا کے ہلکورے سے لرز گئی ہوں۔  
”میں آگیا ہوں ناجی۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگیا ہوں۔“

”سچ؟“

”ہاں ناجی“ طاہر نے اسے پوری شدت سے بازوؤں کی گرفت میں جکڑ لیا۔  
”جب ہمیں کسی دباؤ کا ڈنڈہ نہیں ناجی۔۔۔ ہم دونوں ایک ہو گئے ہیں۔۔۔ ایک۔۔۔“  
ناجی نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر طاہر کے کندھے پر ٹکا دیا۔ اک رومانی سکون  
کا احساس اس کے دھڑکنے والے سینے میں مسرت کی لہر بن کر دوڑنے لگا۔  
اس دن کافی دیر تک دونوں اس ہتھ پر بیٹھے رہے۔ طاہر ناجی کی مخروٹھی آنکھوں  
سے کہتے ہوئے اپنے مستقبل کے خاکے میں رنگ بھرتے رہے۔ ناجی ان کی سنگت  
کی غیب جاودانی سے معمور سی میٹھی رہی۔ طاہر اسے اتنے دنوں کی روداد سناتے رہے۔  
ناجی ان کے حرم سے بڑی متاثر نظر آرہی تھی۔

”چلو ناجی“ کافی دیر کے بعد طاہر اٹھے۔ ناجی کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھایا۔

”کہاں؟“

”تمہارے کمر“

”میرے کمر؟“

”ہاں“

”کیوں؟“

”وہ مجھک گئی۔

”ماں جی کے پاس“

”آپ جانیں گے۔۔۔ آپ ماں کے۔۔۔ پاس جائیں گے۔“

”کیوں؟“

”آپ جانیں گے۔۔۔ آپ ماں کے۔۔۔ پاس جائیں گے۔“

”اب کوئی بات مان رہا ہے۔“

”ہے۔۔۔“

ناجی کی لمبی لمبی پلکیں حسین آنکھوں پر جھک کر تھرکنے لگیں۔

”ماں جی سے مل کر ہی تمہارا ہاتھ طلب کر سکتا ہوں نا۔“

ناجی شرمائی شرمائی سی کھڑی تھی۔ حسن کا یہ محبوب انداز کتنا پیارا تھا۔ طاہر  
دل تھام کر رہ گئے۔

”آؤ نا“

”میں نہیں جاتی۔“

”کیوں؟“

”تم اکیلے جاؤ۔۔۔“ ناجی اپنا چہرہ چھپا کر بھاگ گئی۔

”میرے واپس آنے تک یہیں رہنا۔۔۔“ طاہر نے آواز دی۔

ناجی شوخی سے مسکراتی ان سے دور بھاگتی گئی۔

طاہر چند لمحے اسے دیکھتے رہے، پھر مڑے اور اوپر چڑھنے لگے۔

وہ سیدھے ناجی کے کمر گئے۔ ماں مٹی کے چولہے کے پاس میٹھی ہنڈیا پکارتی  
تھی۔ اس نے طاہر کو دیکھا۔

بوکھلائی

گھبرائی

اور جلدی جلدی ہانڈی میں چمچ بھانے لگی۔

طاہر خفت آلود تجسم ہونٹوں پر لیے ادب سے سلام کرتے ہوئے بلا جھجک  
کمرے میں چلے گئے۔

ماں کو یہ جانتے میں قطعاً دیر نہ لگی کہ یہی وہ نواب زادہ ہے جس کے لیے اس  
کی باولی بیٹی جان کی بازی اٹھا بیٹھی ہے۔

طاہر کے بے پناہ مردانہ حسن، وقار آمیز چال اور شائستہ انداز تھا طلب سے وہ بڑی  
مرعوب ہوئی۔

کتنا موزوں جوڑ تھا۔ اس کے دل کے کسی گوشے سے مہذب ہونٹ لیکن  
دوسرے ہی لمحے اسے طبقاتی حد بندیوں کا احساس ہوا۔ اس کے دل کے گوشے سے اٹھنے

والی صدا۔ غم پر گئی۔



میں آگئی۔

”جوانی اندھی ہوتی ہے صاحب زادے۔۔ اپنی حیثیت کو نہ بھولتے آپ اسے بڑے نواب۔۔“

”میں ایک معمولی آدمی ہوں ماں جی۔۔“ طاہر ماں کے گھٹنے پر جھک گئے۔۔  
 ”میں نے ناجی کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔۔ والدین۔۔ گھر بار۔۔ چاہو حشم۔۔ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔۔ میری ضد کو دیکھ کر والد صاحب نے مجھے حق وراثت سے محروم کر دیا ہے۔ لیکن مجھے کچھ پروا نہیں۔ میرے بازوؤں میں اتنی ہمت ہے کہ میں اپنا اور ناجی کی زندگی کا بار آبرو مند اند طریق سے سہا سکوں۔“  
 طاہر چارپائی کے قریب گھٹنا ٹیکے ماں کے زانو پر ہاتھ رکھے اسے اک خوش گوار مستقبل کا یقین دلارہے تھے۔

اور

ماں

پوری آنکھیں کھولے طاہر کو دیکھنے جا رہی تھی۔ طاہر کے انکشاف سے اس کا سارا جسم لرز گیا تھا۔ طاہر کی محبت ان حدود کو چھو لے گی۔ ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس پیار کو ایک امیر زادے کے تعیش پسند ذہن کی تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہوئے تھی۔

طاہر نے ساری روداد ماں کو کہہ سنائی۔ ماں بت بنی ان کی باتیں سنتی رہی۔  
 ”ماں جی“ طاہر نے بے حس و حرکت میٹھی ماں کے گھٹنوں کو بلایا۔ ”مجھے مایوس نہ کیجئے، آپ کا انکار مجھے زندگی اپنے ہاتھوں ختم کر لینے پر مجبور کر دے گا۔ ناجی! میری زندگی ہے ماں۔۔ اس کے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔۔“  
 طاہر کی آواز فرط جذبات سے رندہ گئی۔ بے بس ہو کر انہوں نے اپنا سر ماں کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

ماں کے لیے یہ لمحات انتہائی کٹھن تھے۔ طاہر نے جس اپنائیت اور خلوص سے اپنا سر ماں کے گھٹنے پر رکھا تھا۔ مروت کا تقاضا تھا کہ ماں اپنا دست شفقت ان کے سر پر پھیرتے ہوئے انہیں زندگی کی سب سے بڑی مسرت کا یقین دلا دے۔  
 لیکن حالات کی تلخی کو وہ کیونکر نظر انداز کر دیتی۔ جذباتی رومیں بہہ کر کے

طاہر کمرے میں آکر کھڑے ہو گئے۔

ماں اٹھ کر اندر آئی۔ سرتاپا انہیں دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔  
 ”آپ کے لیے میں اجنبی نہیں ہوں۔“ طاہر نظریں جھکا کر مسکراتے ہوئے بولے ”میرا نام طاہر ہے۔۔ میں نواب فاروق علی خاں کالڑ کا ہوں۔۔“  
 ماں نے ہکا بھکا کر پھر انہیں گہری نظروں سے دیکھا۔  
 ”میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔۔ کہ۔۔ کہ۔۔“ طاہر ہچکچا گئے۔  
 سمجھ نہ آئی تھی کہ اپنے آنے کا دعا ماں پر کیوں کر بیان کر دے۔۔  
 ”رات آپ کے والد صاحب بھی تو آئے تھے۔۔“ ماں طاہر کی ہچکچاہٹ سے ان کا دعا سمجھتے ہوئے بولی۔

طاہر نے ماں کے لہجے کی چبھن اچھی طرح محسوس کی۔

”آپ کو ہمارے حالات معلوم ہو چکے ہیں۔۔“ طاہر جلدی سے بولے۔۔  
 ”بڑی اچھی طرح سے۔۔“ ماں چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ طاہر سے بھی اس نے بیٹھنے کو کہا لیکن طاہر بیٹھے نہیں، نادام سے کھڑے تھے۔  
 ”مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے پیسے کے زور سے آپ کو مرعوب کر کے اپنا مطلب جاننے کی کوشش کی۔“

”انہوں نے کوئی انہونی بات نہیں کی۔“ ماں کھمبیر سنجیدہ آواز میں بولی۔  
 ”بھنگی ہوئی اولاد کو راہ راست پر لانے کے لیے والدین کو ہر جتن کرنا پڑتا ہے۔“  
 ”ہوش مند اور جوان اولاد اپنے راستے کا تعین خود کر سکتی ہے۔ والدین کی ہر کامیابی ہے جو سیدھے راستے کو بھی الٹا سمجھیں۔“

ماں نے اک بار پھر گہری نظروں سے طاہر کو دیکھا۔  
 ”آپ کیا چاہتے ہیں اب۔۔؟“

”میری جس کی مخالفت میرا پورا خاندان کر رہا ہے۔“  
 ”اس کے باوجود آپ یہاں آ گئے۔“

”میں اپنے راستے کا تعین کر چکا ہوں ماں جی۔۔ اس راہ سے مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہ ہٹا سکتی۔“  
 طاہر کی آواز میں صداقت واستحکام اتنے نمایاں تھے کہ ماں، چشمہ لمحوں کے لیے



ہوئے فیصلے جیسا کہ پشیمانی کا باعث بنتے ہیں۔

”صاحب زادے۔۔۔ جلد بازی کا نتیجہ پشیمانی ہوتا ہے۔“

”ماں جی! ظاہر نے سرائٹھا کر ماں کو دیکھا۔

”بعد میں چمھٹانے سے بہتر ہے ابھی سوچ سمجھ سے کام لیا جائے۔“ ماں ان

کی منقروں سے منظر میں چار نہ کر سکی۔۔۔

”والدین اتنے کٹھن کیوں ہو جاتے ہیں؟“ ظاہر جھٹلا سے گئے۔ ”اولاد کی چھوٹی

سی چھوٹی خوشی پر جان قربان کرنے والے والدین ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو

روئے میں دریغ نہیں کرتے۔۔۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے۔

ماں مچھانگی سے ہاتھ ملتے ہوئے آنسو پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہم بہت غریب ہیں بیٹا۔۔۔“ بالآخر وہ کہہ اٹھی۔ ”ناجی کسی لحاظ سے بھی تو

اس قابل نہیں۔۔۔ کہ۔۔۔“

”ماں جی۔۔۔ ایسا کہہ کر میرے جذبات کو مجروح نہ کیجئے۔“

ماں اور ظاہر میں کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔

ماں مرعوب تو ہو گئی۔ لیکن اس اعتراف میں چپکچاپٹ تھی اپنی کم مانگی کا

احساس ہو تھا۔

ظاہر نے امکان بھر سنی کی۔ منت کی۔۔۔ خوشامد کی۔۔۔ اپنی بے پناہ محبت کا

یقین دلایا۔ اپنی وفا کے استحقاق کی قسم کھائی۔

ماں سوچ میں پڑ گئی۔

ظاہر اس کے ہونٹوں سے اسی وقت مڑوڑ چائے فرا سننا چاہتے تھے جس طرح ہن

پڑا، انہوں نے ناٹمی کی ماں کو مجبور کیا۔

اور

ماں مجبور ہو گئی۔

لیکن

ایک دم ہاں نہ کہہ سکی۔۔۔ ”مجھے کچھ سوچنے کا موقع تو دو بیٹے۔۔۔“

ظاہر نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر پھیلتے تبسم کو چھپانے کی

کوشش کر رہی تھی۔ اس کے لہجے میں کتنی اپنائیت تھی۔ اس کے رویے میں

چمک بھی تو کافی آگئی تھی۔

”ماں جی“ ظاہر خوشی سے محو اٹھے۔ ”خوب سوچ لیں لیکن آخر میری بات

آپ کو ماننا پڑے گی۔“

ماں ضبط کے باوجود مسکرا رہی تھی۔

ظاہر مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔ کسی انجانی سی لذت کا احساس ان کے

حواس پر چھایا جا رہا تھا۔

بیکے بیکے قدم اٹھاتے وہ گھائی کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں ان کی جان تنہا

انتظار بنی بیٹھی تھی۔



”میں ماں ہوں بیٹا - - یہ باتیں کہنا تو نہیں چاہئیں - لیکن دل بھول جاتا ہے - - تم نے ناجی کی خاطر گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا ہے -“  
 ”اس کے سوا کیا کر سکتا تھا -“  
 ”کسی وقت ناجی کو بھی چھوڑ - -“

”ماں“ طاہر چیخ اٹھا - - ”وہ وقت میری زندگی میں نہیں آئیگا ماں - - ناجی سے مجھے میری موت ہی جدا کر سکے گی - دنیا کی اور کوئی طاقت نہیں - -“  
 ماں کا دل سنبھل گیا - وہ مسکرائے لگی -

”آئندہ ایسی باتیں نہ کرنے کا وعدہ کیجئے ماں - - آپ میری خوشیوں کے گلے پہ چھری رکھ دیتی ہیں ایسا کہہ کر - -“

”اچھا بیٹا - - خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے -“

”میں آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں - -“

”اللہ تمہیں اپنی رحمتوں کے سایہ میں رکھے -“  
 طاہر خوش ہو گئے -

طاہر بہت جلد شادی کر کے اس معاملے کو نپٹانا چاہتے تھے - ماں سے بات کی - وہ خود بھی جلد اس فرض سے سبک دوش ہونا چاہتی تھی - سارے گاؤں میں چہ سے گویاں ہو رہی تھیں - جتنے منہ اتنی باتیں - کوئی ناجی کی تقدیر پر رشک کر رہا تھا اور کوئی اسے ماں بیٹی کی حماقت سے تعبیر کر رہا تھا -

”میں خود بھی چاہتی ہوں - لوگوں کے منہ تو بند ہو جائیں گے -“  
 گاؤں والوں کے لیے یہ انہونی سی بات ہے - - چاہتی ہوں جتنی جلد ہو سکے معاملہ نپٹ جائے -“

”میں خود بھی دیر کا حامی نہیں - - صرف چند دن اور چاہئیں مجھے جگہ مل گئی ہے - اسے ٹھیک ٹھاک کروالوں -“

طاہر نے شہر کے اک پُر سکون اور پُر بہار حصے میں چھوٹی سی کوٹھی کرایہ پر لے لی تھی - المراء جیسی آراستگی تو میسر نہ آسکی - ہاں رہنے کے لیے انہوں نے اسے اچھا خاصہ سنوار لیا -

ماں کئی دن حال منول کرتی رہی -

اور  
 یہ کئی دن طاہر کے حق میں سوومند ثابت ہوئے - وہ ماں کے بہت قریب آ گئے - اور ان کی فطری ضد اپنا مطالبہ منوانے کے کام آگئی -

ماں نے ان کا دامن مراد امید کے پھولوں سے بھر دیا -

”ناجی تمہاری ہے بیٹا“ ماں نے اپنی زندگی بھر کی متاع ان کے حوالے کر دی -  
 ”ماں!“ فرط جذبات سے طاہر کی آواز گھٹ گئی - ان کی آنکھوں میں اک لافانی چمک ابھری اور حقیقت سے انہوں نے اپنا سر جھکا دیا -

ماں نے شفقت و محبت سے ان کے جھکے ہوئے سر کو بوسہ دے کر انہیں اپنی فرزندگی میں قبول کرنے کے وعدے پر مہر لگا دی -  
 اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں -

”ناجی میرے ابڑے سہاک کی نشانی ہے بیٹا - میں نے اس پھول کو جوانی کا خون دے کر سینچا ہے - اللہ کے بعد تمہیں سوئپ رہی ہوں - ناجی کے پاس کچھ بھی نہیں - نہ دولت ہے نہ تعلیم نہ پختہ ذہن - -“ اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر گالوں پر پھیل گئے - دوپٹے کے انچل سے آنکھیں پونچھ کر اس نے اک گہری سانس لی -

طاہر حقیقت سے سر جھکانے لگوے تھے - اپنی بے پناہ خوشیوں کو دل کی کہانوں میں سمونے کی کوشش کر رہے تھے - ماں کی باتوں کا کچھ جواب نہ دیا -  
 ”اک رنگین کھلوتا ہے - جسے تم نے دل بہلانے کو چن لیا - اسے سنبھال کر رکھنا - جی بھر گیا تو توڑ پھوڑ نہ دینا -“

”ماں جی“ طاہر ان جملوں کی تاب نہ لا کر بے تاب ہو گئے - ”ناجی میری زندگی ہے“



ناجی کے لیے اک ایسی عورت کا بند و بست بھی کیا جو اس کی دیکھ بھال کے لیے اسے تہذیب جدید سے شناسا بھی کر دے۔ خود ساختہ ماحول کے باضابطہ اصولوں سے روشناس بھی کر اسکے۔ ادھیڑ عمر عورت کافی سیانی تھی۔ اس نے طاہر کو یقین دلایا کہ وہ دنوں میں وہ ناجی کو تہذیب و شائستگی کا مجسمہ بنا دے گی۔

آصف کی بیوی کی مدد سے انہوں نے ناجی کے لیے خوب صورت ترین ملبوسات بنوائے۔ نفیس زیور خریدے۔ آرائش کی چیزیں لیں۔

اور

پھر

مقررہ دن وہ اپنے چند دوستوں سمیت ناجی کے ہاں جا پہنچے۔ نکاح کی تقریب خاموشی اور ساگی سے انجام پائی۔

ناجی دلہن بنی۔

گورے گورے ہاتھوں میں مہندی رچی۔ مانگ میں سندور بھرا۔ مدد بخوڑ شبنمی آنکھوں میں کاجل کی ڈوریاں چھینچی گئیں۔ خوشبوؤں سے اس کا مجسمہ کی طرح تراشا ہوا جسم مہک اٹھا۔

سرخ جھلملاتے جوڑے نے ناجی کے حسن کو چار چاند لگا دیئے۔ اس کا لہا شباب پھوٹ پھوٹ گیا۔ طلائی زیورات اس نے زندگی میں پہلی بار پہنے تھے۔ ناجی معصوم حسن اس حسن و زیبائش سے دمک اٹھا۔

ماں کی دعاؤں کے زیر سایہ۔۔۔ سہیلیوں کے وداعی گیتوں اور رخصتی آئینوں کی چھاؤں میں ناجی کو مل ٹہنی کی طرح شرم سے دوہری ہوتی طاہر کے ساتھ ان کے گھر میں آگئی۔

۱۳

طاہر و ناجی ایک دوسرے کی محبت میں سرشار زندگی کی شاہراہ پر گامزن تھے۔ ان کے مہکتے ہوئے شب و روز معصوم محبت کے استحکام کے ضامن تھے۔

بُجوں بُجوں دن گزر رہے تھے۔ ان کی محبت کے والہانہ پن میں شدت آرہی تھی۔ ناجی اگر پہلے پھول تھی تو اب بھرپور بہار تھی۔ کتنا نکھر گیا تھا اس کا حسن۔ کتنی جاذبیت سمو گئی تھی اس کی کافر جوانی میں۔ طاہر اسے پا کر اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتے تھے۔ اپنی تقدیر پر خود ہی رشک آجاتا تھا۔

کتنے مسرور تھے دونوں۔۔۔ خوشیاں ہی خوشیاں بکھری تھیں ہر سو۔ اور اُس دن یہ خوشیاں دوپہند ہو گئیں جس دن انہیں احساس ہوا کہ ان کے پنستان محبت میں اک ٹکڑ کھلنے والا ہے۔

دن مہینوں میں بدلتے گئے۔ طاہر کو گھر چھوڑے تقریباً دس ماہ ہو گئے۔ محبوب بیٹے کی جدائی کا غم باپ کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ خود ساختہ حد بندیوں طاہر کا تو کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ ہاں فاروق کا سینہ چھلنی ضرور کر گئیں۔

دل کا روک بیماری کی صورت میں پھوٹ پڑا۔ پہلے تو تکلیف معمولی سمجھی گئی لیکن جلد ہی بیماری نے تشویش ناک موڑ لیا۔

اور

مہینے کے اندر اندر نواب فاروق کی جان کے لالے پڑ گئے۔ چوٹی کے ڈاکٹر بیماری کے بھوت سے ہر د آزما تھے۔ لیکن

”مرض بڑھتا گیا بچوں جوں دوا کی“ والا معاملہ تھا۔

دوائیں بے کار تھیں۔

دوائیں کارگر نہ ہوتی تھیں۔



ہر لمحہ حیات کا ہلکا موت سے جوڑ رہا تھا۔

الحمرائے ساری روشنیوں میں ہو گئی تھیں۔ طاہر کی شادی سے گھر کی فضا سکوت سا چھا گیا تھا۔ اب تو ہر دل سہما ہوا تھا۔ ہر آنے والا لمحہ کسی نانووش کو اور وہ کے چہرہ پر ہونے کا خائن ہو سکتا تھا۔

شیرازہ حیات آہستہ آہستہ بکھر رہا تھا۔ فاروق کی حالت دن بدن نازک ہوتی جا رہی تھی۔ اکثر ان پر غشی طاری رہتی۔

اور

عالم بے ہوشی میں ان کے کانپتے لبوں پر ایک ہی نام تھرکتا تھا۔

لیکن ہوش میں انہوں نے کبھی طاہر کا نام نہیں لیا تھا۔ اہل نظر دیکھ رہے تھے کہ حیات کی ڈوریاں آہستہ آہستہ منقطع ہو رہی ہیں۔ تجربہ بتا رہا تھا کہ بجھتے چراغ کی آواز کو تھک رہی ہے۔ وضع داری کا دامن اب تک فاروق تھامے ہوئے تھے لیکن محبوب بیٹے سے ملنے کے لیے پکھل پکھل کر ختم ہوا چاہتا تھا۔

خاندان کے چیدہ اور جہاں دیدہ بزرگوں نے مشورہ دیا کہ طاہر کو اس حالت میں بلانا انتہائی ضروری ہے۔ کون جانے کب تنفس کے تار ٹوٹ جائیں۔ اور فاروقی روغ اک مستقل غلغلے کے کرب تک پہنچتی رہے۔

سیف و طاہر کو واپس لانے میں پیش پیش تھا۔ باپ کے دل میں اٹھتے ٹھٹھتے طوفان کو اس نے باہر دیکھا تھا۔ محبت کی تڑپ سے باپ کو اکثر تڑپتے بھی دیکھا تھا۔ تجویز مسن بانو کے سامنے پیش کی گئی۔ وہ اپنی آن کی خاطر بیٹے کو منہ لگا لے لیے تیار تھیں۔

”یہ وقت رہنمائی کو بھلا دینے کا ہے حسن بانو“ آخر ان کے بڑے بھائی کے

”اب اسے جانے کا نام دے۔۔۔“

”بھائی فاروق کی حالت سے کچھ تو اندازہ کرو۔۔۔“

”یہ حالت اسی کی وجہ سے تو ہوئی ہے۔۔۔“

”فاروق بھائی عالم بے ہوشی میں طاہر کو پکارتے ہیں۔ کتنی دردناک ہوتی ہے ان کی پکار۔“

”ان کا دل طاہر میاں سے ملنے کو تڑپ رہا ہے سکیم صابہ۔“ سیف و ہاتھ ملتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔

”ان کی خواہش پوری ہونی چاہیے۔۔۔ مبادا۔۔۔“ کوئی اور بزرگ بولے۔ سب نے حسن بانو کو مجبور کیا۔ حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے طاہر کو بلانے کی حامی بھر لی۔

”سیف و تم ہی جاؤ۔۔۔ اور طاہر کو لے آؤ۔“

”ہاں سیف و۔۔۔ صرف طاہر کو۔۔۔ وہ ڈائن ساتھ نہیں آئیگی۔ سمجھئے۔۔۔“ سکیم صابہ نے اک قید لگادی۔

”سکیم صابہ۔۔۔“

”مجھے کسی سفارش کی ضرورت نہیں۔ آنا ہے تو طاہر اکیلے آئیں۔ ورنہ نہ آئیں۔ میں اس پڑھیل کا وجود اس گھر میں برداشت نہ کر سکوں گی۔“ سیف و چپ ہو گیا۔

طاہر کو باپ کی بیماری کی خبریں آصف اور دوسرے لوگوں سے مل رہی تھیں۔ جوں جوں بیماری تشویش ناک ہوتی جا رہی تھی، طاہر کی بے قراروں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے ابا کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ لیکن وہاں جانے کی برأت نہ کر سکتے تھے۔ آصف سے انہیں اپنے گھر والوں کے خیالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ ان کی حالت اس پرندے کی سی تھی جس سے قوت پر واز پھین لی گئی ہو۔

صرف خود چانا ہوتا تو بات اور تھی ساتھ نابی کو بھی لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن اس بارے میں آصف نے مطلع کر دیا تھا کہ اگر اس لڑکی کے قدم الحمرائے کی زمین سے اٹھوئے تو قیامت شغریٰ پہا ہو جائے گی۔ اس کا وجود تو کیا وہ لوگ اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

شام وہ آصف کے پاس سے آنے تو بڑے پرشورہ تھے۔ ایک تو ابا کی بیماری خطرناک موڑ پر تھی۔ دوسرا نابی کے متعلق گھر والوں نے آصف کے سامنے بڑا زہر اٹھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔



ناہی اور طاہر کھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔۔۔ سیفو نے سیٹ سنبھال کر گاڑی  
کارخانہ کے طرف پھیر دیا۔

آخر طاہر نے سوچا پھر کے بعد فیصلہ کر لیا کہ وہ اگر الحمراء گئے تو ناہی کو ساتھ لے  
جائیں گے۔ شاید موقع کی نزاکت والدین کی ہٹ کو ہکھلا دے اور ناہی کو اس کا اصل  
مقام مل جائے۔

اسی شام سیفو انہیں لینے آگیا۔ نواب صاحب کی بیماری کی داستان سننے کے  
بعد ملتی انداز میں بولا۔ ”بیٹے یہ وقت کسی ہٹ یا ضد کا نہیں۔ نواب صاحب کی  
آنکھیں شاید آپ کو دیکھنے ہی کے لیے کھلی ہیں۔۔۔ اللہ جانے کیا ہونے والا  
ہے۔۔۔“

طاہر پیٹے سے پریشان تھے۔ سیفو کی آمد حالات کی نزاکت کا کھلا ثبوت تھی۔  
طاہر کا دل تڑپ اٹھا۔ باپ کے حضور میں پہنچ کر وہ اپنی گستاخی کی معافی رورور کرنا  
چاہتے تھے۔

”جلدی کرو بیٹے۔۔۔!“

”ٹھہریٹے۔ میں ناہی کو تیار ہونے کے لیے کہہ دوں“ طاہر اٹھے۔

”لیکن۔۔۔ اس۔۔۔ وقت اگر۔۔۔“

”کیا ہے سیفو بابا؟“

”اگر آپ جلدی سے اکیلے ہی چلے چلیں تو اچھا ہو گا۔“

”ناہی میرے ساتھ جائے گی“ فیصلہ کن انداز سے سیفو مرحوب ہو گیا۔

طاہر اندر آنے۔ ناہی پنکب پر لیٹی تھی۔

طاہر نے اسے حالات سے مطلع کیا۔

محل والوں سے خوف زدہ ہونے کے باوجود وہ طاہر کے ساتھ جانے پر آمادہ  
آئی۔ دل میں اب بھی وہی وسوسہ دھڑکا بنا ہوا تھا کہ کہیں طاہر وہیں نہ روک  
جائیں۔ وہ تو طاہر کے جنم جنم کی ساتھی تھی۔ پھر بھلا ان کے بغیر رہنے کا  
کہاں۔

طاہر ناہی کو لیے باہر آگئے۔ سیفو کچھ کہنے کی جرات نہ کر سکا۔ ناہی غیب  
میں کوئی آفاقی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ گنتی عقیدت تھی سیفو کے دل میں۔  
کاش بڑی مدغم اپنے رویے میں تبدیلی کر لیں۔ وہ سوچتے ہوئے کالی موٹر کی  
بڑھا۔ ہٹ کھول کر منڈا۔



رہی تھی۔ ناجی حیرت زدہ سی رنگ و نور کے سیلابوں میں غوطہ زن تھی۔  
ظاہر سر جھکائے قدم اٹھا رہے تھے۔ ان کا دل بے طرح و حرکت رہا تھا۔ باپ کو  
زندگی کے مرغزاروں میں لہکتا چھوڑ کر گئے تھے لیکن۔۔۔!

آج

آج وہ محبوب ہستی موت کی دہلیز پر کھڑی ان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ سارے  
تفرقے، ساری رنجشیں بھول کر طاہر ان کی متوقع جدائی کے جانگسل خیال سے سہمے جا  
رہے تھے۔ دل و دماغ پاش پاش ہوئے جا رہے تھے۔  
برآمدے کے زینے پر قدم رکھتے ہی ان کی نظریں خواب گاہ کے دروازے پر

پڑیں

پروہ ہشا

اور

اتفاقاً حسن بانو باہر نکل آئیں۔  
ماں نے بیٹے

اور

بیٹے نے ماں کو دیکھا۔

مامتا تڑپنی۔ طاہر کے سینے میں جیسے ایک دم سینکڑوں تیرہ سوست ہو گئے۔  
درد کی شدت سے تڑپ اٹھے۔ یہ قراری سے آگے بڑھے  
اور

”امی حضور بہکہ کرماں سے لپٹ گئے۔

ضبط و صبر کے بند ٹوٹ گئے۔ ملن کا موقع ہی کچھ ایسا در انگیز تھا، کوئی بھی تو  
اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا۔ ماں رو رہی تھیں اور طاہر ان کے سینے سے لگے معصوم بچوں  
کی طرح ہچکیاں بھر رہے تھے۔

ناجی یہ رقت انگیز منظر دیکھ کر اور سہم گئی۔ اس کی خوب صورت خواب آلود  
آنکھیں بے قابو ہو کر برس رہی تھیں۔

پہنچے کھڑا سیٹھو بھی اپنے آنسو نہ روک سکا۔

رونے کی آواز سنتے ہی خواب گاہ کے دروازے سے آگے پہنچے خواہ اس ہانڈ سی

۱۵

محل اور محل کی زندگی کا تصور بھی ناجی کے فہم و ادراک سے بعید تھا۔ شہر کے  
پُر بہار گوشے میں اس کی اپنے اقامت گاہ پر تعیش لوازمات سے پُر تھی۔ لیکن اگر  
سے تو اسے کسی طور پر مناسبت نہ تھی۔ ناجی محل میں داخل ہوئی تو اس کے بوڑھے  
خواہس اڑے جا رہے تھے۔ اس محل کا جاہ و جلال دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔

اور

کچھ اہل خانہ کا خیال معصوم دل و دماغ پر خوف بن کر چھایا ہوا تھا۔ یہاں اس  
کی اسے کوئی لگن نہ تھی۔

سہمی سہمی خوف زدہ سی وہ طاہر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ طاہر اس وقت  
اپنے آپ سے بہت دور جا چکے تھے۔ ان کے جذبات میں تلاطم تھا۔ شہر سے آس  
بعد وہ اپنے گہوارہ عشرت میں داخل ہوئے تھے۔  
نہ سمانہ حالات نے کتنی تلخیاں بکھیر دی تھیں۔ اس گھر میں داخل ہونے  
بعد انہیں شاید احساس ہو رہا تھا۔

المرام میں داخل ہوتے ہی منجمد دل میں حرارت پیدا ہو گئی تھی۔ والدین  
بھائی بہنوں اور عزیز واقارب کی محبت اس حرارت سے پکھلنے لگی تھی۔  
بیشکل دل کو سنبھالے، ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے، آنکھوں میں  
پھٹکنے والی نمی کو روکتے وہ اپنے ابا کی خواب گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ناجی کے خوف زدہ سہمے ہوئے چہرے کو انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔  
خواب گاہ کے یہ رونی طویل و عریض کمرے میں روشنیوں کا سیلاب اُٹھ رہا تھا۔  
رات نہیں کسی روز روشن کا گمان ہوتا تھا۔ دیوار گیر محبسے روشنی اگل رہے تھے  
اور غوالی قانون چمک رہے تھے اور محرابی دروں میں گھاس کی چمکتی ہوئی ٹوکریاں



کئی صورتیں مل آئیں۔

انجم۔۔۔ حسن آراء۔۔۔ سعدیہ۔۔۔ فخر۔۔۔ اظہر اور کئی رشتہ دار باہر آ گئے۔

بہنیں طاہرہ کو دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئیں۔ جدائی کا صدمہ انہوں نے بھی تو جھیلنا تھا۔

ملن کی گھڑیوں کو آنسوؤں کا خراج ملنے لگا۔

چند ساعتوں میں تقریباً سارا خاندان برآمدے میں جمع ہو گیا۔ طاہرہ سر جھکائے کھڑے تھے۔ بار بار اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھ رہے تھے۔ عورتوں اور مردوں نے انہیں یوں گھیرے میں لے رکھا تھا جیسے بڑی تنگ و دو کے بعد کسی مفروز کو نرغے میں لے لیا گیا ہو۔

ناجی مرمیں ستون کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اس کے اور طاہرہ کے درمیان کئی افراد آ گئے تھے۔ ناجی کو اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں بھی کئی خشمکیں نکالیں اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ اپنے چاروں طرف اس نے ہمیشہ نرم و ملائم نظریں پائی تھیں۔ ان سینہ چیرنے والی نگاہوں سے وہ کانپ کانپ گئی۔

برآمدے میں اچھا خاصا شور ہو رہا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ شور مریض کے لیے ضرر رساں تھا۔

وقار احمد جلدی سے باہر آئے اور سب کو خاموشی سے کسی دوسری طرف پٹ جانے کی تلقین کی۔

قدم اٹھنے لگے۔

طاہرہ کھڑے رہے۔

”چلو بیٹے!“ کسی نے طاہرہ کا کندھا پکڑ کر کہا۔

”میں ابا حضور کو دیکھوں گا۔۔۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولے۔

”تم اکیلے آ جاؤ طاہرہ میاں“ وقار احمد نے انہیں بلایا۔ ”آپ لوگ سب یہاں سے اُن کے لیے۔“ بہت شور ہو رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہلکا سا شور بھی کتنا مضر ہے۔

طاہرہ نواب کلاہ میں داخل ہوئے۔ باپ کی مسہری کی طرف نگاہ گئی۔

اُف۔۔۔ وہ سرتاپا کانپ گئے۔ نواب فاروق کی جگہ ان کا بے رنگ و نور ڈھانچہ پڑا تھا۔ آنکھیں البتہ اب تک روشن تھیں۔ جیسے شمع انتظارِ جل رہی ہو۔۔۔ اس وقت ہوش میں تھے۔

طاہرہ بے تاب ہو گئے۔

وقار نے مضبوطی سے ان کا بازو تھام لیا۔ طاہرہ ان کے بازو کی گرفت میں طائرِ مجروح کی طرح پھڑپھڑانے لگی۔

”صبر۔۔۔ حوصلہ۔۔۔ جذباتی کمزوری کا مظاہرہ ان کے لیے مضر ہو گا“ وقار احمد نے سرگوشی کی۔ لیکن

ایسی صورتِ حال بھلا ان مشوروں کی تابع کیسے ہو سکتی تھی۔ طاہرہ کمان سے تیر کی طرح نکلے۔۔۔ فاروق نے بھی انہیں دیکھا۔

”ابا حضور!“۔۔۔ پٹی کے قریب قالین پر دو زانو ہوتے ہوئے انہوں نے اپنا سر باپ کے کندھے پر رکھ دیا۔

پھر

آنسوؤں کا ایسا طوفان پھوٹا جسے روک لینا کسی کے بس میں نہ تھا۔

”طا۔۔۔ ہر۔۔۔ طا۔۔۔ ہر“ خشک سسکتے لبوں پر یہ نام کئی دفعہ تھرک گیا۔

”ابا حضور۔۔۔“ طاہرہ نے ان کی طرف دیکھا۔ ”میرے۔۔۔ ابا۔۔۔!“ بے قرار ہو کر انہوں نے اپنا سر باپ کی چھاتی پر ٹکا دیا۔۔۔

”طا۔۔۔ ہر۔۔۔ میرے۔۔۔ بچے۔“ نحیف و ناتواں سی آواز ابھری۔۔۔ ”تم۔۔۔ یہ۔۔۔ تم۔۔۔ ہی۔۔۔ ہونا۔۔۔ تم۔۔۔ آ گئے۔۔۔“

مجھے معاف کر دیجئے ابا۔۔۔ حضور۔۔۔ اپنے گناہ مہر بننے کو معاف کر دیجئے۔۔۔ ”طاہرہ سسک رہے تھے۔

فاروق کا زرد اور کانپتا ہوا ہاتھ اٹھا۔۔۔ اور انہوں نے طاہرہ کو پوری قوت سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔



”گیا۔۔۔ حضور۔۔۔“

”میں۔۔۔ نے۔۔۔ تمہیں معاف کیا میرے بچے۔۔۔ دعا کرو۔۔۔ خدا  
مجھے۔۔۔ بھی معاف۔۔۔ کرے۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم۔۔۔ نے تمہیں۔۔۔  
ناسخ سزا دی۔۔۔ تمہی۔۔۔ نا۔۔۔ حق۔۔۔“

طاہر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ وقار احمد کی آنکھیں پُر نم تھیں۔۔۔

نواب فاروق شاید اس اپناٹک خوشی کا بار نہ سہا سکتے۔ ان کی سانس غیر ہموار ہو  
گئی۔ اور ہڈیوں کے اس کڑکڑاتے ڈھانچے پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

وقار احمد جلدی سے ان پر جھک گئے۔ گھٹنی بچائی۔ ساتھ والے کمرے سے ڈاکٹر  
پلک کر آئے۔ سب مسہری کے گرد ہو کر آلات کی مدد سے مریض کے سینے کا زیر و بم اور  
خون کا پلاؤ دیکھنے لگے۔

kashifnami.blogspot.com

(۱۶)

طاہر کے خواب گاہ میں جاتے ہی نابی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ زندگی کے حق و  
دق صحرا میں اکیلی رو گئی ہو۔ اس کے اور طاہر کے درمیان طوفان گرد و باد اٹھ رہے  
ہوں۔ اور وہ کسی حقیر سیکے کی طرح بے رحم ہواؤں کے تھپیر موں سے ادھر ادھر بھٹکتی پھر  
رہی ہو۔

خاندان کے بے شمار افراد طاہر کے جانے کے بعد اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔  
نیز کام اور قبر برساتی منظر اسے گھور رہی تھیں۔ اس کے بے پناہ ملکوتی صن سے  
محترف دل بھی شغرت و حقارت کے اظہار کے لیے چہچہاتی ہوئی نظروں کے تیر بر سار ہے  
تھے۔

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے یہ غیر مانوس چہرے دیکھ رہی تھی، اس کا رنگ سفید  
لباس ہی کی طرح تھا۔ بھیکے بھیکے ہونٹوں کی مضطرب سلوٹیں کانپ رہی تھیں۔ دل  
ریشما جا رہا تھا۔ ستون سے ملحق سبک سرخ کا جلی دار کپڑا نہ ہوتا تو یہ عینا ب جک وہ کر  
چکی ہوتی۔

”سیف“ اپناٹک جیسے رعد و باران کی کڑک سنائی دی۔ بڑی سیکم صاحبہ کسی غوغا  
شیرینی کی طرح خراقی ہوئی اس کی بات بڑھیں۔

”جی حضور“ سیف جلدی سے نابی کے سامنے آگیا۔

”یہ غالباً طاہر کی بیوی ہے“ چشمگیں چاہوں سے انہوں نے نابی کو سر جاپا گھورا۔

”جی۔۔۔ جی حضور۔۔۔“ سیف ان کے تیوروں سے ”ہم کر بولا۔

”یہ کیوں آئی یہاں۔۔۔“

سیف کے جواب دینے سے پہلے عقبی دروازے سے ڈاکٹر وہید محل آئے۔

”براہ مہربانی آپ سب لوگ کسی دوسری طرف چلے جائیے۔ شور ہو رہا“



ہے۔۔۔ مریض کے لیے خطرناک ہے۔۔۔ نواب صاحب کو آرام کی ضرورت ہے۔۔۔

”واقعی بہت شور ہو رہا ہے۔۔۔ ادھر چلئے۔۔۔ یہاں تو اونچی آواز میں بولنا تو درکنار، پاؤں کی آہٹ بھی ممنوع ہے۔۔۔“ بجوم میں سے کسی نے کہا۔

”چلئے۔۔۔ ادھر کو چلئے۔۔۔“ کئی آوازیں آئیں۔

انجم آرا نے بڑھ کر ماں کو کندھے سے بلایا۔۔۔ ”امی جان ابا حضور کی حالت آپ دیکھ چکی ہیں۔۔۔ آپ اپنے کمرے میں تشریف لے چلئے۔۔۔ آپ سب بھی یہاں سے ادھر ہی جائیے۔۔۔ استنا ہنگامہ۔۔۔ توبہ۔۔۔“

حسن بانو نے بھوکی شیرینی کی طرح ناجی کو دیکھا۔ اور پھر غصے میں چیخ و نلاب کھاتی پائیں۔۔۔ وہ بریز رہی تھیں۔ ان کے قدم اٹھاتے ہی مجمع منتشر ہو گیا۔ بہت سے لوگ ان کے پیچھے پیچھے دبے قدم اٹھاتے وہاں سے چل دیئے۔

پندرہ لمحوں بعد ناجی کے پاس صرف سیفو اور انجم آرا کھڑے تھے۔ طاہر جو کچھ کر چکے تھے، سزاوار صرف ناجی تو نہ تھی۔ انجم آرا مومن دل رکھتی تھیں۔ ناجی کی پیاری پیاری صورت اور بھولا بھالا انداز دل کی ساری کدورتیں ختم کر دینے کو کافی تھا۔ مگر والوں کے رویے سے انہیں سخت کوفت ہوئی تھی۔ اور پھر ناجی کی حالت دیکھ کر تو ان کا دل جذبہ حریم سے معمور ہو گیا تھا۔

وہ آگے بڑھیں اور کمال شفقت سے ناجی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرائیں۔

ناجی کیلئے یہ التفات غیر متوقع تھا۔ ”کیا نام ہے تمہارا“ انجم نے پیار سے پوچھا۔

”بتاؤ نا مٹی اپنا نام“ سیفو انجم آرا کے رویے سے بیحد خوش ہوا۔۔۔ ”آپ طاہر میاں کی بڑی بہن ہیں۔۔۔“

”میں تمہاری بڑی تہ ہوں۔ تم میری پیاری سی بھابی ہو۔“ انجم نے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے گلے سے لگایا۔

”بتاؤ نا اپنا نام“ انجم نے اسے اپنے سے جدا کرتے ہوئے پھر پوچھا۔

ناجی جیسے کوئی نواب دیکھ رہی تھی۔ مگر فکر انجم کو دیکھنے کے۔ واوہ منہ سے ایک لفظ نہ بولی۔

”کبھی کبھی جس۔۔۔“ سیفو نے ناجی کی ذہنی و جسمانی حالت کا جائزہ لیتے

ہوئے کہا۔ ”انجم مٹی انہیں کہیں آرام سے بٹھا دو۔۔۔“

واقعی۔۔۔ کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں گی۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔! انجم نے ناجی کا صندلی ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

”آؤ“

اور ناجی ان کے ساتھ یوں چل دی جیسے انجم آرا کوئی ایسی عامل ہوں جسے اپنے عمل کے زور سے معمول کو ہر راہ پر چلانا آتا ہو۔

انجم آرا اسے دانستہ زناہ حصے کی طرف لے کر نہیں گئیں۔ ماں کا مزاج مشعل تھا۔ ناجی کو دیکھ کر اور بھرک اٹھنے کا احتمال تھا۔ وہ ناجی کو طاہر کی خواب گاہ میں لے گئیں۔

”یہ تمہارے میاں کا کمرہ ہے“ انجم آرا نے پیار سے ناجی کا ہاتھ دبایا۔ ناجی ششدر سی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ اس کے حواس اب تک ٹھکانے پہ نہ آئے تھے۔

”میٹھ جاؤ۔“ انجم آرا نے اسے مسہری پر بٹھا دیا۔۔۔ ناجی آنکھیں پھاڑے کبھی انجم اور کبھی کمرے کو دیکھ رہی تھی۔

”لیٹ جاؤ“ انجم اس کے پاس میٹھ گئی۔۔۔ ”یہ طاہر کی خواب گاہ ہے۔ امی حضور نے طاہر کے جانے کے بعد بھی اس کی اسی طرح دیکھ بھال کروانی“ جس طرح ان کے جانے سے پہلے کرواتی تھیں۔۔۔“

انجم ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کا دل بھلانا چاہتی تھیں۔ لیکن ناجی کم سن مٹی تھی۔ تیز و ستد غظروں سے زخمی ذہن اب تک خوف زدہ تھا۔

”تمہیں باتیں نہیں آتیں؟“ انجم نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر پوچھا۔ ناجی غیر ارادی طور پر مسکرا دی۔۔۔ وہ انجم سے کچھ کچھ مانوس ہو گئی تھی۔۔۔

”نام بھی نہیں بتایا۔۔۔ کیا نام ہے؟“

”ناجی۔۔۔“

”شکر ہے تمہاری آواز تو سنی۔۔۔ ماشاء اللہ شکل و صورت کی طرح آواز بھی پیاری ہے۔“

ناجی پھر مسکرائی۔ ہونٹوں کے مضطرب سلوٹوں پر ابھرتا ہوا جھسم ناہی کے ملکوتی حسن میں اضافے کا باعث تھا۔ انجم کا بھی چہاں اسے اپنے سینے سے لگالیں۔



”لیٹ جاؤ۔ تھک گئی ہوگی تم تو۔۔۔“ انجم نے زبردستی ناجی کو مسہری پر لٹا دیا۔

انجم اس سے باتیں کرنے لگیں۔ اور ناجی سہمے سہمے لہجے میں ان کی باتوں کا جواب دینے لگی۔ انجم آرا کے مشفقانہ رویے کے باوجود اس کے حواس پر خوف چھایا ہوا تھا۔

”تم آرام سے لیٹی رہو۔۔۔ اب میں جاتی ہوں۔۔۔“

”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔“

”گھبراؤ نہیں۔۔۔ یہاں تم پورے اطمینان سے لیٹی رہو۔۔۔ میں اب حضور کو دیکھ آؤں۔۔۔“

”سیاں کہاں ہیں؟“

”سیاں؟“ انجم آرا نے حیران ہو کر ناجی کی طرف دیکھا۔ ناجی کچھ شرماسی گئی۔ اور انجم کو یہ جانتے میں قطعی دقت نہ ہوئی کہ اس کا استفسار ظاہر کے متعلق تھا۔

”ظاہر کو پوچھ رہی ہو؟“ مسکراتے ہوئے انجم بولیں۔

ناجی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

انجم اس کی سادگی پر مسکرا دیں۔

”اچھا تم آرام کرو۔۔۔ میں تمہارے سیاں کو یہیں بھیج دوں گی۔ وہ شاید

ابھی اب حضور کے کمرے ہی میں ہیں۔۔۔ اب حضور کی حالت تشویش ناک ہے۔ ناہی نہ کرو۔ اللہ ان پر اپنا رحم کرے۔۔۔“

اور انجم آرا ناجی سے باتوں میں مشغول تھیں۔

اور

اور

زمان خانے میں جیسے کوئی قیمت ٹوٹ پڑی تھی۔ نواب صاحب کی تشریف ناک حالت کو جیسے سبھی نے فرسوش کر دیا تھا۔ ناجی موضوع تھی اور ہر فرد اس کے خلاف زیرِ اکل رہا تھا۔ حسن بانوں کا غصہ آخری حدود کو چھو رہا تھا۔ سحر یہ آتش نہا تھیں۔۔۔ اور فوزیہ کے آئینہ چلتی ہر تیل کا کام کر رہے تھے۔

رشتہ دار حسن بانو کا اعتماد جیتنے اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر

ناجی کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔

”چڑیل کہیں کی۔ ہمارے سینے پر مونگ دلنے یہاں آپہنچی ہے۔“

”دیدہ دلیری دیکھو۔ یہاں آنے کی جرأت کیسے کر لی۔“

”آنکھ میں ڈر خوف تو تھا ہی نہیں۔“

”تکر ٹکر دیکھے جارہی تھی۔ استنانہ ہو سکا میٹم صاحبہ کے پاؤں پر کر معافی ہی مانگ لیتی۔“

”گنوارن۔۔۔ دیہاتن۔۔۔ یہ آداب کون سکھاتا ہے۔“

حسن بانو کے گردا گرد خاندان کی عورتوں کا جگمگا تھا۔ حسن بانو کا غصہ ٹھنڈا

کرنے کے بجائے زیادہ ہمدرد بننے کی کوشش میں انہیں اور اشتعال دلا رہی تھیں۔

سحر یہ اور فوزیہ تو اسے ذلیل کرنے کے لیے خود ذلالت پر اتر آئی تھیں۔ ”نام

سن سن کر ہی دل جل رہا تھا۔ اب ڈائن گھر میں بھی آپہنچی ہے۔“ سحر یہ ٹسوے

بہانے لگی۔ فوزیہ پہلے ہی آنسو بہا رہی تھی۔ دونوں بھانجیوں کو روتے دیکھ کر حسن بانو

کے ابال کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔

”میرے تو سینے میں لوہے کی میچ کی طرح چبھی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر نہ آجائے تو اسی

وقت کھسیٹ کر پھانک سے باہر کر آتی۔۔۔“

”ایک دفعہ اُس نے یہاں قدم جمالیے تو پھر کوئی حیلہ کار گر نہ ہو گا“ سحر یہ شکی

لہجے میں بولی۔

”قدم جمانے کون دے گا۔۔۔ میرا نام حسن بانو نہ ہوا۔۔۔ جو یہاں ٹکٹے

دیا۔۔۔“

”لیکن ظاہر۔۔۔؟“

”ظاہر نے کوئی چوں چراں کی تو اس گھر کے دروازے اس پر پھر بند ہو سکتے

ہیں۔“

”امی حضور۔۔۔“ انجم آرا چند لمحے پہلے یہاں آئی تھیں۔ کمرے کی مسموم فضا

دیکھ کر وہ ٹھٹک گئیں۔

حسن بانو نے گردن گھما کر پیچھے کھڑی انجم آرا کو دیکھا۔

انجم ماں کے دائیں ہاتھ بیٹھتے ہوئے بولیں۔۔۔ ”امی حضور۔۔۔ آپ ظاہر



کو پھر ہاتھوں سے گنوا نا چاہتی ہیں۔ شکر کا مقام ہے خدا نے جیتے جی بیٹے کو ملا دیا۔۔۔  
ظاہر آگئے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ اور خوشی کو نسی ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔  
”لیکن ساتھ وہ چڑیل بھی آگئی ہے نا؟“

”وہ ظاہر کی سیوی ہے امی حضور۔۔۔ جہاں ظاہریوں کے وہیں وہ بھی ہوگی۔“  
”تو گویا آپ پر بھی جادو چل گیا ہے ساحرہ کا؟“ بڑے ہی طنز انداز میں سعدیہ نے کہا۔

”جادو کیا؟“ انجم نے سعدیہ کے طنز کو منظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”بڑی طرف داری کر رہی میں نا اس چڑیل کی۔“ سعدیہ غصے سے برس پڑی۔  
”ہماری پے در پے بے عزتی ہو رہی ہے۔۔۔ لڑکی کو گھر بیٹھے داغ لگ گیا۔  
رُسوائی ہو ہوئی الگ۔ اس پر طرہ یہ کہ اب یہ آوارہ لڑکی ہمارے ساتھ رہے گی۔۔۔ ہماری  
برابری کرے گی۔۔۔۔۔“

”سعدیہ بیٹی“ حسن بانو اس کے سر پر پیلا سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں ”اس  
گھر میں تمہاری برابری تو کیا۔۔۔ نوکرانی بن کر بھی نہ رہنے دوں گی اسے۔۔۔  
غضب خدا کا۔۔۔ کچے کی چھو کری نے سارے خاندان کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس کی  
یہ مجال کہ ہماری برابری کرے۔ آنکھیں نہ پھوڑ دوں گی اس کی۔“ انجم آرا نے بیچ پھاڑی  
بہتیری کو شش کی۔ لیکن ایک اکیلی کہاں تک مقابلہ کرتیں۔ سعدیہ کی پشت پناہی  
حسن بانو کر رہی تھیں اور حسن بانو کے اشارہ پر وہ پورا خاندان مانع سکتا تھا۔

ناجی مسہری پر لیٹی آج کے واقعات پر غور کر رہی تھی۔ انجم آرا کا تعلق نہ ملتا  
تو اس غیر مانوس ماحول میں اس کا دم آج ہی گھٹ جاتا۔

انجم آرا اس کا کھانا بھی اس کمرے میں لے آتی تھیں۔ اس کے خلاف جو زہر اٹھا  
جا رہا تھا وہ اسے اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھیں۔  
کھانا کھلا کر اسے سو جانے کی تلقین کرتے ہوئے انجم چلی گئی تھیں۔ لیکن ناجی  
سو نہ سکی۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔ دماغ تب رہا تھا۔ آج شام سے رات کے  
مختصر وقفے میں کتنے غیر متوقع واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے۔ یہ غیر متوقع واقعے اس کی  
طبع پر بُری طرح اثر انداز ہوئے تھے۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ یہاں سے دور۔۔۔  
بہت دور چلے جانا چاہتی تھی۔ سیاں کی سنگت میں۔۔۔ اپنی پُر سکون دنیا میں۔۔۔  
جہاں محبت کی نرم و نازک رُو پہلی کرنوں کے جال تھے۔ جہاں عشق کی حرارت سے ہر  
غیر مانوس جذبہ پکھل جاتا تھا۔

اور

جہاں پیار کی نغمگی سے موسیقی وجہ میں ڈھل جاتی تھی۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات بیک گئی تھی۔

لیکن

سیاں ابھی تک نہیں آئے تھے۔ وہ کب آئیں گے؟ انتظار کا اک اک لمحہ سوہاں  
روح تھا۔

وہ کافی دیر تک کمرے میں بے قرار روح کی طرح بھرتی رہی۔ سیاں نہ آئے۔



وہ تھک گئی۔

ہار کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی کمر کچے پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی، بستر پر پڑی وہ بے ہنگم طریق سے آج کے واقعات کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ سوچتی رہی۔

اور

اس کا الجھا ہوا ذہن اور تھکا ہوا جسم ماؤف سا ہوتا گیا۔

پھر

جانے کب نیند کی پریوں نے لوریاں دے دے کر اسے تھپکا اور وہ گہری نیند سو گئی۔

اور

کافی رات گئے جب خواب فاروق علی خاں کی حالت کچھ سنبھلی اور دواؤں کے اثر سے وہ کچھ اونگھ گئے۔ تو طاہر کو ناجی کا خیال آیا۔

وہ خواب گاہ سے باہر نکلے۔ اتفاق ہی تھا جو برآمدے میں انجم آرام مل گئیں۔

”ناجی کہاں ہے۔۔۔؟“ طاہر نے ان سے پوچھا۔

”تمہاری خواب گاہ میں“ انجم وحیرے سے مسکرا دیں۔

”وہاں؟“

”ہاں ہاں۔۔۔ میں ہی انہیں لے گئی تھی۔ آرام سے لٹا دیا تھا۔ کچھ غیہ مانوس سامنا حوال تھا نا ان کے لیے۔۔۔ گہرا گئی تھیں۔“

طاہر کچھ بے قرار سے منظر آئے۔۔۔ انجم بھانپ گئیں۔ ”فکر نہ کرو۔ اب سو رہی ہیں۔ میں ابھی ابھی دیکھ کر آئی ہوں۔“

طاہر کو کچھ تسلی ہوئی۔

دونوں بہن بھائی کچھ دیر اپنی کہتے اور دوسرے کی سنتے رہے۔

”ای مشور نے ناجی کو دیکھا۔۔۔؟“ باتوں ہی باتوں میں طاہر نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“ انجم جلدی سے بولیں۔

”کیا خیال ہے ان کا؟“

”سنا ہے وہ اس کے خلاف اب بھی۔۔۔؟“

”یہ سب وقتی باتیں ہیں طاہر۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم جانتے ہو ان کی بھانجی تم سے منسوب تھی۔ اس نسبت کے ٹوٹنے کا انہیں کتنا غم ہے۔۔۔ اس غم کا اظہار اگر وہ غصہ کی صورت میں کریں بھی تو خاموشی ہی میں مصلحت ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ ناجی کی پیاری پیاری معصوم صورت دیکھ کر ان کے سینے کا پتھر خود بخود پکھل جائے گا۔“

طاہر عقیدت سے سر جھکائے بہن کی باتیں سن رہے تھے۔

”ناجی کی صورت اور سیرت بہت جلد اسے اس کا اصل مقام دلا دیگی طاہر۔۔۔“

طاہر نے فخر سے سر اٹھایا۔ اور مسکرا کر بہن کی طرف دیکھا۔۔۔ ”آپ کو پسند

آئی ناجی۔۔۔؟“

”تمہارے انتخاب کی داد نہیں دی جا سکتی“ انجم آرا نے پیار کی شدت سے مغلوب ہو کر طاہر کے سر پر بوسہ دیا۔ یہ ان کے انتخاب کی کھلی داد تھی۔

طاہر کے دل میں گھر والوں کی طرف سے جو وسوسہ تھا وہ انجم آرا کی باتوں اور رویے سے کسی حد تک ٹوٹ گیا۔

بہن سے الگ ہو کر وہ اپنی خواب گاہ میں گئے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی کئی

مانوس یادیں ذہن میں اُمنڈ آئیں۔ اتنی مدت بعد اپنے کمرے میں داخل ہو کر وہ کچھ عجیب سی کی کفیات سے دوچار تھے۔

چند لمحے وہ ساکت سے کھڑے رہے۔

ناجی نے ہلکی سی ہائے کے ساتھ کروٹ بدلی۔ طاہر کا انہماک ٹوٹ گیا۔ جلدی سے مسہری کی طرف بڑھے۔ ناجی پر جھک گئے۔

ناجی کروٹ بدل کر سو گئی تھی۔ نرم نرم ٹکیوں پر ناجی کے سیاہ بال بکھرے تھے۔ طاہر نے جھک کر ان بالوں کو چھوا۔ لیکن ناجی کو جگایا نہیں۔ وہ جاتے تھے

اسے پُر سکون نیند کی کتنی ضرورت ہے۔

وہ اسے بغور دیکھتے رہے۔ اک گہرے سکون اور اطمینان کا احساس ان کے رگ و

پے میں مسرت کی ہلکی ہلکی لہریں دوڑا رہا تھا۔ آج ناجی کو اس کا اصلی مقام مل گیا تھا۔

وہ انہماک میں بہو بن کر آگئی تھی۔



ظاہر گھر میں سلگنے والی فضا سے قطعاً بے خبر تھے۔ انجم آرا کی باتوں سے وہ پہلے ہی مطمئن ہو گئے تھے۔ اس پر ناجی کو اس طرح اپنی خواب گاہ میں محو خواب پایا تو انہوں نے طمانیت کا گہرا سانس لیا۔ اس سانس کی گہرائی میں جذباتِ تشکر بھی تھے۔ ناجی کو اپنا لے کی حقیقی خوشی کا احساس انہیں آج پوری طرح ہوا۔

چند لمحے رکنے کے بعد ظاہر پھر نواب فاروق کی خواب گاہ میں لوٹ آئے۔ ان کی آمد نے نواب فاروق کی زندگی کی گرتی دیوار کو عارضی سہارا دے دیا تھا۔ اس رات وہ کافی دیر تک ہوش و حواس میں رہے تھے۔ ظاہر کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا تھا۔ مدتوں درشن کی پیاسی آنکھیں ہمیشہ کو بند ہو جانے سے پہلے پوری پوری طرح سیراب ہونا چاہتی تھیں۔

ظاہر کے دل میں جدائی کی کسک تھی۔ وہ ملن کے ان لمحوں سے آسودگی پارہے تھے۔ باپ کی ہٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ چند لمحوں کے لیے انہیں غنودگی آئی تو ناجی کو جا کر دیکھ لیا۔ پھر وہیں آکر بیٹھ گئے۔ باپ کی شفقتوں کے سمٹے دامن آج پوری وسعتیں لیے لہرا رہے تھے۔ ظاہر ان دامنوں تلے قلبی سکون پارہے تھے۔

سحر ہو چکی تھی۔ ظاہر پانگ کی ہٹی پر سر رکھے قالین پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے تھے۔ دوسرے دونوں بھائی اور رشتہ کے کئی بزرگ کمرے میں باری باری آتے جاتے رہے تھے۔ لیکن ظاہر نے باپ کی ہٹی نہیں چھوڑی تھی۔

بالوں میں اچھکیوں کا لمس محسوس کرتے ہی ظاہر کی آنکھ کھل گئی۔۔۔ جلدی سے سر اٹھایا۔ آدھ کھلی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

وہ جاگ رہے تھے اور ان کی بے نور سی آنکھوں کے گوشے بھیج رہے تھے۔ ظاہر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھے۔ کمرے میں ہلکی ہلکی برقی روشنی درختوں سے آنے والی صبح کے ملگے اُجالوں میں اُلجھ رہی تھی۔ پچھلی پچھلی بے نور سی روشنی میں نواب فاروق کا چہرہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے موت کے ہاتھ نے اس سے رنگ خاکے میں زردی کی آخری تہہ بھی بھر دی ہو۔

گہرا کر ظاہر نے باپ کی طرف دیکھا۔

”ابا۔۔۔ حضور۔۔۔“ وہ دھیرے سے پکارے۔

فاروق ہوش میں تھے۔ نیچے پر رکنے رکھے سر ظاہر کی طرف موڑ کر انہیں دیکھ کر دیکھا۔ ان کی کانپتی آنکھوں کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی۔ ظاہر نے ان کا ہاتھ اپنے

ہاتھوں میں تھام لیا اور پریشان نظروں سے باپ کو دیکھنے لگے۔

”طا۔۔۔ ہر۔۔۔ آواز میں اتنی بھائی نقابست تھی۔

”جی“

”تمہاری۔۔۔ دلہن کہاں۔۔۔ ہے۔۔۔ انہیں۔۔۔ ساتھ نہیں۔۔۔ لائے۔۔۔ تھے۔۔۔؟“

”ہم نے اپنی۔۔۔ بہو کو۔۔۔ نہیں۔۔۔ دیکھا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ کہاں۔۔۔ ہے۔۔۔؟“

رکتے رکتے الفاظ میں نواب فاروق نے ناجی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

”وہ میرے ساتھ ہی آئی تھیں ابا حضور۔۔۔“ ظاہر نے باپ کے ہاتھ پر سر رکھ دیا۔

”انہیں یہاں۔۔۔ لاؤ۔۔۔ ہم۔۔۔ دیکھنا۔۔۔ چاہتے۔۔۔ ہیں۔۔۔“

”ابا حضور۔۔۔“ ظاہر کا دل شدتِ جذبات سے بھر آیا۔ ”آپ۔۔۔ آپ نے ہمیں معاف کر دیا۔۔۔ ابا۔۔۔ حضور۔۔۔“

فرطِ عقیدت سے ظاہر نے باپ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

”انہیں۔۔۔ یہاں لاؤ۔۔۔!“

”اس وقت۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ پھر۔۔۔ شاید۔۔۔ ان آنکھوں۔۔۔ میں۔۔۔ روشنی۔۔۔ نہ۔۔۔ رہے۔۔۔“

”ابا حضور۔۔۔“ ظاہر یہ قرار ہو گئے۔ ان کی آواز رقت سے رندہ گئی۔

”جاؤ ظاہر۔۔۔ انہیں لے آؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ بیٹے۔“ باپ کے لہجے کی

ملاو سی سے ظاہر سڑپ گئے۔ ڈوبتے دل سے باپ کو دیکھا۔ انہوں نے پھر ناجی کو دیکھنے کا اصرار کیا۔ ظاہر نگین و افسردہ وہاں سے اٹھے اور اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیئے۔

ناجی صبح سویرے اٹھنے کی عادی تھی۔ ظاہر خواب گاہ میں داخل ہوئے تو وہ مشرقی دروازے کھولے کھڑی تھی۔

”تمہیں ابا حضور بلا رہے ہیں ناجی۔ ان کی حالت ابھی نہیں۔ آؤ۔۔۔ ان کے پاس چلو۔۔۔“



”میں۔۔۔ میں چلوں۔“ ناجی نے انہیں بے یقینی سے دیکھا۔۔۔ اور بادل  
تھوڑے ان کے ساتھ چل دی۔ نواب صاحب سے بچپن ہی سے خوف کھاتی چلی آئی تھی۔  
اس پر جو حالات روپڑہ ہو چکے تھے، وہ ڈرنے میں حق بجانب ہی تو تھی۔  
دونوں خواب کما میں اکٹھے داخل ہوئے۔ نواب فاروق کی منتظر نظریں ادھری  
کو تھیں۔ ظاہر نے ناجی کا ہاتھ تھام کر اسے مسہری کے قریب کر دیا۔  
ناجی اپنے آپ کو سمیٹتی شرماتی۔۔۔ اور خائف زدہ سی مسہری کے قریب  
جھک گئی۔ بڑے مؤدبانہ لیکن سہمے ہوئے طریق سے سلام کیا۔  
ناتواں سالر زتا ہوا ہاتھ اٹھا اور ناجی کے سر پر ٹک گیا۔ اور زندگی کی روشنی سے لحو  
پہ لحو دور ہوتی آنکھیں دھندلا گئیں۔

عین اسی وقت حسن بانو خواب کما میں آئیں۔ یہ منظر دیکھ کر آگ بگولا ہو  
گئیں۔ ظاہر کی پشت تھی۔ انہوں نے ماں کے چہرے پر عتاب کے طوفان نہیں  
دیکھے تھے۔ وہ گرجنے کو تھیں کہ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے وقار بھائی نے بڑھ کر انہیں  
بازو سے تھام لیا۔ اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دوسرے کمرے میں لے گئے۔  
وقار نے انہیں حالات کی نزاکت اور موقع کی غنیمت سمجھا کر چپ رہنے کی تلقین  
کی اور سمجھا بھگا کر خواب کما میں لائے۔

ناجی مسہری کی پٹی پر جھکی بیٹھی تھی۔ فاروق دھیرے دھیرے کہہ رہے  
تھے۔۔۔ ”دعا کرو۔۔۔ بیٹی۔۔۔ خدا ہمیں۔۔۔ ہمارے کئے کی۔۔۔ معافی  
دے۔۔۔ ہم نے۔۔۔ تم۔۔۔ سے۔۔۔ بڑی۔۔۔ زیادتی۔۔۔“

نواب فاروق اعتراف جرم کر کے اپنی رُوح کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔  
انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بہت بڑا بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہو۔۔۔ اور اب  
عاقبت کا راستہ وہ بغیر کسی تردد کے طے کر سکتے ہوں۔  
ناجی رو رہی تھی۔ ظاہر کی آنکھیں بھی منٹناک تھیں۔  
حسن بانو کا دل اس منظر سے بھی نہیں پسپا۔ انتقامی جذبات طوفان اٹھا رہے

تھے۔ دل میں بیچ و مناب کھا رہی تھیں لیکن ظاہر داری کو چپ ہونا پڑا۔ کوئی ہلکا  
نواب فاروق کی زندگی کا جھلکا ہوا چہرہ اک لمحے میں کل کر سکتا تھا۔

حسن بانو مسہری کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ شوہر کو دیکھ کر غمزدہ بھی تو  
تھیں۔ عمر بھر کی رفاقت کتنی سرعت سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔  
”حسن بانو۔۔۔“ انتہائی نحیف آواز میں نواب فاروق بولے۔ حسن بانو آگے  
جھک گئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔  
”بہو۔۔۔ دیکھی۔۔۔ تم نے۔۔۔“ اسی لہجے میں فاروق بولے۔  
طوفان سینے کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا لیکن مصلحت اس طوفان کو روک لینے میں  
تھی۔

دل پر پتھر رکھ کر بولیں ”آپ کو پسند ہوئی تو ہمیں پسند ہی پسند ہے۔“ نواب  
فاروق کے چہرے پر مسرت کے آثار نظر آئے۔ اور ماں کے منہ سے یہ کلمے سن کر ظاہر  
کے سینے میں مسرت و انبساط کی لہریں سے اٹھنے لگیں۔ سارے وسوسے مٹ گئے۔  
جذبات عقیدت سے ان کا دل لبریز ہو گیا۔ جی چاہا ماں کے قدموں پر سر رکھ دیں۔  
پھر

نواب فاروق نے وصیت کی کہ ظاہر کے حصہ کے سارے زیورات ناجی کو دے  
دیے جائیں۔ ان کا حق وراثت بھی بحال کر دیا اور انہیں پورے پورے حقوق کے  
ساتھ الحرام میں رہنے کی اجازت بھی دے دی۔



نواب فاروق کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ طاہر باپ کی پٹی سے لگے تھے۔ دن بھر میں بمشکل چند گھنٹیاں ناجی کو دیکھنے کے لیے آتے۔ وہ گھر والوں کی طرف سے مطمئن تھے۔ ناجی سے کچھ پوچھتے بھی نہیں تھے۔ ناجی بھی کچھ کہہ نہ سکتی۔

تین دن تین صدیاں تھیں جو گزرنے ہی میں نہ آتی تھیں۔ ناجی نے یہ تین دن سیاہی سے الگ گزارے تھے۔ وہ دن اور رات کے تنہا لمحوں میں کٹی باروچکی تھی۔ اپنے آزاد ماحول میں لوٹ جانے کے لیے زخمی پرندے کی طرح پھر پھرتی تھی۔

لیکن

ایسا ممکن کہاں تھا۔ نواب فاروق کی حالت خطرناک حد کو پہنچ رہی تھی۔ اور ان کی حالت سے سب سے زیادہ متاثر طاہر ہی تھے۔ دس ماہ کی طویل جدائی اس تاثر کی سب سے بڑی وجہ تھی۔

اس رات نواب صاحب کی حالت مخدوش تھی۔ الحرمین عیادت کو آنے والوں کا جھوم تھا۔ زنانہ مردانہ دونوں حصے مہمانوں سے بھرے تھے۔ یہ وقت ناجی کے لیے سخت ترین تھا۔ طاہر سارا دن اس کے پاس نہ آ سکے تھے۔ معذہ اور فوزیہ کی استقامی جس نے تو جیسے آج انتقام کی قسم کھالی تھی۔ سب لوگوں کے سامنے کس کس طرح اسے ذلیل کیا گیا۔ ناجی غریب خون کے آنسو روتی رہی۔ انجم آ رہا پاپ کی حالت سے متشکر تھیں۔ ناجی کو صرف انہی کا التفات نصیب تھا۔ آج دن بھر ان کی صورت بھی دیکھ نہ سکی۔

حسن بانو تو انہی پریشانی ناجی پر قبر برسا کر مٹا رہی تھیں۔ ایک رشتہ دار عورت کے استفسار پر کہ ”یہ طاہر کی بیوی ہے“ حسن بانو یوں شعلہ فشاں ہوئیں۔

”یہی ہے ڈائن جس نے میرا بیٹا ہتھیار میری کوکھ پر وار کیا۔ اور اب پڑھیل میرے سہاگ کا چراغ بھی کھل کرنے کو آ پہنچی ہے۔۔۔“

بڑی بھابی درمیان میں نہ آجائیں تو بعید نہ تھا حسن بانو ناجی کو چٹیا گھسیٹ کر گھر سے باہر کر دیتیں۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ ناجی طاہر کی خواب گاہ کے بیرونی برآمدے میں ستون سے ٹیک لٹائے کھڑی تھی۔ روتے ہوئے اس کا بُرا حال تھا۔ دن بھر طنز و تمسخر کے

لیکن

نواب فاروق کا التفات ناجی کے حق میں سودمند ہونے کے بجائے زہرناک ثابت ہوا۔ اس کی راہوں میں کاٹے ہی کاٹے بکھر گئے۔

لب مرگ نواب فاروق نے عاقبت سنوارنے کے لیے بیٹے کی خطا بخشی کر دی تھی۔ بہو کو دلمان شفقت تلے لے لیا تھا لیکن گھر کے دوسرے افراد کے دل سے کینہ نہ مٹ سکا۔ نواب فاروق کی دی ہوئی مراعات نے اس کینے کو خوفناک بنا دیا۔ ناجی گھر والوں کے سینے پر لومٹا ہوا سانپ تھی۔

حسن بانو تو اسے ایک منظر نہ دیکھ سکتی تھیں۔ سعدیہ اسے کچا چبا جانے کی فکر میں تھی۔ اور فوزیہ۔۔۔ فوزیہ کا بس چلتا تو اس کا گلا کھونٹ دینے میں بھی دریغ نہ کرتی۔ اس کی کنواری محبت کے سینے میں چبھا ہوا فشتہ تھی ناجی۔ طاہر اس کے منسوب تھے اور دل ہی دل میں فوزیہ نے اس منسوب کو محبوب مان لیا تھا۔

ناجی کو ذلیل کرنے، گنوار اور بد تمیز ثابت کر کے رسوا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اس کا تمسخر اڑایا گیا۔ دیہاتن اس کا جیسے نام ہی منتخب ہو گیا تھا۔

یہ سب شہ پسند طبیعتوں اور لہجہ بغض کی پیداوار تھی۔ ورنہ ناجی تو طاہر کی قربت میں بہت کچھ سیکھ چکی تھی۔ شادی کے بعد ایک ہلے ہوئے طرز زندگی سے وہ تہذیب یافتہ اور مہذب طبقے کے بہت کچھ عادات و اطوار اپنا چکی تھی لیکن اہل خانہ کو اسے ذلیل کرنا مقصود تھا۔

ناجی کی حالت اس پرندے کی سی تھی جسے کھلی فضاؤں سے زیر دستی پکڑ کر سونے چاندی کی سلاخوں والے پتھر سے میں قید کر دیا گیا ہو۔ سوال صرف قیدی کا ہونا بات اور تھی۔ یہاں تو فتنی کپڑے کے جان لیوا تھے۔ غریب ناجی کے تو وہم و گمان تھے۔



تیروں نے اس کا سینہ چھلنی کیا تھا۔ سبھی سبھی سی کھڑی اپنی زندگی کے اس غیر متوقع حادثے پر غور کر رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر چند یوم اور اُسے اسی ماحول میں گھٹ گھٹ کر جینا پڑا تو یقیناً اس کی کستی حیات موت کے بھنوروں میں کھوجانے کی۔ اُسے کھڑے چند لمحے گزرے تھے کہ قدموں کی آہٹ ہوئی۔ ”سیاں“ ناجی کی روح جھک گئی۔

لیکن پلٹ کر دیکھا تو دم بخود رہ گئی۔ سیاں نہیں فوزیہ ادھر آ رہی تھی۔ ناجی کھبرا گئی۔ فوزیہ سے سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ سارا وجود سمیٹ کر اس نے ستون کی اوٹ میں ہو جانا چاہا۔

لیکن فوزیہ آگے بڑھنے کی بجائے وہیں رک گئی۔ ”ظاہر کا انتظار ہو رہا تھا؟“ وہ اس کے عین سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ناجی کا دل بے طرح دھک دھک کرنے لگا۔ چہرہ خوف و ہراس سے سیدھ ہو گیا۔ فوزیہ نے سر تاپا اُسے یوں دیکھا جیسے قصاب پچھڑا ذبح کرنے سے پہلے اُسے دیکھتا پرکھتا ہے۔

ناجی کے سارے وجود میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ آج فوزیہ کی آنکھوں میں ہلکا سا خوفانہ تھلک آگئی تھی۔ اک کھولن تھی۔ ناجی سر تاپا کانپ گئی۔ پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھتی رہی۔

”فوزیہ نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہ کی۔ ناجی بے ہوش ہو گئی۔ قدرت کو شاید ناجی کی زندگی مقصود تھی۔ اتفاق ہی سے انجم آرا ادھر سے گزریس۔ کسی کو یوں سڑک پر پڑے دیکھ کر وہ پہلے ڈر گئیں۔ لیکن جب برقی روشنی میں قریب سے دیکھا تو ناجی کو یوں پڑے دیکھ کر بے حد کھبرا گئیں۔

”ناجی“ اس پر جھک کر بیٹابی سے پکارا۔ لیکن ہلانے بھلانے پر انہیں اس کی بے ہوشی کا علم ہوا۔ پریشان ہو کر اس پر جھک گئیں۔ کندھا ہلا کر اسے ہوش و حواس میں لانا چاہا۔ لیکن وہ تو کبھی غنودگی میں ڈوبی تھی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے اور رنگت خوفناک طور پر زرد ہو گئی تھی۔

بھاگ کر وہ گئیں اور دو تین کنیزوں کو ساتھ لے آئیں۔ ناجی کو مل کر سب خواب گاہ میں لے گئیں۔

ڈاکٹر جنید نواب فاروق کے کمرے میں تھے۔ انجم نے جلدی سے انہیں بلا بھیجا۔ ناجی کے بے ہوشی کی خبر ظاہر کے حواس پر بجلی کی طرح گری۔ ڈاکٹر جنید سے پہلے ہی وہ تیر کی سی تیزی سے بھاگے۔۔۔ خواب گاہ میں کھبرا گئے ہوئے داخل ہوئے

ناجی کے سارے وجود میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ آج فوزیہ کی آنکھوں میں ہلکا سا خوفانہ تھلک آگئی تھی۔ اک کھولن تھی۔ ناجی سر تاپا کانپ گئی۔ پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھتی رہی۔

”فوزیہ نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہ کی۔ ناجی بے ہوش ہو گئی۔ قدرت کو شاید ناجی کی زندگی مقصود تھی۔ اتفاق ہی سے انجم آرا ادھر سے گزریس۔ کسی کو یوں سڑک پر پڑے دیکھ کر وہ پہلے ڈر گئیں۔ لیکن جب برقی روشنی میں قریب سے دیکھا تو ناجی کو یوں پڑے دیکھ کر بے حد کھبرا گئیں۔

”ناجی“ اس پر جھک کر بیٹابی سے پکارا۔ لیکن ہلانے بھلانے پر انہیں اس کی بے ہوشی کا علم ہوا۔ پریشان ہو کر اس پر جھک گئیں۔ کندھا ہلا کر اسے ہوش و حواس میں لانا چاہا۔ لیکن وہ تو کبھی غنودگی میں ڈوبی تھی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے اور رنگت خوفناک طور پر زرد ہو گئی تھی۔

بھاگ کر وہ گئیں اور دو تین کنیزوں کو ساتھ لے آئیں۔ ناجی کو مل کر سب خواب گاہ میں لے گئیں۔

ڈاکٹر جنید نواب فاروق کے کمرے میں تھے۔ انجم نے جلدی سے انہیں بلا بھیجا۔ ناجی کے بے ہوشی کی خبر ظاہر کے حواس پر بجلی کی طرح گری۔ ڈاکٹر جنید سے پہلے ہی وہ تیر کی سی تیزی سے بھاگے۔۔۔ خواب گاہ میں کھبرا گئے ہوئے داخل ہوئے

ڈاکٹر جنید نواب فاروق کے کمرے میں تھے۔ انجم نے جلدی سے انہیں بلا بھیجا۔ ناجی کے بے ہوشی کی خبر ظاہر کے حواس پر بجلی کی طرح گری۔ ڈاکٹر جنید سے پہلے ہی وہ تیر کی سی تیزی سے بھاگے۔۔۔ خواب گاہ میں کھبرا گئے ہوئے داخل ہوئے



اور لپک کر ناجی پر جھک گئے۔

”کیا ہوا؟“ وہ سراسیمگی کے عالم میں انجم سے پوچھنے لگے۔

”اللہ جانے۔۔۔ میں ادھر سے گزری تو زمین پر بے ہوش پڑے پایا۔“ انجم بھی حواس ہاتھ سے تھیں۔

”شاید زینے سے پاؤں پھسل گیا ہے“ ایک کنیز ناجی کے پاؤں سہلاتے ہوئے بولی۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ دوسری نے تائید کی۔

”ہو سکتا ہے۔۔۔“ انجم نے کہا۔

ظاہر کی میتابی و بے قراری دید کے قابل تھی۔ کبھی اس کے کندھے ہلاتے۔ کبھی جھک کر پکارتے۔ کبھی چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر مایوسی سے آواز دیتے۔

”گھبراؤ نہیں ظاہر۔۔۔“ انجم آرا ان کی ٹوپ سے متاثر تھیں۔

ڈاکٹر جنید آگیا۔ مختلف آلات کی مدد سے اس نے ناجی کا معائنہ کیا۔ اسے ہوش میں لانے کی سعی کرتا رہا۔

رات گئے ناجی کو ہوش آیا۔ لیکن ہوش میں آتے ہی وہ مابئی بے آب کی طما ٹوپنے لگی۔

ڈاکٹر جنید نے لیڈی ڈاکٹر کو بلانے کی رائے دی۔ کچھ ہی دیر بعد لیڈی ڈاکٹر نرس کے آگئیں۔

اور

وہ رات

وہ رات کسی قیدت سے کم نہ تھی۔ ایک طرف فاروق کی زندگی کا چرنا غم تھا۔ دوسری طرف ناجی دروازہ سے ٹوپ رہی تھی۔ کبھی باپ کی مٹی پر جھکے ہیں۔ کبھی ناجی کے لیے برآمدے میں دو دروازے پر بیٹھا۔ گھر والوں کو ناجی سے کیا واسطہ تھا۔ اور کچھ موقع ہی ایسا تھا۔ بے فاروق کی خواب گاہ کے ارد گرد وہ وادہ وار منڈلا رہے تھے۔ ایک انجم تھی جو کبھی باپ کی حالت دیکھ کر آنسو بہا رہی تھیں۔ کبھی ناجی کی۔۔۔ اور کبھی غم ظاہر کو دلایا بھی تو وہ

دے رہی تھیں۔

طوفانی رات کا سلسلہ ابد سے ملا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اک اک لمحہ ٹھنک ٹھنک کر گزر رہا تھا۔ سحر ہونے ہی میں نہ آ رہی تھی۔ فاروق موت اور حیات کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ موت حیات کا رنگ چوس رہی تھی۔ فاروق کا خاکہ لمحہ بہ لمحہ بے رنگ ہوا جا رہا تھا۔

پچھلے پہر لیڈی ڈاکٹر نے مایوسی کا اظہار کر دیا۔ ناجی کو فوری طور پر ہسپتال پہنچانے کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر کی رائے پر اسی وقت عمل کیا گیا۔ انجم اور ظاہر دو ایک کنیزوں کو ساتھ لے کر ناجی کو ہسپتال لے آئے۔

بقیہ رات اضطراب میں گزری۔ ظاہر و انجم کو کچھ دیر بعد ہی واپس گھر لوٹنا پڑا۔ نواب کی حالت کے بارے میں انہیں فون کیا گیا تھا۔

صبح بیدار ہوئی۔ الحما کے لیے یہ اک خونی صبح تھی۔ شب بیدار سرخ آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کی سر توڑ کوششیں مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب کھنیں۔ نواب فاروق عالم نزع میں تھے۔ ڈاکٹروں نے سب آلات ہٹا لیے۔ عزیزوں کو قریب آنے کی اجازت دے دی۔

ہسپتال میں ناجی کی حالت خطرے میں تھی۔ وہ زندگی کی بازی ہاکر اک نئے وجود کی تخلیق کر رہی تھی۔ آپریشن کے بغیر بچے کی ولادت ممکن نہ تھی۔ ظاہر پھر ہسپتال پہنچے۔ ان کی اجازت سے ڈاکٹروں نے آپریشن کیا۔

ظاہر کی حالت قابلِ رحم تھی۔ آپریشن کے دوران انہیں گھر جانا پڑا۔ جان ناجی میں اٹکی تھی۔ گھنٹہ بھر بعد پھر واپس آئے۔

ناجی ہیٹ کے آپریشن کے بعد ایک پیاری سے بچی کو جنم دے کر بے ہوش پڑی تھی۔

نرس نے برآمدے ہی میں ظاہر کو بچی کی ولادت کی خبر سنائی۔ ظاہر بے جا پائے ناجی کے کمرے کی طرف بڑھے۔

وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ سفید سفید نرم بستر میں زرد و زرد ناجی۔ کپہرے پر تنقہس کی ایسی جھلک تھی کہ ظاہر کا سر عقیدت و احترام سے جھک گیا۔ وہ بڑھے اور ناجی کی ہوشیاری پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔



”تم نے جان پر کھیل کر میری خواہش کا احترام کیا۔ تم قابلِ تعظیم ہو۔“ ناجی کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ڈاکٹر نے آکر انہیں تسکین و تسلی دی۔ طاہر نے بچی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

دوسرے کمرے سے نرس سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی پیاری سی بچی کو لے کر آ گئی۔ طاہر نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ پیار و محبت کے کچھ ناگہم سے بندے ان کے دل میں پھل اُٹھے۔

”صداقت“ انہوں نے پیار کی شدتوں سے پکارا۔

لیکن اپنے چمنستانِ محبت کے اس شگوفے کی مہک سونگھنے سے پہلے ہی دوسری نرس گہرائی ہوئی اور آئی۔

”الہام سے فون۔۔۔ آیا ہے کہ۔۔۔“ وہ کیکپاتی آواز میں بولی۔ طاہر یوں کہنے لگا کہ۔۔۔ بہر حال۔۔۔

جب وہ فاروق کی خواب گاہ میں پہنچے تو وہ ابدی نیند سو جانے کو تھے۔ بچی کی ولادت کی خبر یہاں بھی پہنچ چکی تھی۔

پہلا لفظ جو اس سے منسوب کیا گیا وہ ”منحوس“ تھا۔

موت و زہست کی کشمکش نے آخری مرحلہ طے کر لیا۔ زندگی نے ہتھیار ڈال دیئے اور موت نے لہریں کمرانی کے سیاہ جھنڈے کاڑھ دیئے۔

اک کہرام مچ گیا۔

اک قیامت ٹوٹ پڑی۔

آہ و فغاں نے الہام کے دو دیوار ہلا کر رکھ دیئے۔

زندگی کی شکست پر آسو بہانے کے سوا چارہ ہی کیا ہوتا ہے۔

سکون ناجی کی تقدیر سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا تھا۔ بچی کی ولادت سے کمزوری بے حد ہو گئی تھی۔ باپ کی وفات سے طاہر کئی ہفتالوں میں پھنسے تھے۔ ناجی ہسپتال سے واپس گھر آ گئی تھی۔ لیکن طاہر کو المینان کا ایک لمحہ بھی اس کی قربت میں نصیب نہ ہو سکا۔ تعزیت کرنے والوں سے چھٹکارا ملتا تو جاگیر کے ستارے، جاہلداد کے بکھیرے اور کاروبار کے جھنجھٹ گھیر لیتے۔ انہی ہفتالوں میں الجھ کر رو گئے۔ اکثر ہفتہ ہفتہ بھر گھر سے باہر رہنا پڑتا۔ دوڑ و سوپ میں انہیں ناجی کے پاس رہنے کی فرصت ہی میسر نہ آ سکی۔

ناجی کیلی لکڑیوں کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ طائر آزاد کو صرف قفس ہی میں ڈال دیا ہوتا تو بات بھی تھی۔ یہاں تو قید کے ساتھ ساتھ فشتروں کی چھن بھی تھی۔ اک اک لمحہ بھر پور اذیت تھی۔

فوزیہ کسی بدروح کی طرح اس کی زندگی کا تعاقب کیے جا رہی تھی۔ وہ جب بھی ناجی کے سامنے آتی، سر تا پا کانپ جاتی۔ اُسے یہی محسوس ہوتا جیسے فوزیہ عورت نہیں ڈائن ہے جس کے خونی جیروں میں لمبے لمبے نوکیلے دانت ہر وقت اس کی حیات کو چبا جانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

”چڑیل۔۔۔“ تجھے میں اپنی راہ سے ہٹا کر دم لوں گی“ دانت پیٹتے ہوئے فوزیہ کئی بار یہ جملہ اس سے کہہ چکی تھی۔

اور

ہر بار ناجی کے خوف و ہراس میں اس جملے سے کیکپاتا ہوا اٹھتا ہوا تھا۔ گھر کے دوسرے افراد بھی تو فوزیہ سے کم نہ تھے۔ طاہر جتنے دن گھر سے باہر رہتے ان لوگوں کو اپنی زخمی زہر کو تسکین دینے کا حصہ دیتا رہتا۔ انجم آرا کی نگاہ



لطف و کرم میسر بھی ایسا ان دنوں وہ بھی اس قدر مصروف تھیں کہ ناجی کی سہیلی الگ  
آج محسوس ہی نہ کر سکیں۔

بات صرف ناجی کی ذات تک ہی محدود ہوتی تو شاید وہ دل پر پتھر رکھ کر سہ  
سکتی۔ لیکن اب تو اس کے ساتھ ساتھ تنہی منی جان کو بھی موردِ عتاب بنایا جا رہا تھا۔  
صاعقہ۔۔۔ چند دنوں کی معصوم بچی سب کی نظروں میں منحوس قرار دی جا چکی تھی۔  
نواب فاروق کی موت کی ذمہ دار جیسے وہی تھی۔

قدرت بھی بسا اوقات عجب ستم ظریف ہوتی ہے۔ نحوست کو صاعقہ کی ذات کا  
جزو سمجھا ہی جا رہا تھا۔ شومی تقدیر جس دن ناجی اپنی بچی سمیت ہسپتال سے گھر آئی۔  
اسی دن آیا کی نالی سے چھوٹی پھوپھی حسن آرا کا غسل خانے میں پاؤں پھنسا اور کوٹھے کی  
ہڈی اتر گئی۔

اس واقعے سے صاعقہ کی نحوست پر جیسے مہر تصدیق لگ گئی۔  
محض اتفاق ہی تھا۔ لیکن انہی دنوں روٹی کے گوداموں میں کس ملازم کی  
شرارت یا تساہل سے آگ لگ جانے سے کم و بیش تین چار لاکھ کا نقصان ہو گیا۔ بات ہم  
پھر کر صاعقہ کی نحوست سے وابستہ ہوئی۔

ستم بالائے ستم یہ کہ انہی دنوں حسن آرا کے شوہر فضائی حادثہ میں پیرس کے  
قرب جال بحق ہو گئے۔ جس وقت یہ اطلاع قصرِ احمر میں پہنچی، حسن آرا صاعقہ کو گود  
میں لیے بیٹھی تھیں۔ اب تو صاعقہ نحوست کا ایسا نشان سمجھی جانے لگی۔ جس کے  
عقب میں تباہی ہی تباہی تھی۔

ناجی کے سامنے ہی اسے وہ کوٹنے دیے جاتے کہ ظلم بھی پناہ مانگ اٹھتا۔  
والوں کا بس چلتا تو تنہی سی جان کو پاؤں تلے کچل کر فنا کر دیا جاتا۔ جارحانہ، بھیانک اور  
رواں گھٹنے میں ہر فرد پیش پیش تھا۔

ناجی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اپنی ذات پر تو شاید اس سے بھی زیادہ سختی  
جمیل لیتی لیکن اس تنہی معصوم روح کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سن کر اس کا سینہ  
شق ہو جاتا۔ اسے سینے سے نکالے پہروں روتی رہتی۔ محل کے چھوڑے درختوں کی  
چھانوں میں، ہنسی پہاڑی ندی کے کنارے چپ چاپ بیٹھی اپنی تقدیر کے اس پٹے  
متعلق سوچتی رہتی۔ اسے سیاں کی بے مہری کا بھی تو شکوہ تھا۔ الحمد للہ اس نے

اس سے اتنی دور ہو گئے تھے۔

لیکن یہ سب ناجی کے دکھے ذہن کی اختراع تھی۔ ظاہر کو مصروفیت نے الجھا رکھا  
تھا۔ اُن کے پیار کے مدارج تو نہ بدلے تھے۔

باپ کی وفات نے کئی بکھیرے کھڑے کر دیئے تھے۔ الجھنیں بڑھتی جا رہی  
تھیں۔ ان سب کا تدارک انہی دنوں ضروری تھا۔ سب بھائی ان ستاروں، بکھیروں  
اور الجھنوں کو دور کرنے میں کوشاں تھے۔

ظاہر فرصت محال کر ناجی کے پاس آتے۔ شکوے پچل اُٹھتے گلے ہونٹوں پر  
تڑپ جاتے۔ لیکن نہ شکووں کو راہ ملتی نہ گلوں کو زبان۔۔۔ ظاہر آتے تو اُن کی توجہ  
کامرکز صاعقہ ہوتی۔ اس کی پیاری پیاری صورت دیکھ کر وہ ہر الجھن، ہر ستارہ اور ہر  
بکھیر بھول جاتے۔ کتنے مسرور نظر آتے تھے۔ وہ۔۔۔ ناجی کچھ کہنا چاہتے ہوئے  
بھی کہہ نہ پاتی۔

پورے دو ماہ گزر گئے۔ ناجی کا سینہ گھر والوں کے طعنے سنتے سنتے شق ہو گیا  
تھا۔ صاعقہ کی نحوست کی باتیں سُن سُن کر کان پک گئے تھے۔ ہر حادثہ اس کی ذات سے  
منسوب تھا۔ اور کو تباہی تقدیر سے حادثے بھی انہی دنوں پیش آئے تھے۔ پے در پے  
کئی واقعات پیش آئے۔

آمدِ ہی کے ساتھ طوفانی بارش آئی۔ الحما کے زمانہ حصے کی پچھلی دیوار گرنے سے  
دو کنینس مجروح ہو گئیں۔ ملازم لڑکے سے بچہ کاڑی الٹی اور انجم کا چھوٹا بچہ زخمی ہو  
گیا۔ دادی حسن بانو کے سر میں درد شروع ہوا اور کچھ مستقل صورت اختیار کر گیا۔  
رعان کا کھیلنے کھیلنے پاؤں پھنسا اور موج آگئی۔

چھوٹے بڑے کئی واقعات پیش آئے اور ان سب کی محرک صاعقہ کی ذات کو  
سمجھا جانے لگا۔ عورتیں تو عورتیں، اس کہنے کے اکثر مرد بھی اس کو منحوس کہنے اور  
بگھٹنے میں اپنے آپ کو حق بجانب کہنے لگے۔

ناجی سب ستم اپنی جان پر جمیل رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا  
جیسے شوق و شگ ندی کی لہریں کسی سرد رو سے منجمد ہو چکی ہوں۔ چہرے سے تازگی و  
شادابی غنقا تھی۔ وہ مُرجھائے ہوئے اس بھول کی طرح دکھائی دیتی تھی جیسے عالم شیب  
میں شبنم سے توڑ کر ٹکڑے ان میں سجا دیا گیا ہو۔ اور جہاں وہ اپنے قدرتی وسائل سے محروم



ہو کر رنگ و بو کھو رہا ہو۔

اس دن طاہر تقریباً ڈیڑھ ہفتے کے بعد الحمر واپس آئے۔ جاگیر پر تنازعہ کی وجہ سے اتنے دن غیر حاضر رہنا پڑا۔

طاہر نے اس دن ناجی کو ایک عرصے کے بعد غور سے دیکھا۔

اور

جیسے

کسی نے ان کا دل مسل کر رکھ دیا۔

ناجی کا صبیح و صلیح چہرہ اس سپاٹ میدان کی طرح منظر آ رہا تھا جہاں کوئی حسین فائدہ چند دن رگ کر رہا تھا۔ بکھیرنے کے بعد جا چکا ہو۔ اور چند روزہ رونقوں کے بعد چہرہ سنائے میں اب اویسیاں ہی اویسیاں اُٹھ آتی ہوں۔

چہرے کی رنگت زرد تھی لیکن آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے کتنے گہرے ہو گئے تھے۔ طاہر نے بے اختیار ہو کر ناجی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ اب تک ناگہانی کمزوری کو بچی کی ولادت کا اثر سمجھ رہے تھے۔ لیکن آج ان کا دل سہم کر رہ گیا۔  
”تمہیں کیا ہو گیا ہے ناجی۔۔۔ کتنی کمزور ہو گئی ہو۔۔۔ کیا تکلیف ہے تمہیں۔۔۔؟“

اس بے پناہ جہر روی اور چاہت نے محسوسات کے نازک نازک آبگینوں کو ٹھہرے لگا دی۔ اُکا ہوا طوفان پھوٹ پڑا۔ ناجی نے طاہر کے چھاتی میں منہ چھپا لیا۔ اور ان کی آنکھوں سے سادون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

”ناجی“ طاہر گہرا گئے ”کیا ہوا۔۔۔ کچھ تو کہو۔۔۔!“

”سیاں“ ناجی ان کی چھاتی سے لگی سسکتی رہی۔

”ناجی“ طاہر نے ہینا کی شدتوں سے مغلوب ہو کر اسے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا۔

”سیاں“

”کچھ تو کہو ناجی۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ کسی نے کچھ کہہ دیا۔۔۔ ناجی۔۔۔ کیوں رہی ہو۔۔۔ کچھ تو کہو۔۔۔“ اس کے بالوں میں منہ چھپائے طاہر بچہ رہے تھے۔

”سیاں“ وہ مضطرب و متزلزل تھی۔

”کیا ہوا؟“ طاہر نے اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اونچا کیا۔ اور اس کی جل برساتی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے بولے ”اُداس ہو گئی تھیں۔ بہت دن لگ گئے مجھے۔۔۔ کیا کرتا۔۔۔ کام ہی ایسا تھا۔۔۔ مجبوری تھی ناجی۔۔۔ وعدہ کرتا ہوں۔ اب اتنے طویل عرصے کے لیے کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”مجھے یہاں سے لے چلو سیٹاں۔۔۔“ ناجی نے سر جھکا کر پھر ان کی چھاتی سے لگا دیا۔۔۔ ”میں یہاں مرجاؤں گی۔۔۔ مجھے کہیں لے چلو۔“

”ناجی“ طاہر نے سہارا دے کر اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ اب بھی اسی بے اختیاری سے روئے جا رہی تھی۔

طاہر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ کچھ افسردہ سے منظر آنے لگے تھے وہ۔۔۔ ”ناجی۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔ یہاں دل نہیں لگا۔۔۔ یہ میرا گھر ہے۔ تمہیں اچھا نہیں لگا؟“

ناجی روئے گئی۔ وہ انہیں کیسے بتا دیتی کہ یہ گھر نہیں، سونے چاندی کی سلاخوں والا ایسا بند پنجرہ ہے جہاں ہر لمحہ اس کی فشتروں اور زہر آلود تیروں سے دیکھ بھال ہوتی ہے۔ اور جس کی بند سلاخوں سے اپنا ماتھا پھوڑ پھوڑ کر بھی راہ فرار نہیں پاسکتی۔  
”اکیلی گھبرا جاتی ہو۔۔۔ اتنی حضور کے پاس چلی جایا کرو۔ وہاں سب لوگ تمہارا دل بھلائیں گے۔“

”نہیں سیاں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“

”کیا؟“

ناجی روتی رہی۔

”اتنی حضور سے ڈر لگتا ہے؟“ طاہر نے اس کی ذہنی کیفیت سے اندازہ لگایا۔

”ہاں۔۔۔“ ناجی نے معصومیت سے کہا۔

”کیوں؟“

”سیٹاں۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے یہاں سب۔۔۔ برا سمجھتے ہیں۔۔۔“

”سیاں۔۔۔“

”یہ تمہارا وہم ہے ناجی“ طاہر ساٹھ ہنسی بنے۔



”نہیں۔۔۔ سیاس نہیں۔۔۔“

”ناجی۔۔۔ انی حضور نے ابائی وفات کا جانکاہ صدمہ جھیلنا ہے۔ اور پھر خسر آرا کے شوہر کی موت نے ان کے حواس پر بجلی گرائی ہے۔ ان کا مزاج چڑچڑاسا ہو گیا ہے لیکن کیراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سب یہ کہیں گے۔ ان دو اموات سے تو سب کی جان پریشی ہے۔ تم دل تھوڑا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ناجی ظہر کے اعتماد کو کیوں کر جھٹھا دیتی۔ قبر کے طوفان تو اس کی ذات پر ٹوٹتے تھے۔ ظہر کے ساتھ تو گھر والوں کا رویہ معمول سے زیادہ خوشگوار تھا۔ یہی رنجی پالیسی تھی۔ جو ناجی کو بن موت مارے جا رہی تھی۔

شومی تقدیر ناجی و ظہر کی باتیں فوزیہ نے سن لیں۔۔۔ ”سن بانو کو! کیا پڑا کر دھتے سے جیج و تاب کھانے لگیں۔ ناجی کو کچل دینے کی انہوں نے قسم کھالی۔ اب ناجی کے خلاف اک دنیا محاذ قائم ہو گیا۔ انہم تو سسرال جا چکی تھیں۔ ان سہارا بھی بنا چاہا۔ ظہر کو بھی اکثر گھر سے باہر رہنا پڑا۔ موقوفہ غنیمت جان کر مظلوم اوصاف کئے اور سبے درجہ اوصاف کئے۔ کوٹا گیا اور رید روی سے کوٹا گیا۔

چال بدل لی گئی تھی۔ ظہر کے سامنے ناجی کے ساتھ ٹسٹ سلوک کا مظاہرہ کیا جاتا۔ اس کے ساتھ ہمدردی جتائی جاتی۔ اس کی صحت کے بارے میں تھوڑی سی بات ہوتی۔ لیکن ظہر فریب کھا رہے تھے۔ انہی باتوں کا بہار ا لیے جا رہے تھے جو بڑے مستعدی سے ان کی جیتی جاگتی محبت کو دفنانے کے لیے قبر کھود رہے تھے۔

ناجی پانچل چپ ہو گئی۔ مجنم بکھڑا تھا لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔ ہاں کبھی کبھی سب اس ہو کر ظہر کی ہنساتی میں منہ چھپا کر رو دیتی تو اس کی زبان پر ایک ہی جملہ ہوتا۔۔۔ ”مجھے کہیں لے چلو سیاس۔۔۔“

ظہر اس کے سادہ ہاتھ پر ہاتھ میرتے ہوئے اپنے بھرپور ہمدردی سے لہجہ بولنے لگتے۔ ”دیکھو! اگر سب نے کہہ دی کہ ساری جہد علی سے متاخر ہے۔ وہ قدر سب کیسے جھٹھا دے دیتا تو کوٹا کر دلوں سے دلوں سے دلوں میں۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ سیاس نہیں۔۔۔“

خاموشی اس کے سرپا پر چھائی رہتی۔ وہ دیکھتا ہوا زخم و کھائی دینے لگی۔ ظہر چاہتے وہ سارے محل میں شوخ برنی کی طرح طرارے بھرتی پھرے۔ پچھلے سی شوخی، معصومیت اور البر پنے سے ان کے ساتھ باتوں کے طویل سلسلے چھیرے، اچھلے، کودے اور مستانہ ہواؤں کی طرح الحمرا میں جھومتی پھرے۔

لیکن

ناجی پر تو اک جمود طاری تھا۔ آنکھوں میں جما ہوا آزار اب استنا واضح تھا کہ ظہر دو رنجی پالیسی کے فریب میں آنے کے باوجود تڑپ کر رہ گئے۔

”ناجی۔۔۔!“ انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر غور سے دیکھا۔۔۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”سیاس“ طوفان اک بار پھر ہسٹ پڑا۔۔۔ ناجی سبے اختیار ہو کر روی۔

”ناجی۔۔۔ کچھ تو بتا دو۔۔۔“

”مجھے یہاں سے لے چلو سیاس۔۔۔ نہیں تو میں مری جاؤں گی۔۔۔ میرا دم گٹ جائے گا۔۔۔ مجھے لے چلو سیاس۔۔۔ لے چلو۔۔۔!“

”اچھا۔۔۔ میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا“ ظہر نے فیصلہ کر لیا۔

”سچ؟“

”ہاں“

”کب چلو گے؟“

”بہت جلد۔۔۔“

”سچ کہتے ہو۔۔۔“

”یقیناً نہ کرنے کی وجہ تو کوئی نہیں۔۔۔“

”سیاس۔۔۔!“ ناجی کو جیسے اس کی کوئی ہوتی بہت ملنے کا یقین آ گیا۔

ظہر نے اس کی آنسو بھری آنکھوں میں جھانکا۔ انہیں انوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے بجھے درپ پھر سے روشن ہو گئے ہوں۔ مسرت کی اک بھرپور ہر اس کے گلے ہونے پھر سے ہر روز گئی۔

”تیس تیس خوش دیکھنا چاہتا ہوں ملائی۔۔۔ اگر تبدیلی خوشی یہاں سے پٹے جلتا ہے تو میں تبدیلی خوشی یہاں نہیں لوٹاؤں گا۔۔۔“



”سیاں۔۔۔ تم کتنے اچھے ہو سیاں“ ناجی نے اک مدت کے بعد اپنی مخصوص آواز سے مسکرا کر ظاہر کو دیکھا اور پھر شرما کر اپنا منہ ان کی چھاتی میں چھپا لیا۔  
 ظاہر کو آج پہلی بار اس آزاد پرندے کی بند پنجرے میں پھڑپھڑاہٹ کا صحیح اندازہ ہوا۔۔۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے لاشعوری طور پر وہ ناجی پر ظلم کرتے رہے تھے۔ ان کا دل دُکھنے لگا۔

۲۰

اللہ جانے اُسے یہاں کیا تکلیف ہے۔ ہم تو صدقے واری ہوتے ہیں۔ اس کا مزاج ہی نہیں ٹھہرتا۔“  
 ”یہ بات نہیں امی حضور۔ وہ اس ماحول سے مانوس نہیں۔ اس لیے سخت گھبرا گئی ہے۔“  
 ”یہاں رہے گی تو مانوس بھی ہو جائے گی۔ دور دور بھاگے گی تو مانوس ہونے کا سوال ہی نہیں۔“  
 ”اس کی صحت گرتی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ کے لیے اسے الگ رکھنا ہی پڑے گا۔ ورنہ!“  
 ”یوں کیوں نہیں کہتے کہ خود ہی ہم سے دور بھاگنا چاہتے ہو۔“  
 ”امی حضور۔!“  
 ”اور کیا۔ ابھی تو باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔ اس بات کو کہتے ہوئے تمہیں خود ہی خیال ہونا چاہیے۔“  
 ماں کی کلوگیر آواز سے ظاہر کا دل ڈول گیا۔  
 ظاہر نے ماں کے سامنے ناجی کو الگ رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن وہ ہاتھ میں آیا ہوا شکار کب چھوڑنا چاہتی تھیں۔ ناجی ایک بار پھر ان کے وقار کا مسخرہ اڑاتے ہوئے ظاہر کو لے کر الگ ہو جائے یہ بات بھلا انہیں کیونکر گوارا ہو سکتی تھی۔ استغما ہی بند ہے تو اسے لمحہ لمحہ کی موت مار کر تسکین پار ہے تھے ناجی کے الگ ہو جانے سے یہ تحریر ہی کارروائی کہاں ممکن تھی۔  
 ماں نے مخالفت کی۔ سعدیہ اور فوزیہ نے ماں کی حمایت کی لیکن سب نے وطیرہ ایسا اختیار کیا کہ ظاہر کے لیے نہ پائے ماند نہ جانے رفیق والامعاملہ ہو گیا۔



”سال بھر تمہاری جدائی میں تڑپتے گزرا تھا۔ خدا خدا کر کے شکل دیکھنا نصیب ہوئی۔ جانا ہی تھا تو پھر آئے کیوں تھے۔ ایک ہی صبر کی سل کلیجہ پر رکھ لی تھی۔“

”دنیا کیا کہے گی۔ باپ کی راہیں بھی میلی نہ ہوئیں اور بیٹے نے کنارہ کشی کر لی۔“

”کتنے خوش تھے تمہارے ابا تمہاری واپسی سے۔ انہیں فریب ہی دینے آئے تھے۔ چاہتے ہو ان کی روح ابد تک بھٹکتی پھرے۔“

”قسمت میں دکھ ہی دکھ لکھے ہیں۔ زخموں پر پھایا رکھنے کی بجائے انہیں کریدنا چاہتے ہو۔“

ماں نے روتی آنکھوں سے ایسے ایسے وار کیے کہ طاہر بے بس ہو کر رہ گئے۔ سر جو ہار آہستگی سے ایک بار پھر اپنے ارادے کی وضاحت کی:

”اُمی حضور میں کوئی گھر چھوڑ کر پہلے کی طرح تو نہیں جا رہا صرف ناجی کی صحت کے پیش نظر۔۔۔“

”ہاں ہاں۔ یہی تو کہو گے۔ ناجی کے مقابلے میں تمہیں یہ وہ ماں کا احساس بھی کیا ہو سکتا ہے۔“ ماں چپکیاں بھرنے لگی۔

”جب جانے پر ہشمت ہو تو پھر پوچھنے کا کیا محل۔ جاؤ جہاں خوش رہ سکتے ہو رہو۔“ چھوٹی بہن حسن ارادے نے تلخی سے کہا۔

”نہیں خدا کو سو نہو۔“ ماں نے رقت آمیز لہجے میں جیسے فریاد کی۔ ”جہاں حقہ میں تو صدے ہی صدے دیکھنا لگے ہیں۔“ سعدیہ نے آنکھیں آنچل سے پونچھیں۔

حسن بانو اور ان کے حواریوں کے وار نشانے پہنچے۔ طاہر کا سر اور جھک گیا۔ ہونٹوں پر مہر خاموشی لگ گئی۔ ان کی باتوں سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ ناجی کا یہاں سے کہیں اور چلے جانے کا اصرار بے محل سا نظر آنے لگا۔

مذہال اور پریشان سے وہاں سے اٹھے۔ ماں کے لیے ان کے دل میں آگ درد کروٹیں لے رہا تھا۔

اور

اسی رات جب ناجی نے بڑے پیار سے طاہر کے گلے میں بانہیں ڈال کر مسکراتے ہوئے پوچھا ”کب چلو گے سیاں؟“

طاہر جھنجھلا گئے۔

ماں نے پر بلکی سی شکنیں ابھریں اور جھٹک کر بولے ”خدا جانے تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟“

ناجی کے بازو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح گر گئے۔ آنکھیں پھاڑے وہ طاہر کو دیکھتی رہ گئی۔

طاہر نے منہ پھیرا۔ اور مسہری کی طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑائے ”تم استنا بھی تو سوچو میرے لیے یہاں سے جانا کتنا مشکل ہے۔ ابا کو فوت ہونے ابھی عرصہ ہی کتنا گزرا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ دنیا داری کی خاطر کبھی کبھی اپنے اوپر جبر بھی کرنا پڑتا ہے۔“

وہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ اور ناجی انہیں آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سیاں نہیں حسن بانو کے صاحبزادے طاہر اس سے ہم کلام ہوں۔ طاہر و سیاں۔۔۔ ایک ہی شخصیت کے دو رخ قطعی متضاد معلوم ہو رہے تھے۔

ناجی کا معصوم دل طاہر کی ذرا سی جھنجھلاہٹ سے خون ہو گیا۔ آئینہ پر خراشیں جی خراشیں تھیں۔

ان خراشوں سے لہو رستار ہا۔

طاہر اس کی پریشانی سے مضطرب تو ہوئے لیکن اظہارِ ہمدردی کی بجائے اسے سمجھانا ضروری تھا۔ اس لیے بڑے ناصحانہ طریق سے اسے سمجھاتے رہے۔

ناجی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پیار کی گرمی و شدت سے تسکین و ہمدردی کے چند الفاظ کہہ دیتے تو شاید ناجی کے دل کے زخم سل جاتے۔ لیکن آج طاہر کا ناصحانہ انداز اور سرد سا اجنبی رویہ ناجی کے دل و دماغ میں حشر اٹھا گیا۔ طاہر نے جو کچھ مصلحت سمجھ کر کیا، وہ ناجی کی بربادی کا پہلا قدم تھا۔

دوسرے دن موقع پاتے ہی حسن بانو نے دل کا غبار نکالا۔ سعدیہ نے لعن طعن کی۔ حسن ارادے نے نفرت و حقارت کی آگ برساتی۔ فوزیہ نے دانت چبا کر دھکی دی۔

”یہاں سے اب اکیلی ہی جاؤ گی۔ طاہر کو ساتھ لے جانے کی کوشش کی تو ان کی لاش ہی ملے گی تمہیں۔۔۔ سمجھیں۔۔۔“

ناجی پر قیامتیں ہی ٹوٹ گئیں۔ پریشان۔۔۔ مذہال اور مضطرب ناجی کچھ سمجھ نہ پاتی تھی کہ کیا کرے۔ تو اس کے آنکھوں کے زبرجستہ ہونے لگے۔ فکر فکر دیکھنے



جاتی نہ آنکھوں میں آنسو آئے نہ ہونٹوں پر فریاد۔۔۔  
ظاہر کو ہفتہ بھر کے لیے باہر جانا پڑا۔

اور

یہ ہفتہ

ناجی کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔

چھتھی نظروں، کھولتے طعنوں اور بولناک دھمکیوں نے اس کی زندگی لہیرن کر دی۔

وہ

جینے سے سیر ہر ہو گئی۔

قسطی سیر۔۔۔

اور

یہ سیر جاری اس دن آخری حد سے چھو گئی۔ ناجی نے محض اتنی شاقی طور پر سیر کی  
فوزیہ کی باتیں سن لیں۔

سعدیہ کہہ رہی تھی۔ ”اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اس چڑیل سے پیچھا چھوٹ جانے کا مجھے قوی امید ہے تم ظاہر کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتی رہو۔“  
”میری تو ہر دم یہی کوشش ہوتی ہے۔“

”بہت فرق آپ کا ہے ظاہر میں۔۔۔ میرے خیال میں تو اب ان کا دل ناجی سے بھر رہا ہے۔ ایک دیہاتن کب تک نظروں میں سما سکتی ہے۔“  
”مسین تو ہے۔“

”مسین ہے تو کیا ہوا۔ تمہارا اس کا کیا مقابلہ۔۔۔ تہذیب یافتہ حسن کے سامنے ان  
بڑھئی کی کیا وقعت۔ تم بھلا کسی سے کم نہ ہو۔ ظاہر کو بار کر آخر تمہیں اپنا ناپڑے گا۔“  
”انہیں پانے کے لیے میں سب کچھ سہہ گزروں گی۔ اگر۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں  
کوئی نو فنک قدم اٹھانے سے بھی گریز نہ کروں گی۔“

”تم سانس نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کتنا زور لگایا اس نے الگ جا کر رہنے کے لیے  
لیکن بات نہ بنی۔ ظاہر کو جاری بات ہی مانتا پڑی۔“

”یہ تو واقعی کہاں ہوا۔۔۔ ظاہر نے ناجی کی بات ٹھکرا دی۔“  
”آگے آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ یہ محبت کا ہر جہاز تیزی سے چڑھا ہے۔“

تیزی سے اتر جائے گا۔“

ناجی کا دماغ ریل کے پیٹنے کی طرح گھوم گیا۔ ظاہر کا رویہ مشکوک ذہن کے لیے  
قاتل ثابت ہوا۔

وہ دن رات اس ماحول سے نکلنے کے متعلق سوچنے لگی۔ کوئی ٹھکانہ منظر آتا تھا۔  
ماں مرچکی تھی۔ کوئی قریبی عزیز بھی نہ تھا اور پھر۔۔۔ پھر وہ کسی کے ہاں جا بھی کیسے سکتی  
تھی۔ دل برداشتہ ہو کر صرف ایک ہی راہ فرار کے متعلق سوچتی۔  
خودکشی۔

یہی راہ اسے سکون دے سکتی تھی۔ اس کی ہمت قلم سہتے سہتے جواب دہتی جا  
رہی تھی۔ اس پر سیاں کا ناصحانہ انداز۔۔۔ وہ بدظن ہوتی گئی۔۔۔ سیاں سے بھی بدظن ہوتی  
گئی۔

اور ظاہر ناجی کی پریشانی سے پریشان تھے۔ دریں حالات اسے یہاں سے کہیں  
لے جا کر الگ رکھنا بھی ممکن نہ تھا۔

اور یہاں رکھنے سے دیکھ رہے تھے کہ ناجی بے موت مری جا رہی ہے۔ دن رات  
اس الجھاؤ کے متعلق سوچتے رہے۔ کبھی ناجی کو تسلیاں دیتے، کبھی جھجھکا کر حالات سے  
تعاون کرنے کی نصیحت کرتے۔

ناجی بالکل چپ ہو گئی تھی۔ اب اس نے کبھی کہیں اور جانے کے لیے ظاہر کو مجبور  
نہ کیا تھا۔ کبھی کسی کے متعلق شکایت نہ تھی۔ لبوں پر کسی کا شکوہ نہ آیا تھا۔ سہمی ہوئی  
دن رات کے پکر میں پستی جا رہی تھی۔

ظاہر اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتے تھے۔ ناجی اگر یہیں رہی تو کوئی عجب نہیں

کسی مہلک مرض میں گرفتار ہو جائے۔ یہ سوچ کر وہ سر تاپا کانپ جاتے۔۔۔

بالآخر انہوں نے ایک تجویز سوچ لی۔ ناجی کو کچھ عرصہ کے لیے غیر ممالک کی سیر کے  
لیے لے جانے سے وہ یہاں کے غیر مانوس ماحول سے بھی تھک جائے گی اور گمراہیوں کو  
احتراف کا موقع بھی نہیں ملے گا۔

ناجی سے کوئی ذکر کرنے سے پہلے انہوں نے اپنی تجویز ماں کے سامنے پیش کی۔  
”پندرہ ماہ کے لیے اسے غیر ممالک کی سیر کے لیے لے جاؤں گا۔ وہ بہل جائے گی۔“



اس کی صحت کس قدر گر چکی ہے۔ ہول آتا ہے۔ اسے دیکھتا ہوں تو۔ کچھ دیر پہل سے دور رہے گی تو غیر مانوس ماحول کا احساس جاتا رہے گا۔“

ماں کب چاہتی تھیں کہ ان کے پنجہ میں آیا ہوا شکاریوں ٹھکل جائے۔ وہ تو بیخ و بیک اس شکار کو مارنا چاہتی تھیں۔ انتقام کی آگ کو شکار کی تڑپ سے ٹھنڈا کرنا چاہتی تھیں۔ کافی لمبے دے ہوئی لیکن طاہر نے اس تجویز پر لمبی چوڑی بحث کی۔ اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

ماں کو بالآخر چپ ہو جانا پڑا۔ وہ راضی تو نہ تھیں۔ یہ طاہر بھی جانتے تھے۔ طاہر تیاروں میں مصروف ہو گئے۔ ماں کی خشکی کا احساس تھا۔

لیکن

کیا کرتے۔ مجبور بھی تو تھے۔

کئی دن طاہر پاسپورٹ وغیرہ کی تیاری میں لگے رہے۔ ناجی کو سرسری طور پر اپنے باہر جانے کے پروگرام سے مطلع بھی کیا لیکن ناجی تو پتھر اچکی تھی۔ اس نے کوئی دیکھا نہ لی۔

اس کے ذہن میں اک نئی بات گھر کر گئی۔ طاہر سب کچھ خوشی سے نہیں مجبور آ رہے ہیں۔ مشکوک ذہن اس احساس کو جان لیوا بناتا گیا۔

وہ زندگی سے تنگ چکی تھی۔ ہر ارمان منجمد ہو چکا تھا۔

سیر و تفریح کے لیے جانے کی اسے مطلقاً خوشی نہ ہوئی۔ اور جب سے طاہر نے جانے کی تیاریاں شروع کی تھیں، گھر والوں نے اس پر ڈھانے جانے والے مظالم کو کتنا سنگین بنا دیا تھا۔

فوزیہ تو جان کی دشمن پہلے ہی تھی۔ اب تو اس کا خون پینے کو بے تاب تھی تو غور آنکھوں سے گھورتی۔ پہنا جانے والی نظروں سے دیکھتی۔

حسن ہانوں نے بھی ناک میں دم کر دیا تھا۔ اس دن کتنے ظالمانہ طریق سے اسے ہتھیاروں سے ہتھیار کیا تھا۔ میرے بیٹے کو پھر مجھ سے جدا کر رہی ہو۔ دو چار ماہ سیر کر آؤ۔ آنا تو ہیں ہے۔ ساری سیر کا مزد چکھنا دیا تو۔ کتنے فریب جاتی ہے۔ دیکھو تو میں زبان نظر نہیں آتی اور کر تو ت۔ اللہ جانے کس کس طرح سکھا کر آمادہ کر لیا ہے اسے۔ وہ تو یہاں سے جانے کا بھی نام نہ لیتا۔“

سعید، حسن آراء سمجھی آزار دے رہی تھیں۔ ناجی دن رات مرجانے کے متعلق سوچتی۔ باہر جانے کا اب اسے ارمان بھی کیا تھا۔

فوزیہ طاہر کی تیاریاں دیکھ دیکھ کر زہریلی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ یہ تیاریاں ان کے منہ پر تھپڑ تھپڑ تھیں۔

پے درپے شکستوں نے فوزیہ کو خونخوار بنا دیا۔ طاہر۔ یہیں رہتے تو اسے اپنی سرگرمیاں تیز کر کے کسی امید کا سہارا ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کے چلے جانے سے امید خاک میں مل رہی تھی۔ ناجی کی خوش بختی پر وہ ناکامی کی مہر بن جانا چاہتی تھی۔

اور

اس رات

ناجی مایوسی کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ آج طاہر نے پھر خشکی کا اظہار کیا تھا۔ یوں کم صدم ہو جانے پر وہ اچھے خاصے برہم بھی ہوئے تھے۔ ناجی ابھی اس برہم کے تاثر سے ہی سے تڑپ رہی تھی کہ فوزیہ اس کے کمرے میں آگئی۔ رات کے وقت اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ تیرہ بجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ فوزیہ زہرا بھل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اس نے ناجی کے بال بھٹکھوڑ ڈالے اور کف آلود ہیروں سے دھمکی دی۔

”طاہر کو یہاں سے لے جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ اگر تم انہیں یہاں سے لے جانے پر مصر رہیں تو یاد رکھو تمہیں، طاہر کی جگہ طاہر کی تڑپتی ہوئی لاش ملے گی۔ طاہر میرے ہیں اور میں انہیں حاصل کر کے رہوں گی۔ تم میرے اور طاہر کے راستے کی دیوار ہو۔ اگر یہ دیوار مجھ سے نہ ہٹ سکی تو میں طاہر کو ختم کر دوں گی۔ ایک ہی کوئی اس کے سینے سے پار ہو کر سارا کام بنا دے گی۔ مجھ میں تڑپنے کی اب ہمت نہیں۔ میں تڑپوں اور تم طاہر کی سنگت میں سیر و تفریح کرتی پھرؤ۔ یہ خیال خام دل سے نکال دو۔“

ناجی دل برداشتہ تھی۔ کم عمری اور نا فہمی بھی تھی۔ زندگی سے تنگ آچکی تھی۔ طاہر کی طرف سے بھی ذہن کسی حد تک پر ظن تھا۔ ان ساری باتوں نے مل ملا کر اسے نیم ڈھانڈ بنا دیا۔ فوزیہ کی دھمکی نے تو اب ظلم سہارنے کی ہر قوت ختم کر دی۔

طاہر جب کمرے میں آئے تو وہ ناجی کی ذہنی کیفیت سے بے خبر تھے۔ وہ بے سہ سہی بستر پر پڑی تھی۔ طاہر ایک تو خود بھی دن کی دوڑ دوپ سے تھکے ہوئے تھے



دوسرا ناچی کو بے آرام نہ کرنے کے خیال سے انہوں نے اسے جگایا نہیں۔  
چپ چاپ لباس تبدیل کر کے مسہری پر لیٹ گئے۔

جہاں

چند ہی لمحوں بعد ان کا تھکا ہوا جسم نیند کی آغوش میں غافل ہو گیا۔ ناچی انکاروں پر  
لوٹتی رہی۔

طاہر کی بے حسی پر دل جل کر رہ گیا۔

فوزیہ کی دھمکی کے دھماکے سے ذہن لرز لرز اٹھا۔

اس نے زندگی کا ہوا اتار پھینکنے کا تہیہ کر لیا۔ آٹے دن کی کل کل اور جھک جھک  
سے فرار کا راستہ منظر آ رہا تھا۔

وہ اٹھی۔

اپنی شادی کی یادگار انگوٹھی اتار کر طاہر کے سرہانے رکھ دی۔ طاہر پر جھکے جھکے  
کئی لمحے انکا چہرہ دیکھتی رہی۔

کتنی پریشانیوں دی تھیں انہیں اس نے۔۔۔ نہ ماں باپ سے نہ بد آزمائی کر سکتے  
تھے، نہ بیوی کی طرف داری کھل کر ہو سکتی تھی۔ بیزار ہی رہنے لگے تھے۔ اس بیزار کو ناچی  
سراسر اپنی ذات سے منسوب کیے ہوئے تھی۔

اس کا ذہن متلاطم تھا۔ وہ کچھ سوچ نہ سکتی تھی۔ بس ایک ہی دھن تھی۔ اپنی  
ذات کو ختم کر دینے کی۔ ہر بات معمول پہ آجائے گی۔ ہر غم کامد ادا ہو جائے گا۔ پانکھوں کی  
طرح سوچتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئی۔

بہن کو بھاگتے ہوئے عبور کر کے وہ دریا کی طرف جا رہی تھی۔ اسی پتھر پر کھڑے ہو  
کر اس نے مڑ کر المیہ کی بلند وبالا عمارت کی طرف دیکھا۔ پتھروں کی بنی ہوئی عمارت۔  
جس میں ان پتھروں سے بھی کہیں زیادہ پتھر دل انسان بستے تھے۔  
المیہ پر آخری جگہ ڈالنے کے بعد ناچی نے پُر شور ندی کی طرف دیکھا "سی۔۔۔"

اک تھقی ویرانے میں کوئی نہیں۔

اک دھماکا ہوا۔۔۔ اور

ناچی پہاڑی ندی کی تیز موجوں کی آغوش میں پہنچ گئی۔

اور

عین اسی وقت

طاہر ہڑبڑا کر مسہری پر اٹھ بیٹھے۔

انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے دل پر زور سے گھونسا مارا ہو۔ اپنے  
خطرناک حد تک دھڑکتے ہوئے دل پر انہوں نے بے اختیار ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر  
لیں۔

چند لمحے یہی کیفیت رہی۔

پھر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اسی طرح دل پر ہاتھ رکھے رکھے انہوں نے  
گردن کو خم دے کر دائیں جانب دیکھا۔ ناچی ان کے پہلو ہی میں تو سو رہی تھی۔  
لیکن

اس وقت وہ بستر پر نہ تھی۔

"اوہ" طاہر لیٹ گئے۔ "شاید ناچی کے اٹھنے سے پانکھ بل گیا ہے۔" لیکن دل  
اسی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

طاہر نے کروٹ بدلی۔ آنکھیں بند کر کے سو جانے کی کوشش کی۔ ناچی شاید  
غسل خانے میں جانے کو اٹھی ہو۔۔۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہونے کی کوشش کرنے لگے۔  
لیکن

دل

کیا ہو گیا تھا اس دل کو۔۔۔ یوں بے اختیار سے دھڑکے جا رہا تھا۔ طاہر نے  
گہرے گہرے سانس لے کر اس دھڑکن کو معمول پہ لانا چاہا لیکن سینے میں کچھ گہرے سی  
محسوس ہونے لگی۔



طاہر پریشان ہو گئے۔ پھر سوچا شاید بچی کے پاس ہوگی۔ لیکن اس سوچ سے تسکین نہ ہوئی۔

ساتھ والے کمرے میں گئے۔ آیا گہری نیند میں خراٹے لے رہی تھی اور گلابی جھالروں والے ریشمی بستر میں ان کی محبت کا شکستہ پھول صاعقہ اک معصومانہ اور دلفریب انداز میں خواب استراحت کے مزے لے رہی تھی۔

ناجی وہاں بھی نہ تھی۔

طاہر جلدی سے پلٹ کر کمرے میں آئے۔ گہرا کر برآمدے میں چل آئے۔ انتظار ہر لمحہ آزار بنتا جا رہا تھا۔

”آخر وہ جا کہاں سکتی ہے؟“ انہوں نے الجھے الجھے ذہن سے سوچا۔ پھر انہیں خیال آیا ”کوئی تکلیف نہ ہو گئی ہو۔ شاید امی کے کمرے میں گئی ہو۔“

سوچ میں کم طاہر واپس اپنی خواب گاہ میں آ گئے۔ لیکن قرار نہیں آیا۔ دل تھا کہ رورہ کر تڑپ رہا تھا۔ طبیعت بوجھل ہو گئی تھی اور روح تو جیسے لامتناہی اندھیروں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ اپنے دل کو آپ ہی دلاسا دیا۔ سر جھٹک کر خیالات پریشاں سے نجات چاہی۔ اٹھکی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کو غور سے دیکھا اور نہ جانے کیونکر لاشعور کے پردوں کو چیرتی ہوئی جلد عروسی میں سرخ سرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی ناجی شعور میں آ پہنچی۔

”یہ انگوٹھی مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہوگی سیال۔ موت ہی اسے میرے ہاتھوں سے جدا کرے گی۔ تمہارے پیار کی پہلی نشانی ہے نا؟“

گہرا کر طاہر نے سر جھٹک دیا۔ دل زور سے دھڑکا اور روح بے چین ہو کر تڑپ اٹھی۔

وہ بے تابانہ کمرے سے باہر نکلے۔

دیوانہ وار ناجی کو ڈھونڈتے پھرے۔

لیکن

تلاش بے سود تھی۔

جانے والا ہیٹھ کے لیے جا چکا تھا۔

دن نکلا۔

رات آئی

بے تاب ہو کر کروٹ پھر بدلی۔ آنکھیں بند کیں، پھر کھول دیں۔ ہاتھ بڑھا کر بلکے سبز رنگ کا دم سا قلمہ روشن کیا۔ بے چینی کو ختم کرنے کے لیے سگریٹ سلکایا۔

اور ناجی کے غسل خانے سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ ناجی نہ آئی۔

تکیہ بٹا کر گھڑی چکلی۔

لیکن

شہدے سے رو گئے۔

گھڑی کے ساتھ ناجی کی انگوٹھی پڑی تھی۔

کبھی کے بل اٹھے۔ انہوں نے انگوٹھی اٹھالی۔ یہ انگوٹھی دیکھ کر کچھ حیران ہو گئے۔ یہ انگوٹھی تو ناجی کی اٹھکی سے اسی طرح لپٹی رہتی تھی جس طرح ان کے دل میں ناجی کا پیار۔

آج یہ انگوٹھی اس خنائی اٹھکی سے جدا کیوں کر ہو گئی۔

انگوٹھی اپنی اٹھکی میں اٹکا کر انہوں نے گھڑی دیکھی۔ تین بجنے کو تھے۔ بجہ درست کر کے وہ پھر لیٹ گئے۔

اٹھکی میں انگوٹھی کو یونہی اٹکا کر خالی خالی ذہن سے کچھ سوچتے ہوئے وہ ناجی کے غسل خانے سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔

انتظار بے سود تھا۔ ناجی کو نہ آتا تھا نہ آئی۔ گہرا کر طاہر نے کبیل الگ پھینکا اور مسہری سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند منٹ یونہی کمرے میں پھرتے رہے۔ سینے میں سنگین کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ گہرا بٹ سے جیسے دم گھٹا جا رہا تھا۔

”ناجی“ انہوں نے غسل خانے کے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر پکارا۔ آواز دیواروں سے گھرا کر لوٹ آئی۔

طاہر نے پھر پکارا۔

جواب نہ ملا۔

بے کئی بڑھ گئی۔ انہوں نے ہاتھ سے دروازہ دھکیلا۔ دروازہ کھلا تھا اور ناجی غسل خانے میں نہ تھی۔



پھر شب و روز کا چکر چلتا ہی گیا۔

ناجی کی تلاش میں طاہر نے زمین آسمان ایک کر دیئے۔

دیوانہ وار اسے ڈھونڈتے پھرے۔

لیکن

بے سود

لاحاصل

گھر والے بھی اس کی اچانک گمشدگی سے حیران تھے۔ دلوں میں اپنے مظالم سے چہنچہن بھی تھی۔ جاتے تھے کہ جو کچھ ہوا، انہی کی وجہ سے ہوا۔ لیکن ظالم ظلم کر کے پچھتانے لگے تو دنیا سے ظلم کا وجود ہی نہ مٹ جائے!

ناجی کی روپوشی کو اک نیارنگ دے کر اچھالا گیا۔ ”بھاگ گئی“ ہر پوچھنے والے کو یہی جواب دیا جاتا۔

”رہنے والی تھوڑا ہی تھی۔ ایسے لوگ ایک جگہ زندگی گزار دیں تو رونا ہی کس بات کا۔ جگہ جگہ کی چاٹ ہوتی ہے۔ کوئی اور شناسا مل گیا ہو گا جس کے ساتھ بھاگ چکی ہو“ گھر کے ہر فرد کی زبان پر یہی باتیں تھیں۔

لیکن یہ سب کچھ بالابالا ہوتا رہا۔ طاہر کے سامنے کسی کو کچھ کہنے کی مجال نہ تھی۔ ان کی حالت دیکھ کر تو ہر فرد اپنے آپ کو مجرم سمجھنے پر مجبور ہو جاتا۔ ندامت سے سر جھک جاتے۔

طاہر دن رات مرغ بسمل کی طرح تڑپتے رہتے تھے۔ ”ناجی ناجی“ ان کا رواں دواں ہنگامہ رہا تھا۔ نہ کھانے پینے کا ہوش۔ نہ تن بدن کی پرواہ۔۔۔ دن رات ناجی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اور یہ سرگردانی غم کی فراوانی سے مل کر ان کے حواس پر بری طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔ پانکھوں کی طرح چنچ چنچ کر ناجی کو آواز میں دینے لگتے۔ اپنی محبت کے واسطے دے دے کر اسے واپس آ جانے کو کہتے۔

دروازے پر کھڑے کاندھواں ممکن نہیں تھا۔

ناجی کہاں گئی۔ کیوں گئی؟ طاہر منتشر حواس سے بھی یہی باتیں سوچتے رہے۔ ناجی کی آنکھوں میں شبیہ کی تقویت تھی کہ وہ زندگی سے ہراساں ہو کر موت سے ہنگامہ ہونے لگی

ہے۔

لیکن

زندگی سے ہراسانی کیوں؟

طاہر کا پاش پاش دماغ اور تھکا ہوا زخمی ذہن اس سوال کا جواب نہ دے پاتا۔

لیکن ایک دن اتفاقاً انہوں نے سعدیہ اور فوزیہ کی باتیں سن لیں۔

”کاشٹا مٹل گیا۔ خود ہی دفن ہو گئی کہیں“ سعدیہ کہہ رہی تھی۔

”خود تو نہیں۔۔۔ ہمارے سلوک سے گھبرا کر بھاگ گئی۔۔۔ میں نے بھی تو قسم کھا

رکھی تھی، اسے مٹا کر ہی دم لوں گی۔۔۔ وہ وہ اذیتیں دیں۔۔۔ کہ بس۔۔۔“

”اور میں نے کیا کم دل کا غبار نکالا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تیک آکر ضرور فرار ہو جائے گی۔۔۔“

”لیکن وہ کئی کہاں۔۔۔ طاہر نے تو زمین آسمان ایک کر دیئے اس کی تلاش میں۔“

”ہماری بلا سے۔ جیتی ہے یا مر گئی۔۔۔ اپنا راستہ صاف ہو گیا۔“

”لیکن طاہر تو دیوانے ہو رہے ہیں۔۔۔“

”چند دنوں کی بات ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ طاہر کے قریب رہا کرو۔ غم غلط ہو جانے

کا۔ خود ہی راہ راست پر آ جائیں گے۔ شادی ہونے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اگر وہ کہیں سے پھر آدھکی تو۔۔۔!“

”توبہ کرو۔۔۔ پھر کہاں سے آئے گی۔۔۔ مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ ساٹپ بھی

مر گیا، لائچی بھی نہ ٹوٹی۔۔۔ یہی میں چاہتی تھی۔۔۔ تم طاہر کے قریب رہا کرو۔ یہ وقتی

صد مہ ہے بھول جائیں گے۔۔۔“

اور پھر ان دونوں کی باتوں میں حسن بانو اور حسن آراء بھی شریک ہو گئیں۔ ہر فرد

احتراف کر رہا تھا کہ ناجی اس کے رویے اور سلوک سے تنگ آکر روپوش ہوئی ہے۔ ہر

شخص اس کے فرار کی وجہ خود کو ثابت کر کے کامیابی کا سہرا اپنے سر لینا چاہتا تھا۔

طاہر نے سب کچھ سنا۔ ان کی تہ وبالا ہوتی ہوئی دنیا میں طوفان اٹھے۔ زلزلے

آئے۔ محشر پھا ہو گئے۔

لیکن

ان سب سے باز پرس کرنے سے پہلے ہی ان کی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ غم کی



شدت اور اس پر یہ انکشاف، طاہر کے حواس مختلف تو تھے ہی۔۔۔ اب بالکل ہی منتشر ہو گئے۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو گئیں۔ ناجی کے سوا انہیں کچھ بھی یاد نہ رہا۔ وہ پاگل ہو گئے تھے۔

سارا سارا دن گھاٹی میں پھرتے رہتے۔ ہر آپٹ پر انہیں ناجی کی آمد کا گمان ہوتا۔ وہ اٹھ کر بے تحاشا دوڑنے لگتے۔ درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ سے انہیں ناجی کے آدے کا، پھر پھر آتے آنچلوں کا خیال آتا۔ وہ اسے پکڑنے کو لپکتے۔

”ناجی۔۔۔ ناجی“ وہ دیوانہ وار چیختے لیکن چیخ سناتوں سے گھرا کر لوٹ آتی۔۔۔

ان کی حالت دیکھ دیکھ کر سب کے دل کٹے جا رہے تھے۔ ناجی کی گمشدگی کا وہ استاثر لیں گے، ان کے فہم و ادراک میں یہ بات نہ آئی تھی۔ ماں کی مامتا تڑپ تڑپ اٹھی۔ بھائی بہنوں کا پیار پھل پھل گیا۔ لیکن طاہر کی لٹی ہوئی دنیا آباد نہ ہو سکی۔

گھاٹی کے نشیب و فراز میں ”ناجی ناجی“ پکارتے پھرنے کے سوا انہیں کسی بات بوش نہ تھا۔

اس منحوس دن بھی وہ دیوانگی کے عالم میں چھوٹے بڑے پتھروں کو پھلانگتے ناجی کو پکارتے پھر رہے تھے۔ دو تین قریبی عزیز اور نوکران کی نگرانی کے لیے ساتھ ساتھ تھے۔ اچانک انہوں نے بڑے سے پتھر پر کھڑے ہو کر بازو پھیلادیتے۔ ”ناجی“ پورے جوش اور قوت سے چیختے ہوئے وہ پتھر سے کود کر نشیب کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن پاؤں الجھا۔

اور  
طاہر نگہداشت کرنے والوں کی پہنچ سے پہلے ہی لڑھکتے ہوئے گھاٹی کی کہرائیوں میں جا پہنچے۔

زخم اتنے شدید آئے کہ وہ جاہر نہ ہو سکے۔ اور انہی مہلکتی فضاؤں میں جہاں ان کی محبت نے جنم لیا، پروان چڑھی اور ارتقائی منازل طے کرتی کامرانی سے ہٹنا نہ ہوئی تھی۔۔۔ طاہر نے دم توڑ دیا۔

وفا کے نام پر مٹنے والوں کی داستان کی اتنی دلدوز اتہا۔۔۔ چلبٹے تھا کہ پس ماندگان کے لیے درس عبرت بنتی اور وہ ناجی و طاہر کی واحد یاد نگار صاعقہ کو سینے سے لگا کر رکھتے۔ لیکن

معاملہ اس کے برعکس تھا۔

اس سارے المیہ سانحے کو صاعقہ کی نحوست سے منسوب کیا گیا۔ نحوست تو یوم پیدائش ہی سے اس سے منسوب کی جا چکی تھی۔ اور پے در پے واقعات بھی کچھ اس طرح رو پڑ رہے تھے کہ اوہام پرست طبیعتیں اپنے خیالات کی تقویت پا رہی تھیں۔ اب طاہر کی جوانمردی نے تو صاعقہ کی نحوست کو ایسا منقش بنا دیا تھا جسے مٹانا ناممکن تھا۔

طاہر کی ناگہاں موت کا صدمہ تھیں سی جان کو کوس کوس کر بھلانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس اندوہ ناک غم کو مٹانے کے لیے معصوم روح کے ساتھ جارحانہ رویہ اختیار کیا جاتا۔

صاعقہ ماں باپ کی آغوش شفقت سے محروم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ گھر والوں کی نظرِ کرم سے بھی محروم ہو گئی۔ نظرِ کرم تو اس پر کبھی تھی ہی نہیں لیکن اب تو قلم کھلا اس پر قلم و ستم کے تیر بر سائے جاتے۔

صاعقہ کی ساری ہستی نحوست کے گھیرے بادلوں میں روپوش ہو گئی اور اس دن تو یہ بادل اور گھمبیر ہو گئے جس دن طاہر کے ماموں زاد بھائی بھلی کے چاروں سے چھو جانے سے ہلاک ہو گئے۔ شومی تقدیر صاعقہ کو اس دن پہلی بار ہی اس کی آیا اسکے ہاں لے گئی تھی۔

اب تو اسے تنہائی کی علامت اور خطرے کا عنوان سمجھا جانے لگا۔ کوئی اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ بچوں کو اس کے سایہ سے یوں پرہیزا جاتا جیسے وہ خوفناک اندھیروں کی



کوئی ایسی لہر ہو جو آنا فنا ہر سامنے آنے والے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

سعدیہ تو اس کی جان کی دشمن تھی۔ اپنے بچوں ریحان اور گل رخ کے ساتھ کبھی صاعقہ کو دیکھ لیتیں تو بچاری معصوم بچی کی شامت آجاتی۔ وہ زنانے دار تھپڑ پر ہانک دو پکڑا کر رہ جاتی خوبصورت بالوں کو پکڑ کر بھنجنے لگتی۔ اپنے بچوں کو انتہائی سختی سے منع کر دیتیں کہ وہ صاعقہ کے قریب نہ آئیں۔

یہ ممانعت ان کے ناچختہ ذہنوں میں صاعقہ کی غوست کے شفقوش گہرے کر دیتی۔ حسن آراء کا سلوک بھی ناروا تھا۔ اور جب سے بیوگی کے بعد وہ مستقل طور پر المراد میں اٹھ آئی تھیں۔ انہیں دل کے پھسولے پھوڑے کا بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔

دو سال یوں ہی گزر گئے عتاب کی چکی میں پستے ہوئے۔ بوڑھی آیا بھی صاعقہ سے بدظن تھی۔ پچھلے دنوں اس کا دوسرا لڑکا مرگ کی زد میں آجانے سے دائیں ہانگ کو بیٹھا۔ آیا بدظن ہو گئی۔ صاعقہ کو اک و بال اور بد شگنی کا جلتا ہوا نشان سمجھنے لگی۔ اس کی نگاہ اشت میں دائرہ تساہل برتتے لگی۔

یہ تو شاید صاعقہ کی خوش بختی تھی جو انہی دنوں ڈاکٹر جنید کی آیا نے صاعقہ کا ہا اپنے کندھوں پر اٹھانے کی پیش کش کی۔ ورنہ بعید نہ تھا کہ وہ بڑھیا اس تھکی سی بچی کا بھاری گھونٹ دیتی۔

تھی آیا صاعقہ کے لیے فرشتہ رحمت جلالت ہوتی۔ دیکھنے میں وہ جتنی ہی کریہ لگتی تھی دل کی اتنی ہی مسین تھی۔ سوختہ چہرہ نچا ہوا گوشت کھنچی ہوئی ایک آنکھ اور دوسری ہانگ سے لٹک کر پختے والی آیا شفتوں کے واسن پھیلنے آتی اور صاعقہ کی سیلت کا پتھر ڈول کشتی کو سنہرا سے دیا۔

اس نے اسے پریدہ دیا۔

پریدہ جس سے وہ محروم تھی۔ وہ اس کے لیے ماں باپ دوست عزیز سب کو گت گئی۔ اس کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کے لیے اس نے اپنی اتھک کوششوں کے باوجود ویٹہ۔

پریدہ کی گھر والوں کا رویہ اور ماحول اس نے پرکھ لیا۔ دوسری ضد مت گزاروں کی جگہ اس نے بچی سے دلالت غوست کے قصے بھی سنے۔ کنیزوں نے اسے ور غلایا۔ لیکن اس

نے کسی کی بات پر دھیان نہ دیا۔ صرف اسی بات کا خیال رکھا کہ صاعقہ اہل خانہ کی غلامانہ دست برد سے محفوظ رہے۔

لیکن

اس کی ساری کاوشوں کے باوجود صاعقہ گھر والوں کے لیے بد شگنی اور غوست کا جلتا ہوا نشان تھی۔ جب بھی موقع ملتا۔ اسے نفرت و حقارت کے تیروں سے پھلنی کرنے کی کوشش کی جاتی۔

آیا جتنی المیہ و راسے گھر والوں کی نظروں اور بچوں سے دور رکھنے کی کوشش کرتی۔ لیکن آخر صاعقہ بھی تو بچہ ہی تھی۔ پھر ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ کیونکر سب سے الگ تھلک رہ سکتی تھی۔ گو بچوں سے ملنے جلنے کی اسے ایسی کڑی سزا ملتی۔ اتفاقاً کوئی دوڑتے ہوئے گر جاتا یا کھیلنے میں کسی کا پاؤں پھسل جاتا تو صاعقہ کے کھنکھریالے بال بھنجنے لگتے جاتے۔ پھول سے رخساروں پر تھپڑ پڑتے اور وہ آبدیدہ آنکھوں سے اپنے اوپر اٹھنے والے ظالم ہاتھوں کو دیکھتی رہ جاتی۔ اس کا قصور کیا ہوتا وہ بالکل سمجھ نہ پاتی۔ انہی دنوں کی بات ہے۔

ریحان کی دسویں سالگرہ کا جشن تھا۔ ہر سالگرہ انتہائی کروفر کے ساتھ منائی جاتی۔ ریحان وادی کے چیمپیٹ اور خاندان کے پہلے پوتے تھے۔ اس لیے جشن عظیم الشان ہوا کرتا تھا۔

بال مہمانوں سے کچا کچا بھرا تھا۔ بچے رنگ برنگ لباس پہنے تھے۔ بڑوں نے بھی اپنے آپ کو بنائے ستارے میں خاص اہتمام کیا تھا۔ ہر فرد خوشی سے چمک رہا تھا۔ رنگ و نور کا سیلاب مندا تھا جیسے خوشیوں اور مسرتوں کے سوتے پھوٹ رہے ہوں۔

ریحان سفید کنبوب کی اپکن اور ٹوپی پہنے شہرلوں کی سی آن بان لپٹے سبز کے قریب کینک کاٹنے کو کھڑا تھا۔ خاندان کے بچے خوشنما لباس پہنے اس کے گرد جمع تھے۔ کینک پر دس موم بتیاں روشن کی گئیں۔ پھری ریحان کے ہاتھ میں تھامے ہوئے فوزیہ آگے بڑھی۔

فوزیہ اب طاہر کے چھوٹے بھائی فخر سے ریلہی جا چکی تھی۔ اور دو سال سمیر اس شادی کا اثر تھی۔

صاعقہ بھی اس حسین منظر میں کھابی فراک پہنے موجود تھی۔ کینک پر جلتی شمعیں



دیکھ کر چہار سالہ صاعقہ ریحان کے قریب آنے کی کوشش کر رہی تھی، جانے کیلئے جگہ ہٹا کر وہ ریحان کے دائیں طرف آکھڑی ہوئی۔

شور و غل اور گہما گہمی میں اس پر کسی گھر والے کی نظر ہی نہ پڑی ورنہ ایسے مبارک موقع پر تو اسے حتی المقدور نظروں سے اوجھل رکھا جاتا تھا۔

”بسم اللہ پڑھ کر شمع کو پھونک مارو۔“ فوزیہ ریحان سے بولی۔

”ہاں ہاں بسم اللہ کرو۔“ بسم اللہ، کئی مسرور آوازیں آئیں۔

”پھونک مارو۔“ داوی نے کہا۔

لیکن ریحان کے پھونک مارنے سے پہلے صاعقہ نے پھونک مار دی۔

دو شمعیں گل ہو گئیں۔ ریحان چیخ پڑا۔

”یہ کس نے پھونک ماری؟“ دو تین آوازیں یک وقت آئیں۔

”میں نے۔“ میں نے، ”معصوم صاعقہ نے تالیاں بجاتے ہوئے مسرور انداز میں کہا۔

”پڑیل“ سعدیہ بھوکی شیرینی کی طرح اس کی طرف لپکی۔

”تو کہاں سے آمری یہاں؟“ پلٹ کر فوزیہ نے اسے کندھے جھنجھوڑ کر پرے دیا۔ صاعقہ اونہ سے منہ گری۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔

داوی حسن بانو مشغول ہو کر اسے کوسنے لگیں۔ حسن آرا نے ڈانٹ کے القابے نوازا۔

مہمانوں کے دل اس بے دردی پر وہل گئے۔ کسی نے بڑھ کر صاعقہ کو اٹھایا۔

”چمکدار۔“

”چھوڑ دو جی اسے۔۔۔“ منحوس جانے کہاں سے آمری یہاں۔۔۔ ڈانٹ ہے ڈانٹ۔۔۔ چل اور دفع ہو جا۔۔۔ کہاں ہے۔۔۔ اس کی آیا۔۔۔ کم بخت نے عین موقع پر اسے یہاں بھیج دیا۔۔۔ دو شمعیں گل کر دیں۔“

”میرا تو دل دھک سے رہ گیا ہے۔“

”اللہ ہی فیہ کرے میرے بچے کی“

”صدقہ اتار دو لڑکے کا۔۔۔“

”بد بخت جانے کس وقت آئے ہو گئی یہاں۔“

”ڈانٹ۔۔۔“

”پڑیل۔۔۔“

”جی چاہتا ہے گلا گھونٹ دوں۔۔۔“

”ساری خوشی کر کر کر دی۔“

گھر کا ہر فرد صاعقہ کے خلاف زہرا گل رہا تھا کچھ تو ہم پرست مہمان خواہین بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں لیکن پڑھے لکھے اور روشن دماغ لوگ اس توہم پرستی پر زہر لب مسکرا دیے تھے۔ غریب بچی کے ساتھ بہیمانہ سلوک دیکھ کر وہ ششدر سے بھی تھے۔ اپنا ہی خون استہیہ کا نہ ہو سکتا ہے، یہ عجیب سی بات ہی تو تھی۔

صاعقہ کے شمع گل کرنے سے اچھا خاصا ہنگامہ مچا ہوا گیا تھا۔ انجم آرا اور فخرچا اس کی حمایت میں سب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فخرچا تو اپنی بیوی فوزیہ کی ناراضگی کے ڈر سے کچھ زیادہ نہ کہہ پائے۔ ہاں انجم آرا نے خوب خوب سنائیں۔

کافی دیر کے بعد ہنگامہ فرو ہوا۔ آیا کی بھی خوب شامت آئی۔ وہ بچی کو سینے سے لٹا کر ہال سے لے گئی اور پھر رات تک کسی نے صاعقہ کو بچوں کے ساتھ نہیں دیکھا۔

چھوٹے بڑے کئی واقعات اپنی لپیٹ میں لیے ماہ و سال گزرتے رہے۔ صاعقہ کا شعور سیدار ہوتا گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں نکمرے لگیں۔ ماحول کو پرکھنا آ گیا۔ وہ خود ہی سب سے الگ تھلک رہنے لگی۔ اداس۔۔۔ خاموش تنہا۔۔۔ وقت گزر گیا۔

المرء کی چھتوں تلے کھیلنے والے بچے چند سالوں کے پٹے میں جوانی کی رنگین حد و میں داخل ہو گئے۔ ریحان، اسد، فرح، نعیم، فرید، ماہ رخ، گل رخ، سمیرا، صاعقہ، شاہدہ، شینہ۔۔۔ سبھی چہستان شباب کے نوشیز پھول تھے۔ ان گھانے رنگین سے المرء مہک رہا تھا۔

خوش رنگ پھولوں نے البینلی سیلوں کے سہارے بھی ڈھونڈ لیے تھے۔ ریحان سمیرا میں دلچسپی لیتے۔ اسد گل رخ کے ساتھ اکثر نظر آتے۔ فرخ شینہ کے بغیر کسی کھیل میں حصہ نہ لیتے۔۔۔ نعیم شاہدہ کے گرد منڈلاتے رہتے۔

صاعقہ پر کسی کی حکاہ لطف و کرم نہ پڑی تھی۔ شروع ہی سے بچوں کے ذہن مسموم کر دیے گئے تھے۔ وہ اب تک صاعقہ سے مبہم سا خوف کھاتے تھے۔ حنفیہ بھی اپنی بچیوں میں مضبوط بنا چکا تھا اسے کوئی درخور استہیہ نہ سمجھتا تھا۔ گلہ لطف و کرم تو بڑی بات



تھی۔ وہ اکثر سب سے الگ تھلک رہتی تھی۔ کبھی کبھار سب سے مل بیٹھنا ہوتا بھی تو ہمیشہ انجام بد مزی ہوتا۔ یا تو اس کے ساتھ دبا دباہانت آمیز سلوک ہوتا یا کھلم کھلا اس کی نحوست کا قصہ دہرایا جاتا۔ وہ شکستہ دل ہو کر اٹھ آتی۔

کوئی اس کے دل میں جھانک کر زخموں کو دیکھنے کی کوشش نہ کرتا۔ کوئی اس کے جلتے ہوئے سینے میں آگ کی تپش محسوس کرنے کی پرواہ نہ کرتا۔ وہ اپنے کمرے میں گھٹی گھٹی آہیں بھرتی رہتی۔ یا ندی کنارے پانی میں ڈوبے ہوئے پتھر پر پاؤں لٹکائے اپنی زندگی کے سانچے پر غور کرتی رہتی۔۔

اور

جب سے نادانستگی میں اس کے احمق دل نے ریحان کی پوجا شروع کر دی تھی، زندگی اس کے لیے اور بھی بوجھل ہو گئی تھی۔ احساسات کے آبلینے کچھ اور بھی نازک ہو گئے تھے۔ ریحان ہی تو اس کی ذات سے سب سے زیادہ خائف و متنفذ تھے۔ اور پندرہ بیس سال گزر گئے۔ پورے بیس سال۔۔

۲۳

الحماء کے عقبی چمن میں بیڈ منٹن کھیلا جا رہا تھا۔ فرخ اور گلرخ، سمیرا اور ریحان کے مقابل تھے۔ باقی نوجوانوں کی پارٹی داد دینے اور شور و غل سے کھیل کا حسن دوہلا کرنے میں مصروف تھی۔

موسم انتہائی خوش گوار اور صحن چمن میں ان جیتے جاگتے پھولوں سے بہار نکھری ہوئی تھی۔

سمیرا اور ریحان برابر جیت رہے تھے۔ گلرخ اور فرخ جھنجھلا رہے تھے۔ دیکھنے والے آواز سے بھی تو کس رہے تھے ان پر۔۔۔ جھنجھلاہٹ حق پرست ہی تو تھی۔ ”پہلے کھیلتا سیکھو۔ پھر ہمارے مقابلے پہ آنا۔“ ریحان نے چوٹ کی۔ گلرخ فرخ سے الجھ پڑی۔۔ ”ٹھیک طرح سے کھیلیں نا۔۔ نہیں تو ریکٹ کسی اور کو دے دیں۔!“

”کھیلتا خود نہیں آتا۔۔ دوش مجھے۔۔ اس دفعہ کیم جیتے جیتے روکٹی محض تمہاری وجہ سے۔۔“

گلرخ نے غصے سے ریکٹ پھینک دیا۔

”بس۔ ہار گئیں؟۔۔ غصے میں ہار چھپانا چاہتی ہیں۔۔“  
”لیکن ایسے کون چھوڑے گا۔۔ بزدلوں کی طرح میدان نہ چھوڑو۔“  
”ریکٹ سنبھالو۔۔“  
”مقابلہ کر کے دکھاؤ۔“

گلرخ نے پھر ریکٹ اٹھایا۔ سب اسے اشتعال جو دار رہے تھے۔ فرخ بڑبڑاتے ہوئے اوشی جگہ پہ آئے۔

کھیل شروع ہوا۔ ریحان شوخ شوخ فخر سے کس رہے تھے۔ گلرخ سب سے پٹاری



تھی۔ غصے میں وہ تیز تیز کھیل رہی تھی۔

سمیرا اور رحمان مشاق تھے۔ گلرخ کا ہر وار بچار ہے تھے۔ کھیل بہت زوردار تھا۔

ایک وار بچاتے بچاتے سمیرا کا پاؤں الٹ گیا۔

”آہ۔۔“ وہ گر گئی۔۔

سب اس کی طرف دوڑے۔ رحمان نے ریکٹ پھینک دیا اور جلدی سے اس کی طرف بڑھے۔

”کیسے گریں؟“

”چوٹ تو نہیں آئی؟“

”گلرخ نے بد وعادی ہوگی۔“

”موج نہ آئی ہو۔“

”اس طرح لپکنے کی کیا ضرورت تھی؟“

سب سمیرا کے گرد جمع تھے۔ کوئی کھڑا تھا۔ کوئی گھٹنوں کے بل جھکا تھا۔ وہ درمیان میں گھری اپنے دابنے پاؤں کو بار بار سہلارہی تھی۔

شاہدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

”اوئی۔۔“ وہ کچھ اٹھی لیکن پھر بیٹھ کر پیر کو پکڑ لیا۔

”دو قدم چلو۔ کہیں موج نہ آگئی ہو“ رحمان نے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔ سمیرا نے جلدی سے پاؤں کھینچ لیا۔

”اٹھو نا!۔“ فرخ نے کہا۔

شاہدہ اور گلرخ نے مل کر اسے اٹھایا۔ لیکن وہ پاؤں پر دباؤ نہ ڈال سکی۔

”دو قدم چلو نا“

”نہیں چلا جاتا۔“

”معمولی بات ہے۔ چوٹ دوٹ کچھ نہیں آئی۔“

”ہو نہ۔۔“ اتنا درد ہو رہا ہے۔۔ پاؤں زمین پر رکھا ہی نہیں جاتا۔“

”نہیں کھڑی رہوگی۔ اس بیچ تک تو چلو۔“ شاہدہ نے کہا۔

”نہیں چلا جاتا۔ نہیں چلا جاتا۔ نہیں۔۔!“ ہنسنے لگا کر پیچنی۔

”واقعی موج نہ آگئی ہو“ فرخ نے جھک کر اس کے پیر کو مٹولا۔

”کمرے میں لے جا کر ہی کوئی چارہ ہو گا۔“

”ڈاکٹر کو دکھا دیں۔۔“

”ضرور۔۔“

”کمرے تک تو چلنا پڑے گا۔“

”لیکن وہ تو پاؤں زمین سے لگا ہی نہیں رہیں۔“

”میں اٹھا کر لے چلوں۔“ اسد نے پیش کش کی۔

سمیرا الجا گئی۔

”میرے بازو پر بار ڈال لو۔ میں لے چلوں گا“ رحمان نے بازو بڑھایا۔ سمیرا شرما گئی۔

”اوہو۔۔“ رحمان نے بازو سمیٹ لیا۔

”کوئی اور تہدیر کریں۔“

”یہ لیجئے“ فرخ نے بڑھ کر سمیرا کو اٹھایا اور اس کے احتجاج کے باوجود اٹھا کر کمرے میں لے گئے۔ سمیرا کے گرنے کی خبر سن کر سب اس کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ سب یوں تشویش کا اظہار کر رہے تھے جیسے کوئی بہت ہی بڑا حادثہ ہو گیا ہے۔ سمیرا کا معاملہ تھا نا؟ لاڈلی جو تھی گھر بھر کی۔

”صبح بھی غسل خانے میں پاؤں پھسلا تھا۔“ سمیرا ناز و ادا دکھا رہی تھی۔

”دوسری بار گری ہو؟“ دادی نے پوچھا۔

”جی“

”اللہ جانے کس کام نہ دیکھ کر اٹھی تھی صبح“ فوزیہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”صاعقہ کا۔“ رحمان نے تمسخر اڑایا۔

”واقعی؟“ کسی نے پوچھا۔

”ہاں“ سمیرا اٹھلائی۔

صاعقہ دادی اور چچی کے خوف سے سمیرا کو دیکھنے آئی تھی۔ رحمان کا تمسخر سن کر اسکی روح تک جل اٹھی۔ موقع پاتے ہی وہاں سے کھسک گئی۔ رحمان نے اسے دیکھا تھا لیکن اپنے الفاظ سے ندامت محسوس کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔



اس رات نوجوان پارٹی سمیرا کے کمرے میں جمع تھی۔ پاؤں میں موچ تو نہ آئی تھی۔ اپنے ہی بوجھ سے ڈراؤب گیا تھا۔ اور جانے اس دن سمیرا واقعی صاعقہ کا منہ دیکھ کر انہی تھی یا اس واقعے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے بات بنالی تھی۔ اس وقت بھی زیر بحث موضوع صاعقہ کی نحوست ہی تھا۔

سمیرا اور ریحان اسے منحوس ثابت کرنے میں پیش پیش تھے۔ اکثریت ان کی ہم نوا تھی۔ لیکن اسد صاعقہ کے طرف دار تھے۔ شاید اپنی والدہ انجم آرا کی تربیت کا اثر تھا یا کچھ خوفِ خدا تھا دل میں یا ہو سکتا ہے یہ وجہ ہو کہ انکے بچپن کا زیادہ حصہ الحمراء سے پہر گزرا تھا۔ وہ اکثر اپنے ساتھیوں کی تنگ نظری پر انہیں برا بھلا کہا کرتے تھے۔ صاعقہ سے انہیں ہمدردی تھی اور دن بدن یہ ہمدردی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ شاید، نعیم اور فہم بھی ان کے ہم نوا بنتے جا رہے تھے۔ لیکن سمیرا اور ریحان تو ان کی سرزنش سے اور ہر جاتے تھے۔

”یہ سب تو ہم پرستی ہے۔۔۔“ اس نے تنگ آ کر کہا۔

”تو ہم پرستی کیسی واقعات شاہد ہیں۔۔۔“ ریحان نے جلدی سے کہا۔  
”بس دن پیدا ہوئی، اسی دن دادا جان فوت ہو گئے“ کلرنگ نے واقعہ دہرایا۔  
”یہ محض اتفاق تھا۔ وہ بیمار تو اک عرصے سے تھے۔“ اسد نے جواب دیا۔  
”گوئی ایک بات تھوڑا ہی ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد پھوپھا جان کا ہوائی حادثے میں انتقال ہو گیا۔“

”یہ بھی صاعقہ ہی کا قصور ہوا۔۔۔؟“ اسد نے طنز یہ کہا۔

”روٹی کے گوداموں میں آگ لگ جانے سے کئی لاکھ کا نقصان بھی تو ہوا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے۔۔۔“

”یہ بھی صاعقہ کی وجہ سے ہے؟“

”تو اور کیا۔۔۔ جب سے پیدا ہوئی ہے۔ نحوست ہی نحوست پر سانی ہے۔۔۔“  
”مگر ہو گئی تو ہم پرستی کی۔۔۔“ اسد بولے ”میرا ان ہوں کہ آپ سب پر شہ لکھ کر بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ نانا بابا فوت ہو گئے، قصور صاعقہ کا۔۔۔ خالو جان کو ہوائی حادثہ پیش آیا، موردِ خطاب صاعقہ۔۔۔ روٹی کے گوداموں میں آگ لگ گئی، الزام صاعقہ

”جو کچھ بھی ہے۔۔۔ ہے تو حقیقت۔۔۔ اس کی پیدائش سے لے کر اب تک سینکڑوں کیا ہزاروں سانحے گزر چکے ہیں۔۔۔“  
ریحان تفصیلاً ان سانحوں کو دہرانے لگے۔

”ایک بات پوچھوں؟“ اس نے ریحان کی بات کاٹ کر کہا۔  
”ہوں۔“

”ان بیس اکیس سالوں میں سانحے ہی سانحے ہوتے رہے؟“  
”کیا مطلب۔۔۔؟“

”الحمراء میں کسی خوشی۔۔۔ کسی خوش گوار واقعہ نے جنم نہیں لیا؟“  
”کیوں نہیں۔۔۔“

”جب یہاں خوشیوں کے سوتے پھوٹے، اس وقت صاعقہ کی نحوست اثر انداز کیوں نہ ہوئی۔۔۔ شیخ پور والی اراضی کا فیصلہ بھی تو نانا جان کے مرنے کے صرف ایک ماہ بعد ہوا تھا۔ صاعقہ ان دنوں اسی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ جاگیر کے سارے جھگڑے بھی تو سال بعد طے ہو گئے تھے۔ اور پھر باغوں سے کتنا منافع ہوا تھا۔ اور وہ بڑے ماموں جان کا کاروبار کب چمکا تھا۔ یہ بات بھی تو صاعقہ کے ہوتے ہوئی تھی۔ اور۔۔۔!“

اسد نے اک لمبی چوڑی فہرست واقعات کی بیان کر دی۔ ریحان دل میں معترف تو ہوئے لیکن زبان سے اعتراف کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرتے تھے۔ بچپن ہی سے احساس کی آنچ ذہنوں کو اس طرح دی گئی تھی کہ اس کا اثر دن بدن پختہ ہوتا چلا گیا تھا۔ اسد کے دلائل سے متفق ہونے کے باوجود اس بات کو مانتے کے لیے ریحان اور ان کے حواری تیار نہ تھے۔

”آپ جو کچھ بھی کہیے، ہم تو اپنے تجربات کی بنا پر اس حقیقت کو ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ مجسم نحوست ہے۔۔۔“ سمیرا پلٹک پر لیٹے لیٹے بولی۔

”بس دن صبح ہی صبح اس سے سامنا ہو جائے، سارا دن پریشانی میں گزر جاتا ہے۔“  
”فٹ بولے۔“

”واقعی۔۔۔ میں تو شوئی تنقید سے جس دن اسے صبح ہی صبح دیکھ لوں بس سارا دن



طبیعت بد مزہ رہتی ہے۔ دل میں دھڑکا ہی رہتا ہے کہ اب کوئی سانحہ پیش آیا۔  
آیا۔۔۔! رحمان بولے۔

”یہ سب تمہارے ذہن کی پیداوار ہے۔ سوچنے کے ڈھنگ بدل لو تو کچھ بھی نہ ہو گا۔“ رحمان ہنس دیئے۔

”ہنسنے کی بات نہیں رحمان۔۔۔ ذرا اس کی جگہ اپنے آپ کو رکھ کر سوچو۔۔۔ کس قدر ناروا سلوک ہوتا ہے، بچاری لڑکی سے۔ کتنی اداس رہتی ہے۔۔۔ کیا اس کے سینے میں دل نہیں۔۔۔ دل میں جینے کا ولولہ نہیں، اتنے بھرے کنبے میں وہ تنہا ہے۔“

”اس کی تنہائیاں مٹا دو میرے دوست“ رحمان نے ازارو تمسخر اسد کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

سب نے ملا جلا قبچہ لگایا۔

”اس کی اداسیاں مٹا دو۔۔۔ خاموشیوں کا ظلم توڑ دو۔۔۔ کہو۔۔۔ کہو منظور ہے۔“ اسد چپ ہو گئے۔ سب کھٹکھٹا کر ہنس دیئے۔

گھر سے بچپن ہی سے متاثر تھے۔ اور اب تو کلرخ زندگی میں بہادر بن کر بھارتی تھی۔ اسد نے صاف کے متعلق اس رنگ میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس سے بعد وہ ضرور تھی لیکن بعد رومی محبت کی اساس نہ تھی۔

”چپ کیوں ہو گئے استاد“ رحمان نے پھر چھیڑا۔

”بڑی حمایت کر رہے تھے نا۔“ فرخ نے چوٹ کی۔

”میں تو اک حقیقت کو آپ سب کے ذہنوں سے روشناس کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بات کا رخ آپ سب نے غلط طرف پھیر دیا۔۔۔“ اسد خفیف سے ہورہے تھے۔

”حقیقت ہم سب جانتے ہیں۔ اس کی پیدائش سے لے کر اب تک کئی۔۔۔“

رحمان جوش میں اُگر بولے لیکن اسد نے بات کاٹ دی۔

”سب محض اتفاق ہے رحمان۔۔۔ اور کچھ نہیں۔۔۔ صاعقہ اگر پیدا نہ ہوتی تو ناٹا لہکی موت نہ آتی۔ یا وہ فطمانی حادثہ رک جاتا۔۔۔ یا۔۔۔!“

”صاعقہ کی پیدائش کے بعد پیدائش کا سلسلہ بند تو نہ ہو گیا تھا۔ صرف دو سال۔۔۔ سمیرا تولد ہوئی تھیں۔۔۔ شاید اس سے تقریباً تین سال چھوٹی ہیں۔ عام چار سال اور ہمارے

سات سال ہوتا ہے۔۔۔ حیران ہوں کہ پلے درپلے جو واقعات غور و پند ہوتے رہے

انہیں صاعقہ ہی کی ذات سے کیوں منسوب کیا گیا۔ باقی کسی کا اس ضمن میں کیوں نام نہیں لیا جاتا۔۔۔ حالانکہ امی نے بتایا ہے کہ جب المراء کی پچھلے کمرے کی چھت گرنے سے نانی جان کے کولے کو ضرب آئی تھی، ان دنوں سمیرا چند دنوں کی تھی۔ جب نانی جان کی بہن فوت ہوئی، عامر دوماہ کے تھے۔۔۔“

اسد نے پھر اک لمبی تفصیل گنوا دی۔ سب چپ سے ہو گئے۔ کافی متاثر بھی نظر آرہے تھے۔ محفل کا رنگ بدلتا دیکھ کر فرخ بولے ”ہم تو سیدھی سا جی بات جانتے ہیں۔ قصور اس بچاری کا نہیں۔ اس کا نام رکھنے والوں کا ہے صاعقہ۔“ وہ ہنسے۔

”بھلی“ سمیرا نے طنز پر چوٹ کی۔

”بھلی۔۔۔ جہاں گری بحسم کر ڈالا“ رحمان نے مذاق اڑایا۔

”واقعی۔۔۔ میں تو جب اسے دیکھتا ہوں رگ و پے میں سنسنیٹ سی ہونے لگتی ہے۔“ فرخ نے جسم کو سکیر کر اس انداز سے ڈھیلا چھوڑا کہ سب ہنسنے لگے۔

”دیکھو تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ بھلی کی لہر سی چلی آ رہی ہے۔“ رحمان نے کہا۔

”جھنجھٹ سی ہونے لگتی ہے دیکھتے ہی۔۔۔ صبح صبح دیکھ لیں تو سارا دن بد منگی میں گزرتا ہے۔“

طنزو تمسخر کے تیر برسانے گئے۔ اسد نے بڑی کاوش سے جو حقیقت منوانے کے لیے میدان ہموار کیا تھا۔ سب نقشش بر آب ثابت ہوا۔ واقعہ ان دنوں کو منتوں میں صاف کر دینا ممکن کہاں تھا۔

کمرے کے اندر قہقہے برس رہے تھے۔ طنزو تمسخر سے طبیعتوں کو نکھارا جا رہا تھا۔

اور

کھڑکی سے لگی کوئی اداس روح ان تیروں سے گھاٹل ہو رہی تھی۔

صاعقہ سب کچھ سن رہی تھی۔

کسی سے کلمہ نہ تھا اسے۔

ہاں

رحمان کی زبانی اپنے متعلق ایسے کلمات سن کر اس کی مضطرب روح تڑپ تڑپ اٹھی تھی۔



سارا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ پھر بھی آنکھوں میں امنڈنے والے ساون  
بھادوں کے بادل برستے ہی جا رہے تھے۔ حسین سیاہ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔  
وہ دیر سے رو رہی تھی۔ کانوں میں پگھلتے ہوئے گرم گرم سیسے کی طرح فوزیہ کے  
الفاظ اب بھی ٹپک رہے تھے۔

”ماں تو ساری عمر گھر سے اٹھاتے مر گئی۔ بیٹی اتنی نازک ہے کہ چائے کی پیرلی نہیں  
اٹھاتی جاتی۔۔۔“

کتنا بڑا طعنہ دیا فوزیہ چچی نے۔۔۔ سب کی موجودگی میں۔۔۔ سب کے سامنے اس کی  
کتنی بے عزتی ہوئی تھی۔ صاعقہ کا خون ایک دم اس طرح کھول اٹھا تھا کہ چند لمحے اگر اور  
یہی کیفیت رہتی تو اس کی دماغی نسیں یقیناً پھٹ جاتیں۔  
اس طعنے پر سرزنش کرنے کی بجائے سب کے چہروں پر مسخراہ مسکراہٹ بھی تو  
بھیل گئی تھی۔

اف وہ جلتی ہوئی طنز پر مسکراہٹ۔

صاعقہ اس زہر آلود طنز بھری مسکراہٹ سے اپنی روح میں شکاف محسوس کر رہی  
تھی۔ کاش ماں باپ کے ساتھ اسے بھی موت آگئی ہوتی۔ اس روز کی موت کا سامنا کتنا  
دشوار تھا۔ اس جلتے بھنم میں رہتے ہوئے وہ تنگ آچکی تھی۔  
بے رحم باتیں!

اپانت آمیز سلوک!

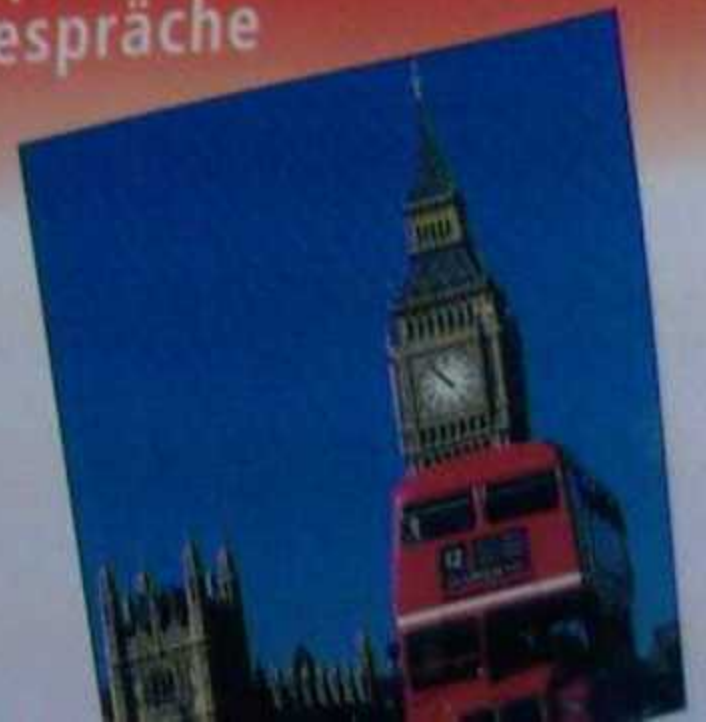
آخر وہ بھی تو انسان تھی۔ گوشت پوست کی بنی ہوئی۔ سینے میں دل بھی تھا ہو  
انسانیت کی آغے رکھتا تھا۔

آج فوزیہ چچی نے کس طرح اس کا سینہ پھلانی کیا تھا۔ کوئی بہرہ رو بھی تو نہ تھا ہو ان

Englisch

# Englisch

Nützliche Wörter  
Typische Redewendungen  
Gespräche



Sprachführer für die



زخموں پر پھایا رکھ دیتا۔ اگر کسی نے دل میں کسک محسوس بھی کی ہو تو دادی کی موبہ کی  
میں اقبال چہ روی کی جرأت نہ ہو سکی۔

آج سہ پہری کا تو واقعہ تھا۔

دادی اماں کے حکم پر چائے بیرون چمن میں پی گئی تھی۔ موسم رومانوی حد تک  
حسین تھا۔ پچھلے پہر کی زود دھوپ آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کی وجہ سے کچھ بیمار سی  
منظر آتی تھی۔ مضحک۔۔۔ نحیف۔۔۔ کمزور۔۔۔ دھوپ بڑی دلکش تھی۔

درختوں کی چھاؤں تلے چائے کی میزیں سجی تھیں۔ کنیزیں چائے کی کشتیاں لا کر رکھ  
گئی تھیں۔ ایک طرف دادی حسن بانو کے قریب سعدیہ، فوزیہ اور حسن آرا بیٹھی تھیں۔  
ڈراپٹ کرکین کی رنگ برنگی کرسیوں پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خوش گپیوں میں  
مصروف تھے۔ سمیرا نے شوخ رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے جو موسم اور چمن کی  
مناسبت سے دلکش منظر آرہے تھے۔ اس کا حسین چہرہ ٹکھرا ٹکھرا سا تھا۔ باقی لڑکیوں نے  
بھی رنگ برنگے لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ شوخ شوخ بھڑکیلے لہنگوں کے بعد  
زرب۔ پھیلاؤ اور رنگیں آنچلوں کی سمٹی سکڑتی اڑانیں چمن کی فضا کو فردوسی تاثر بخشی  
رہی تھیں۔ سفید لباس میں صاعقہ ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اس کا ملوکوتی حسن ک  
اشرفی کشش لیے ہوئے تھا چہرے پر پھیلی ہوئی دائمی اداسیاں بادلوں کی ہلکی سی تہ کی  
طرح تھیں جو پورے چاند پر چھا کر اس کی دلکشی میں اور اضافے کا باعث بن جاتی ہیں۔  
سلگتا ہوا حسن بھی قیامت اٹھا سکتا تھا۔ لیکن کسی کو اس کی طرف دھیان دینے کی ضرورت  
ہی کیا تھی۔ سمیرا کے گرد سب منہ لارہے تھے۔ اسے بھلا کون پوچھتا۔

بینک ہنسیاں دادی حسن بانو سے مرعوب تھیں۔ لڑکیوں کے خواہ مخواہ ہنسنے،  
انہیں غصہ آجاتا تھا۔

چائے بنانے کی ذمہ داری صاعقہ پر آئی۔ دادی نے حکم دیا تھا۔ اور اس حکم سے  
سر تابی کی اسے مجال کہاں تھی۔

اس نے چائے بنائی۔ ٹینے نے بڑھ کر اسکا ہاتھ بٹایا۔ وہی تو تھی جو دل میں صاعقہ  
کے لیے اکثر جہ ردی کا بند پاکر بے چین ہوا کرتی تھی۔ بڑوں کو چائے دینے کے  
صاعقہ نے نوجوان پارٹی کی طرف رجوع کیا۔  
لہجہ۔۔۔ فریاد۔۔۔ ٹکڑا اور فرش کو پیالیاں دینے کے بعد وہ پیالی لیے سمیرا کی طرف

بڑھی۔

شوخی لہنگے کو سبزے پر پھیلائے سمیرا اک ساختہ شان دلربائی سے کرسی پر نیم دراز  
سی تھی۔

صاعقہ نے پیالی بڑھائی۔

سمیرا نے اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے اک شان استغناء سے ہاتھ بڑھایا۔ صاعقہ سے بری  
طرح پیش آنے اور اہانت آمیز سلوک کرنے میں سمیرا نے ہمیشہ پیش قدمی کی تھی۔  
شاید ماں کی تربیت کا اثر تھا یا دادی کے لاڈ پیار کا یا اپنی ذات میں رجحان کی دلچسپی کا۔  
بہر حال وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی تھی۔ بہت کچھ۔۔۔ صاعقہ اس کی نظروں میں کیا  
وقت پاسکتی تھی۔ مغرور سی لڑکی صاعقہ سے سیدھے منہ بات کرنا بھی اپنی شان کے  
خلاف سمجھتی تھی۔

صاعقہ نے پیالی اور آگے بڑھائی۔

سمیرا نے نازک ہاتھ اور نزاکت سے بڑھایا۔

اور

عین

اسی وقت

رجحان مسکراتے ہوئے درختوں کے عقب سے یوں نکلے جیسے ٹھمبیر بادلوں کے  
ہٹ جانے سے چودھویں کا چاند نکل آیا ہو۔

سمیرا اور صاعقہ کی بیک وقت ہکا بکا ان پر پڑی۔

صاعقہ کی نظروں کو منظر انداز کرتے ہوئے۔۔۔ رجحان نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ان  
کے لبوں کا تجسم کچھ اور گہرا ہو گیا۔

اور

جانے

سمیرا اس تجسم سے لہرائی  
یا

صاعقہ ہکا بھوک کی بے دردی کا نگہ سے کانپی  
پیالی پکڑنے اور پکڑانے کے درمیان درمیان الٹ گئی۔



گرم گرم چائے صاعقہ کا ہاتھ جلاتی سمیرا کے ہاتھ پر گری اور پیالی لہنگے کے پھیلانے پر پھسلتی گھاس پر جا گری۔

”آہ!۔۔“ سمیرا تڑپ کر چیخنی۔

”اف۔۔“ اک ہلکی سی چیخ صاعقہ کے ہونٹوں پر تھرائی۔

ریحان لپکے۔۔ شاہرخ دوڑی۔۔ نعیم بڑھے۔۔

”کیا ہوا۔۔ کیسے گری چائے؟۔۔“ کئی زبانیں استفسار کر رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد سارا ہجوم سمیرا اور صاعقہ کے گرد تھا۔

ریحان سمیرا کا نرم و گداز ہاتھ اپنے رومال سے پونچھ رہے تھے۔ سمیرا ضرورت سے زیادہ ہائے والے کر رہی تھی۔

صاعقہ کا ہاتھ جل گیا تھا لیکن وہ دم بخود تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے وہ اپنی تکلیف کو چھپانے کی کوشش میں تھی۔

”کیسے کرائی تھی چائے؟“ فوزیہ بیٹی کا ہاتھ دیکھ کر پھری۔

”اتنی بے احتیاطی۔۔“ سعدیہ بولی۔

”وہ خود کہیں ہوتی ہیں۔۔ دماغ کہیں۔۔ ان سے چائے بنوانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔“ ریحان سمیرا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے غصے سے بولے۔

”اس لڑکی سے کبھی ڈھنگ کا کام تھوڑا ہی ہو گا۔“

”جو کام بھی کرے گی عجب لاپرواہی سے۔“

”نزاکت تو دیکھو اتنی سی پیالی اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔“

”جان بوجھ کر کرائی ہو گی۔“

داوی، چینیائیں اور پھوپھی زہر کے تیر بر سار ہی تھیں۔ صاعقہ سب کے درمیان ہجر کی طرح کھڑی تھی جسے موقع واردات پر ہی پکڑ لیا گیا ہو۔

”دیکھو ہاتھ پر آبلے تو نہیں پڑ گئے“ سعدیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”دوائی لگا دو۔۔“

”جانور ریحان دیکھ کیا رہے ہو۔ دوائی لا کر لگا دو۔ کہیں آبلے نہ پڑ جائیں۔“

ریحان دوائی لینے کے لیے چلے گئے۔

طنز کے تیر پھر سنے لگے۔

”اس کا اپنا ہاتھ بھی تو جل گیا ہے“ شینہ نہ رہ سکی۔

”دکھاؤ تو۔۔“ شہادہ نے کہا۔

لیکن صاعقہ اسی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے کو دبائے گنگ سی کھڑی رہی۔ البتہ اتنے ہجوم میں۔۔ بے رحم ہجوم میں شینہ اور شہادہ کی ہمدردی سے اس کا دل بری طرح بھر آیا۔

آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح اس کے صبیح و ملیح رخساروں پر پھیلنے لگے۔

”رونا بڑی جلدی آ جاتا ہے۔ ایک تو قصور کیا، اس پر یہ آنسو۔۔“ سعدیہ نے ناک بھونچڑھائی۔

ریحان دوائی لے آئے۔

روٹی سے سمیرا کے ہاتھ پر لگا دی۔

”یہاں بازو پر بھی لگا دو۔“ فوزیہ نے کہا۔ اور پھر بڑبڑائی۔

”سارا داغ پڑ جائے گا۔ کم بخت نے کرائی جانے کیسے۔ اتنی نازک اندام

ہے۔۔ ماں تو ساری عمر کھڑے اٹھاتے مر گئی۔ بیٹی اتنی نازک ہے کہ چائے کی پیالی اٹھائی نہیں جاتی۔“

صاعقہ کا خون اس طنز سے کھول اٹھا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ اک منظر اس نے اپنے گرد و پیش ڈالی۔۔ فوزیہ کے طنز پر تنقیر یا سبھی چہرے مسکرائے تھے۔

”اف“ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

یہ تنقیر

یہ تہلیل۔۔

کانوں پر ہاتھ رکھے وہ ایک دم ہلٹی۔۔

اور

تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔

جب سے اب تک وہ رو رہی تھی۔

آپا نے اپنے پیار کی شفقتوں سے کئی بار اسے چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن وہ مسلسل رونے جا رہی تھی۔

استاد بڑا طعنے اور وہ بھی ریحان کی موجودگی میں وہ کیوں کر برداشت کر لیتی۔



تھا سادل کتنے مصائب برداشت کر لیتا۔  
 وہ رو رہی تھی۔ روئے جا رہی تھی۔ ساری زندگی آنسو بن کر ختم ہو جانا چاہتی تھی  
 شاید۔۔۔  
 ہاتھ کی جلن سے کہیں زیادہ اس کے سینے میں جلن تھی۔ اس کی روح میں جلن تھی۔  
 آہ بے چاری۔۔۔ مظلوم سی لڑکی۔۔۔

شوخی و شنگ پھول اور لچیلی شرمیلی کلیاں حسن بانو کی پھلواری میں مہک رہی  
 تھیں۔ بہار جو بن پہ تھی۔ حسن بانو کو اس پھوٹے جو بن کا پوری طرح احساس تھا۔ اسی  
 لیے چاہتی تھیں کہ رنگ و بو کی مناسبت سے پھولوں اور کلیوں کو ابدی بندھن میں باندھ  
 دیں۔ انجم آرا بھی اسی سلسلے میں ان دنوں آئی ہوئی تھیں۔

حسن بانو کی نشست گاہ میں رازدار محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔۔۔ تقدیر کی گریں  
 لگانے کے متعلق سوچ بچار جو ہوتا تھا۔

اس دن بھی اک ایسی ہی محفل منعقد تھی۔ حسن بانو کسی مطلق العنان فرمانروا کی طرح  
 اک ٹکنت سے مسند پر بیٹھی تھیں۔ دائیں طرف حسن آراء اور سحر یہ تھیں سامنے فوریہ  
 بیٹھی تھی۔ اور پشت کے تکیے پر کہنی ٹکائے انجم آراماں کے قریب تر تھیں۔  
 رشتوں، ناٹوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کئی پچھلے قصے جگائے جا رہے تھے۔ شادیوں  
 کی دھوم دھام کا تذکرہ تھا۔

تقدیروں کے فیصلے ہو تو چکے تھے۔ اب صرف حسن بانو کی مہر جیت ہونا باقی تھی۔  
 بھوں کے رجحان کو مد نظر رکھتے ہوئے گریں لگانا جا رہی تھیں۔

”مکملر تو میری بیٹی ہے“ وہ اسد کے لیے انجم آرا نے مانگ لی۔  
 ”نعیم اور شاہدہ کی جوڑی ماشاء اللہ خوب رہے گی۔ میں نے تو پیدا ہوتے ہی  
 نسبت کر دی تھی شکر ہے اللہ کا، میرا خیال کامیاب نکلا۔“ حسن بانو بڑی ٹکنت سے  
 بولیں۔

”امی“ حسن آرا نے شوخی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔  
 ”ہوں“

”آپ نے اپنے لاڈلے کے متعلق تو کچھ فرمایا ہی نہیں۔“





”رحمان کے متعلق“

”جی“

”وہ تو طے شدہ بات ہے۔“

”کس سے؟“

”اب بنتی کس لیے ہو۔۔۔ سمیرا اور رحمان کا جوڑا ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہو گا۔“

”ماشاء اللہ ماشاء اللہ“

”رحمان تو ماشاء اللہ پچیس سال کے ہو بھی چکے۔ اس سال اس کا خیرے فارغ ہو

جی جانا چاہیے۔“

”انشاء اللہ اس عید پر ان کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے گا۔“

”ایک پنتھ دو کاج۔“

”وہ کیوں“

”عید کے جشن پر“

”توبہ کرو۔ اپنے بچے کی منگنی کا وہ شاندار جشن مناؤں گی کہ سب یاد کر سکیں گے۔“

عید پر میرا مطلب تھا اس چاند میں۔۔۔“

”تو یہ بات ہے۔“

”ہونا ہی چاہیے۔“

”خاندان کے پہلے پوتے ہیں۔“

”اور دادی کے نور منظر بھی۔“

رحمان کی نسبت کے متعلق کافی باتیں ہوتی رہیں۔ فوزیہ تو خوشی سے جیسے پہلے

سامری تھی۔ سعدیہ بھی کچھ کم خوش نہ تھی۔ ارادہ تو دونوں بہنوں کا شروع ہی سے تھا

لیکن چپ تک ساس کی مہر تصدیق ثابت نہ ہوتی، انہیں پورا یقین اور خوشی نہ تھی۔

انجم آرا بھی اس خوشی میں برابر کی شریک تھیں۔ اپنے ہی بچے بچیاں تھیں۔ خوشی

کیوں کر نہ ہوتی۔ لیکن اس گہما گہمی میں انہیں برابر صاعقہ کا خیال آ رہا تھا۔ جشن کے

پروگرام میں کافی دیر بحث ہونے کے بعد جب قدرے خاموشی ہوئی تو انہوں نے بات

کارش پھیرا۔

”صاعقہ کے متعلق کیا سوچا ہے امی آپ نے؟“

حسن بانو نے جواب تو نہ دیا لیکن وہ متفکر ضرور منظر آنے لگیں۔ فوزیہ اور سعدیہ کے

ماتھے پر شکنیں آگئیں گویا ان مسرت آگئیں لمحوں میں اس کا نام سننا بھی گوارا نہ ہو۔

حسن بانو سمجھ نہ پاتی تھیں کہ اس میل کو کس کے سر منڈھیں۔ اکثر اس کے متعلق

سوچتی رہتیں لیکن سوچ جھنجھلاہٹ میں بدل جاتی اور انہیں لاشعوری طور پر محسوس

ہونے لگتا جیسے ناجی جاتے جاتے اپنے انتقام کی منج صاعقہ کی صورت میں ان کے سینے

میں پیوست کر گئی ہے۔

میس

متواتر بیس سالوں سے برابر چہچہے جا رہی ہے۔

اور

جے

نکال پھینکنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

”بیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس کے متعلق بھی کچھ سوچنا چاہیے۔“ انجم آرا ماں کو

خاموش پا کر بولیں۔

”رشتہ تو آ رہا ہے۔ سوچنا کس بات کا ہے اب“ فوزیہ نے ناک پڑھا کر کہا۔

”کوئی رشتہ؟“ انجم آرا جاتے ہوئے بھی پوچھ رہی تھیں۔

”وہی نواب مادی کا۔“ سعدیہ نے بھی بڑے یگانہ انداز میں کہا۔

”توبہ کرو۔ کچھ تو خوفِ خدا دل میں ہونا چاہیے۔“ انجم آرا ٹھیک سے بیٹھتے ہوئے

بولیں۔

”اس میں خوفِ خدا کی کیا بات ہے۔ وہ خواہش مند پیسے والا آدمی ہے۔“ حسن

آرا نے کہا۔

”عمروں کا فرق۔۔۔ دو بیویوں کو طلاق دے چکا ہے۔ کردار کون نہیں جانتا اس کا

شراب کے بغیر ایک دن بھی نہیں جی سکتا۔“ انجم آرا کی پریشانی پر ریل پڑ گئے۔

”تو پھر کیا کیا جائے“ حسن بانو پہلی مرتبہ بولیں۔ ”کہیں تو ٹھکانے لگانا ہے

اسے۔“

”اس طرح تو کوئی بوجھ بھی نہیں اتار پھینکتا امی۔“ انجم آرا کو ماں پر غصہ بھی آیا

کھڑی ہوئی۔ ”آخر اپنا ہی خون ہے۔ بن ماں باپ کے بچی ہے۔“



”خود تو جالے کہاں دفع و فان ہو گئی۔ یہ عمر بھر کا روگ میرے گلے ڈال گئی۔“ حسن بانو غصہ سے بڑبڑائیں۔

”صرف ناجی ہی کی نہیں۔ صاعقہ طاہر کی بھی بچی ہے۔“ انجم آرا نے آہستگی سے کہا۔

”بڑی ہمدردی ہے اس سے؟“ سعدیہ نے طنز کیا۔

”بھائی کا جگر گوشہ ہے۔ ہمدردی کیوں نہ ہو۔“ انجم نے جواب دیا۔

”تو پھر تم ہی سوچو اس کے متعلق۔۔۔ نواب ہادی سے کرنے کو تم تیار نہیں اور کون اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار ہو گا۔ اس کی منحوس ذات سے تو لوگ دور بھاگتے ہیں۔ کون استادل کردہ لائے جو اسے یہاں لے جائے۔“

”یہ سب آپ لوگوں کی بے بنیاد توہم پرستی کا نتیجہ ہے۔ رسوا کر دیا ہے بچی کو۔“ انجم غمزہ منظر آ رہی تھیں۔

”اتنی ہی ہمدردی ہے تو اپنے نعیم سے کر لیں یہ رشتہ“ فوزیہ نے طنز کیا فوزیہ کی ہونٹ پر انجم چپ ہو گئیں۔

اور اس چپ پر سب نے اک ملا جلا قہقہہ لگایا۔

”جب گھر کی طرف بات آئی تو چپ ہو گئیں۔ ہرج ہی کیا ہے۔ بھتیجی ہے۔ اپنا خون ہے۔ مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔“ سعدیہ زہیر لب مسکرا رہی تھیں۔

”کاش یہ بات میرے بس میں ہوتی۔“

”تمہارے بس میں کیونکر نہیں۔“

”آپ لوگوں کی عنایت سے۔“

”وہ کیوں کر۔۔۔؟“

”آپ نے جو اس کے ارد گرد توہم پرستی سے نحوست کے جال بن دیے ہیں۔۔۔“

”لیکن تم تو اس خیال سے متفق نہیں۔“

”بے شک“

”پھر کیا ہوتا ہے؟“

”صرف میری بات ہوتی تو آپ لوگوں کے کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میری محمودی آپ بھی جانتے ہیں۔ سسرال والے تو اس کے نام سے خوف کھاتے ہیں۔ اور نعیم کے لالہ۔۔۔ کالوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اس بچہ چاری کا نام سنتے ہی۔۔۔ یہ سب آپ لوگوں کی ہمدردی

ہے۔ استانا روا سلوک اس سے شروع ہی سے کیا گیا کہ اس کی ذات اب نحوست کا جلتا ہوا نشان سمجھا جانے لگی۔ آپ سب نے بھی تو اس سلسلے میں اسے رسوا کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی۔ استنا سوچا ہوتا کہ کل کو جوان ہو جائے گی، کہیں اسے بھی یہاں ہونا پڑے گا۔“

انجم آراء نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔۔۔ لیکن اس کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا۔ اچھی خاصی نوک جھونک ہونے لگی۔ اکیلی انجم چاروں کا کہاں تک مقابلہ کرتیں۔

بات پر پھر کر نواب ہادی پر ٹھہرتی۔ کئی دن یہ جھگڑا چلتا رہا حسن بانو کو سینے کی میخ نکال پھینکنے کا موقع مل رہا تھا۔ لیکن انجم سدا راہ تھیں یہ ظلم تھا اک مظلوم اور بے زبان لڑکی پر۔ وہ یہ ظلم اپنی زندگی میں نہ ہونے دے گی۔

فخر بھائی بھی ان کے ہم خیال تھے۔ ان کی بیوی فوزیہ جتنا صاعقہ سے جلتی تھی، انہیں اتنی ہی ان سے محبت تھی۔ لیکن اس محبت کا اظہار بیوی کی سخت گیری کو دیکھتے ہوئے کرنے پاتے تھے۔

انجم اور فخر نے ماں کو مجبور کیا اور مناسب رشتے کی تلاش جاری رکھنے کے وعدہ پر یہ بلا صاعقہ کے سر سے ٹل گئی۔



برآمدے میں ریحان، اسد، نعیم اور نوید کے ہمراہ کھڑے تھے۔ کہیں باہر جانے کا پروگرام تھا۔ باقی ساتھیوں کا انتظار ہو رہا تھا۔

ریحان فاختی رنگ کا سوٹ زیب تن کیے تھے۔ جوان کے حسین چہرے پر بے طعن اٹھ رہا تھا۔ شہزادوں کی سی رولتتی شان ان کے انداز سے مترشح تھی۔ پروقار سے نظر آ رہے تھے۔

اسد کے ہاتھ میں اخبار تھا اور نعیم کے ساتھ وہ سیاسی گفتگو میں مشغول تھے۔ نعیم اور ریحان برآمدے کے آخری سرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی سستی کو کوس رہے تھے۔

کچھ دیر بعد شاہد، سلیم اور لطیف بھی آ پہنچے۔ سب نوجوان خوش شکل اور خوش پوش تھے۔ آپس میں دور نزدیک کی رشتہ داریاں بھی تھیں۔ الحراء میں چلے بڑھے تھے۔ رشتہ داری سے زیادہ دوستی کے بندھن تھے۔ جوان سب کو آپس میں جکڑے ہوئے تھے۔ بے تکلف دوستی بھی تو اک نعمت ہے۔

”فرخ نہیں آئے ابھی؟“

”بڑی دیر کر دی“

”اس کا تو انتظار ہی فساد ہے۔“

”مپ ٹاپ کے لیے گھنٹوں چاہئیں۔“

”لو کیوں کو بھی مات کر دیا ہے ہارسنگار کر نے میں۔“

”سخت فصد آتا ہے۔“

”چلنا چاہئے۔“

”تم جا کر دیکھو۔ کیا کر رہے ہیں۔“

لطیف جاگے واسے لے فرس کے دور ہی سے ہاتھ ہلایا۔

”اکیلا۔۔۔ میں۔۔۔ اکیلا۔۔۔“

”شکر ہے“ کٹی آواز میں جواب میں تھیں۔

فرخ تقریباً بھاگتے ہوئے آرہے تھے۔ ان کی حرکت کسی بے پناہ خوشی کی غارتھی۔

”ہڑا“ فرخ پھلانگتے ہوئے دوستوں تک پہنچے۔

”کیا ہوا؟“ فرخ کا شوخ تبسم دیکھ کر سب نے پوچھا۔

فرخ تیزی سے بڑھے آرہے تھے۔

”ار۔۔۔ یونہی بغیر بریک کی گاڑی کی طرح چڑھے چلے آرہے ہو کچھ کہو بھی!۔۔۔“

ریحان نے فرخ کا کندھا پکڑ کر اپنے برابر کھڑا کر لیا۔

”ایک خوش خبری“

”کہاں سے اڑا لائے؟“

”پہلے منہ میٹھا کراؤ۔۔۔“

”کون؟“

”آپ“ ریحان کی طرف دیکھ کر فرخ مسکرائے۔

”تو کو یا خوش خبری میرے لیے ہے؟“

”بالکل سولہ آنے۔۔۔“

”اب کہہ بھی چکوا!“

”اوں ہونہ۔“

”بڑی بری عادت ہے تمہاری۔۔۔“

”جو جی میں آئے کہہ لو لیکن منہ میٹھا کرائے بغیر کچھ نہ کہوں گا۔“

سب کا تجسس بڑھ گیا۔ فرخ کے گرد جمع ہو کر سب باری باری پوچھنے لگے لیکن انہیں پڑانے میں لطف آ رہا تھا۔

”بس اب بہت بور ہو چکے۔ کہنا ہے تو کہو، نہیں تو چلو۔۔۔“ ریحان نے قدم اٹھایا۔

”ٹھہریئے۔۔۔ ٹھہریئے“ اسد نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

ریحان کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔



”ہمہ دوں“ فرخ نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔  
”ہاں“ نعیم بولے۔

”مٹھائی؟“

”ادھار“

”تو شیٹے۔“

سب ہم تن گوش ہو گئے۔ ریحان قدرے لہلہ وائی کا انداز اختیار کیے تھے۔  
”عید کے تیسرے دن اک جشن منایا جا رہا ہے۔“ فرخ چبا چبا کر چپ چپ ہو گئے۔ سب فرخ کے پیچھے پڑ گئے۔

”یہ کون سی بڑی بات ہے؟“

”اور اس کا جاری ذات سے کیا تعلق؟“ ریحان بولا۔

”آپ ہی کے لیے تو جشن منایا جا رہا ہے۔“

”میرے لیے؟“

”ہاں جناب کی منگنی کا سرکاری طور پر اعلان ہو گا اس دن۔“

”سچ؟“ کئی چہرے مسرت سے سرخ ہو گئے۔ ریحان بھی اک انداز دلربانہ سے زہر لب مسکرا دیئے۔

”تمہیں کس نے کہا؟“ فرید نے پوچھا۔

”بندہ ہر دن ان کانوں سے خود سن کے آیا ہوں۔ نانی حضور نے آخری فیصلہ دے دیا ہے۔“

”اچھا تو یہ راز دار مخفیلں اسی لیے ان کی نشست گاہ میں ہر روز ہوا کرتی تھیں۔“ شاہ بولے۔

”کچھ ہمارے متعلق نہیں فرمایا۔“ اسد نے منہ بنایا۔

”اور ہمارے۔“ نعیم آگے کو جھک کر لپکے۔

سب اشتیاق سے فرخ کو کرید رہے تھے۔ ریحان مستانہ نظروں سے سب کو دیکھنے ہوئے کمرنگی میں ٹیک ٹھکانے دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔

”تم نے یہ باتیں سنیں کیسے؟“

”ساتھ والے کمرے میں تھا نسبت۔ نسبت دو چار بار کانوں سے ٹکرایا۔ اپنے

کان کھڑے ہو گئے۔ دل دھڑکنے لگا۔ خیال تھا کچھ اپنے متعلق سن پاؤں گا۔ بڑی غہری کی لیکن پہلے یہی پڑا کہ ریحان کی نسبت کا اعلان عید کے تیسرے دن جشن میں کر دیا جائے گا۔ اپنا تو بھولے سے بھی کسی نے نام نہ لیا۔ چلو انہی کی خوشی کے سہارے جی لیں گے۔“ فرخ منہ بسور بسور کر کہہ رہے تھے۔ سب ان کی اداکاری کی داد ہنس ہنس کر دے رہے تھے۔

”کیا باتیں بنا رہے ہو۔“ ریحان نے ہاتھ بڑھا کر ان کی گردن پکڑ لی۔

”اے۔۔“ فرخ نے منہ بنایا۔ ”ایک تو آپ کے لیے خوش خبری لیا۔ ایک۔۔ سزا۔۔“

”خوش خبری تو اٹھالائے یہ بھی سن آئے کہ وہ کون خوش نصیب ہے جسے مہر دولت کے پہلے باندھا جا رہا ہے؟“

”ہاں ہاں یہ تو تم نے بتایا نہیں۔۔“ تقریباً سب نے تجسس ظاہر کیا حالانکہ ریحان خود اور باقی سبھی جانتے تھے کہ وہ خوش نصیب سمیرا کے سوا اور کوئی نہیں۔

اچانک فرخ کو شرارت سو جھی۔

”یہ بھی بتا دوں۔۔؟“

”یہی تو بتانے کی بات تھی۔“

”تو سنو۔۔ دل تھام کر سنو۔“

”دل تھام کر کیوں۔“

”بات ہی ایسی ہے۔“

سب کے چہروں پر تجسس کی لہریں گہری ہو گئیں۔ ریحان کچھ بے چین سے نظر آنے لگے۔

”بتا دوں یہ نسبت کس سے قرار پائی ہے؟“

”ہاں“

”صاعقہ سے۔“

”صاعقہ۔۔“ آنکھیں حیرت سے پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ سب فرخ کو کھور رہے تھے۔

ریحان تو گنگ سے ہو گئے۔ گہری بحر پہلے کا شوخ جہنم سنجیدگی کی گہرائیوں میں



”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ جانے کس نے کہنے کی ہمت کی۔  
 ”کیوں نہیں ہو سکتا؟“  
 ”لیکن۔۔۔“

”لیکن ویکن کیا۔ مابہد ولت نے اپنے کانوں سے سنا ہے اور پھر ہرج بھی کیا ہے۔“  
 ”چپ رہو جی“ ریحان کو غصہ آگیا۔  
 ”مجھے کیوں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے ہو۔ یہ نانی حضور کا آخری فیصلہ ہے۔“

”فیصلہ میری مرضی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اس کا نام اپنے نام کے ساتھ سنا تک گوارا نہیں کر سکتا۔“

”ریحان تو صاعقہ کے ازلی دشمن ہیں۔“  
 ”دشمنی کی کیا بات ہے۔ سارے کنبے میں اس کا دوست کون ہے۔ یہ بلا میرے لیے ہی رہ گئی تھی۔ اس کی ماں کا حسب نسب۔۔۔“  
 ”اوہو۔۔۔ ہو۔۔۔“ فرخ نے چھیڑا۔

”میں ابھی دادی حضور کے پاس۔۔۔“ وہ جانے کے لیے غصے میں بڑھے۔  
 ”نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ نہ بابا۔۔۔ کیوں مجھے جہنم رسید کرنے کا ارادہ ہے۔۔۔“ فرخ نے بڑھ کر راستہ روکا اور دھکیل کر انہیں پھر کھرکی کے ساتھ کھڑا کر دیا۔  
 ”میں مذاق کر رہا تھا۔ آپ رونے لگے۔“

”بے وقوف۔۔۔“  
 ”صاعقہ نہیں بھائی کوئی اور ہے بس۔۔۔ اب تو خوش ہو جائیے“ فرخ آنکھیں پلپلاتے ہوئے بولے۔

”اب تو باچھیں کھلی جا رہی ہیں۔“ فرید نے خوش ہو کر کہا۔  
 ”نام تو پوچھو پہلے۔“  
 ریحان ہنس کر بولے۔ ”صاعقہ کے علاوہ ہر نام گوارا ہے۔ کوئی خاص قید نہیں۔“  
 ”خواہ وہ نسب ہو؟“ فرخ نے مذاق سے خانہماں کی بھینگی لڑکی کا نام لیا اور سب

”میں بھی حیران تھا یہ ہو کیسے سکتا ہے۔“ نعیم قدرے توقف کے بعد بولے۔  
 ”بالکل۔۔۔ دادی اماں اپنے چہیتے پوتے کے متعلق اتنی شدید غلطی کیسے کر سکتی ہیں۔ ہماری تمہاری بات تھوڑا ہی تھی۔“

”اگر صاعقہ سے نسبت قرار پا بھی جاتی تو کیا مضائقہ تھا۔“ فرخ نے شوخ نظروں سے ریحان کی طرف دیکھا۔ جو کھرکی سے کمر گھٹائے بڑے شگفتہ نظر آ رہے تھے۔  
 ”کچھ بھی نہیں۔۔۔“ فرید بھی شوخی سے بولا۔  
 ”شکل و صورت کا تو مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔“ فرخ بولے۔  
 ”یہ بات غلط تو نہیں“ اسد نے حمایت کی۔

”تھوڑی سی منحوس ہے بس۔۔۔“ فرخ نے چھیڑا۔  
 ”بھئی نحوست تو خیر برداشت کر بھی لی جاتی۔۔۔“ ریحان چپکے۔ ”لیکن۔۔۔؟“  
 ”لیکن کیا؟“ سب متوجہ تھے۔  
 ”لیکن ایک بات بڑی خطرناک تھی“ وہ اسی مسرور انداز میں لہک کر بولے۔  
 ”وہ کونسی“

”اگر ماں کی طرح وہ بھی بھاگ جاتی تو طاہر چچا کی طرح جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔“  
 ریحان کے مذاق اڑانے پر اک قبضہ پڑا۔  
 ”ہمیں اپنی زندگی درکار ہے بھئی۔ اسی لیے اس کا نام سن کر خوف آگیا تھا۔ نہ بابا۔۔۔“ سب ہنس دیئے۔

اور عین اسی وقت اسد نے انہیں کمر میں ٹھوکا دے کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔  
 ”کیوں؟“  
 اسد نے انگوٹھے سے کھرکی کی طرف اشارہ کیا۔ اک لمحہ پہلے انہیں صاعقہ کا سایہ اندر نظر آیا تھا۔

ریحان نے مڑ کر برق کی سی تیزی سے کھرکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔  
 اور  
 وہ جیسے  
 سکتے میں آ گئے۔



کھڑکی کے پٹ کے قریب صاعقہ کھڑی تھی۔

اس کی حسین شبیہی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ جنہیں یہ ہزار وقت وہ اپنی جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

ریحان کی نظریں ان وحند لائی آنکھوں سے ملیں۔

ان آنکھوں میں اک بیچارگی تڑپ رہی تھی۔

اک استفسار پھل رہا تھا۔

اک شکایت سلگ رہی تھی۔

اک لمحہ

صرف اک لمحہ کے لیے نظریں ملی تھیں۔

پھر صاعقہ تیزی سے پلٹ کر کمرے سے چلی گئی تھی۔

لیکن

اک لمحہ

یہ سلگتا ہوا اک لمحہ زیست کی سینے پر ایسا داغ چھوڑ گیا جسے مشادہ شارحان کے بس میں

نہ رہا۔

”کیا ہوا“

”کون تھا“

”یوں کیوں کھڑے ہو۔۔۔۔۔“

ریحان کو یوں ہراساں کھڑا دیکھ کر سب ان کے گرد جمع ہو گئے۔ شہد نے تو کمرے میں جھانک کر بھی دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

”ایک دم سانپ سونگھ گیا۔“ نعیم نے ریحان کا کندھا ہلایا۔

”کیا بات ہے؟“ فرید نے پوچھا۔

ریحان کچھ نہ بولے۔ کچھ کھونٹے سے کھڑے تھے۔

”صاعقہ تھی نا اندر“ اسد نے کہا۔

”ہاں“ ریحان جیسے خواب میں بڑبڑانے۔

”اس نے تمہاری بکواس سن لی ہوگی۔“

”ہوں“

”کتنی بری بات ہے۔“

”ہاں“

”میں کب سے اشد سے کر رہا تھا۔ لیکن تم سنتے ہی کب تھے۔ لہذا ہانکے جا رہے تھے۔“

”تو پکیا بکواس کر رہے تھے ہم سب۔۔۔۔۔ اگر اس نے سن لیا ہے تو بہت بری بات ہے۔“

”یقیناً سن لیا ہے۔“

”اُف واقعی بڑی بری بات ہے۔“







آج دھوئیں کے بادلوں کے ٹکراؤ سے پہاڑ سرک گئے تھے۔  
آج پانی سے آگ لگ گئی تھی۔

چند گھنٹے دوستوں کے اصرار پر بد مزگی سے گزارنے کے بعد ریحان جب دوپہر کے کھانے کے لیے طعام گاہ میں پہنچے تو ان کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔  
ڈرتے ڈرتے انھوں نے کھانے کی میز پر نظر ڈالی۔  
صاف موجد نہ تھی۔

انھوں نے دوسری طرف دیکھا۔ اس میز پر بھی وہ موجود نہ تھی۔  
ان کا دل پکار پکار کر کہنے لگا کہ وہ ان بے رحم لمحات کی تلخی پر اب تک سسک رہی ہے۔

ریحان سے کھانا بالکل نہیں کھایا گیا۔ سمیرا ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس فہم پرپ سے وہ الجھ رہی تھی۔  
اس نے کئی کھانے ریحان کے سامنے پیش کئے لیکن وہ برائے نام چند نوالے لے کر میز سے اٹھنے لگے۔

”کیا بات ہے۔ آج آپ نے کھانا نہیں کھایا؟“ سمیرا نے دلفریب انداز میں پوچھا۔  
لیکن ریحان کو آج یہ آواز کچھ اجنبی سی لگی۔ بغیر کچھ کہے میز سے اٹھ گئے۔ اسد براہ ریحان کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کے کھوئے ہوئے انداز سے انھیں خوشی ہو رہی تھی۔  
اک معصوم زندگی کا تسخیر کرنے والا آج خود متاسف و ندامت سے دوچار تھا۔ ہاتھ نرم نہ ہوا تھا۔

ریحان اپنے کمرے میں آگئے۔ دل میں کسک تھی۔ کسی پہلو قرار نہ آ رہا تھا۔ اپنے کہے ہوئے الفاظ کی گونج کانوں کو مجروح کر رہی تھی۔  
”وہ بھی اپنی ماں کی طرح بھانگ گئی تو۔۔۔۔۔؟“

”اے کتنے سبک تھے وہ۔۔۔۔۔ ایسا ذلیل مذاق۔۔۔۔۔ ایسا گرا ہوا مذاق تھا۔۔۔۔۔ انھیں اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ اپنی نظروں میں آپ گرے جا رہے تھے۔ اخلاقی ضابطہ بھی تو کوئی چیز تھی۔ حیران تھے کہ اب تک انھوں نے اس ضمن میں اخلاقی ضابطوں کا اطلاق اپنے اوپر کیوں نہ کیا تھا۔

گوشت پوست کی ذی روح شے کو ہاتھ کا ٹکڑا کیوں سمجھتے رہے تھے۔ اس نے

محسوسات پر جمود کا یقین کیوں تھا انھیں۔

پچھتاوہ آ رہا تھا۔ بری طرح روح کو مسل رہا تھا۔ کسی طرح تسکین نہ پا رہے تھے۔  
جھنجھلا کر ان خیالات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔

مسہری پر لیٹ کر کتاب اٹھالی۔ ذہن کا رخ موڑنے کا اک حیلہ ہی تھا نا لیکن  
ہر صفحے پر

سطور کی بجائے دو حسین سوگوار اور دھندلائی آنکھوں کا عکس نظر آیا۔  
آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھیں

کچھ پوچھ رہی تھیں۔

کچھ کہہ رہی تھیں۔

کچھ طلب کر رہی تھیں۔

ریحان نے کتاب میز پر چھ دی اور ٹکیے کی نرمابٹ میں سر چھپا کر ان افکار پریشان کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔

تین چار گھنٹے یوں ہی گزر گئے۔ نہ سو سکے۔ نہ ہی ذہن کو افکاروں کی حدت سے بچا سکے۔

شام گھوم پھر کر گزارنے کے خیال سے اٹھے اور جلدی جلدی تیار ہونے لگے۔ وہ بیرونی دنیا کے شور و غل میں اپنے آپ کو کھو کر تسکین پانا چاہتے تھے۔ تنہا جانا چاہتے تھے۔ اس لیے غسل خانے کے دروازے سے باہر نکلے۔

راستہ ظاہر مرحوم کے کمروں کے آگے سے ہو کر جاتا تھا۔ ان کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے ریحان کو اس کیمرے کا خیال آگیا۔ جو کئی دنوں سے وہ ٹھیک کروانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ لیکن جب بھی باہر جاتے، لے جانا بھول جاتے۔

ریحان برآمدے میں آنے اور ظاہر کے کمرے میں آگئے۔  
لیکن

مسہری پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گئے۔  
وہاں کوئی بیٹھا تھا۔



جس نے آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا۔

اور

ریحان کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے وزنی بم پھینک کر ان کی حیات کا شیرازہ درہم برہم کر دیا ہو۔

مسہری پر صاعقہ میٹھی تھی۔ اس کی گود میں طاہر و ناجی کی بڑی سی تصویر تھی۔ جس پر سر رکھے وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ پلنگ پر بھی کئی تصویریں بکھری تھیں۔

آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

شدت گریہ سے آنکھیں اس حد تک متورم تھیں کہ انھیں کھولنا دشوار ہو رہا تھا۔

صبح

ان آنکھوں میں

ریحان نے سیلاب امنڈتے دیکھا۔

اور

اب

اس سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے۔

سیلاب انہی کا آوروں تو تھا۔

گھبراہٹ، پریشانی، پشیمانی اور ندامت کے جذبات نے انھیں گنگ کر دیا۔ دونوں ہاتھ پریشانی سے ملتے ہوئے انھوں نے صرف ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

آنکھوں سے آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ اٹھی۔ پلنگ پر بکھری ہوئی کئی تصویروں کو سیٹا۔ گود والی تصویر پر انھیں رکھا اور تصویریں الماری میں یونہی ٹھونس کر دوڑی۔ ریحان نے دیکھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں اداسیاں یوں ڈھل رہی تھیں جیسے رات کی آمد پر تاریکیاں شفق میں ڈھلنے لگتی ہیں۔

”صاعقہ“ اب مہم سی سرگوشی ابھری، لیکن صاعقہ ر کے بغیر ریحان کے قریب سے ہوا کے اک جھونکے کی طرح گزر گئی۔

جھونکا جو آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔

اور۔۔۔۔۔ جسے قابو میں کر لینا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔





ریحان نے اپنا نیلا کھاؤن پہنا اور خواب کماہ سے باہر نکل گئے۔ کل کے سنگین واقعہ کا اثر اب تک ان کے حواس پر تھا۔ کچھ تھکا وہ رو رہ کر چل رہا تھا۔ اور ریحان کی غم نا آشنا زندگی کو اک انوکھی سی کسک دینے جا رہا تھا۔

رات بھر انھیں اچھی طرح نیند نہ آئی تھی۔ ذہن اس قدر متاثر ہوا تھا کہ وہی دو شبہنی آنکھیں سوتے جاگتے میں تھرک رہی تھیں۔ رات بھر کی بیزار نیند اور ذہن پر ان آنکھوں کی شدید گرفت سے وہ جھنجھلائے ہوئے تھے۔

کوئی بڑی بات نہیں۔۔۔۔۔ کسی وقت موقع ملا تو معذرت کر دیں گے۔ ایسی کونسی بات ہے۔ جس کے لیے اپنے آپ کو اس حد تک پریشان کیا جائے۔ مانا کہ اخلاقی پستی ہے۔ اخلاقی جرم ہے۔ تو اب کیا ہو سکتا ہے۔ چلو معافی مانگ لیں گے۔ آئندہ اسے کبھی نہ بنائیں گے۔۔۔ اس سے اچھا سلوک روار کھیں گے۔ اس کی نحوست کا بھی کبھی مذاق نہ اڑائیں گے۔“

سوچتے ہوئے ریحان دریا کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے۔ موسم انتہائی خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈا عصاب پر خوش گوار اثر ڈال رہی تھی۔ سبزہ۔۔۔ دریا کا کنارہ۔۔۔ اور ابھرتی صبح۔ ریحان کافی دور تک نکل گئے۔ دماغی استدلال، ذہنی گھبراہٹ اور روحانی اضطراب ختم نہ کر سکے۔ ہلکی ہلکی سنہری دھوپ سطح آب پر جھلکنا لگی۔ ریحان پہلے سے کہیں زیادہ متقرار ہو کر واپس پلٹے۔

دریا کے کنارے کنارے

جہاں اونچے نیچے درختوں تلے بڑے بڑے پتھر پانی میں کچھ ڈوبے کچھ ابھرے قدرتی مسندوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ جہاں خود رو پھولوں کے پھلے لٹک رہے تھے۔

جہاں نرم و نازک سیلیں ستاؤں درختوں کے تنوں سے بڑے والہانہ انداز میں لپٹی ہوئی تھیں۔ موسم کی رنگینی، ماحول کی نغمگی اور بھیگی بھیگی فضا کا ترنم متھاضی تھا کہ وہ کسی پتھر یلی مسند پر بیٹھ کر پانی میں پاؤں ڈال کر اپنے سارے افکار سے نجات پالیں۔ لیکن طبیعت کچھ مچلی ہوئی تھی۔ قرار نہ تھا۔ بڑے چلے جا رہے تھے ناشتے کا وقت بھی تو ہو رہا تھا۔۔۔۔ وہ کچھ تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔

لیکن

ان کے بڑھتے ہوئے قدم خود بخود رک گئے۔ اک لطیف سی مہم گنگناہٹ فضا کی نغمگی و ترنم میں ایک درد بھرا اضافہ کر رہی تھی۔

کوئی ہلکے سروں میں دل کا درد فضا کی لہروں پر بکھیر رہا تھا۔ کشش ساحرانہ تھی۔ ریحان کے قدم خود بخود آواز کی سمت اٹھنے لگے۔

درختوں کے شاداب جھنڈ میں۔۔۔۔۔ جہاں خود رو پھولوں کی مہک تھی، انھیں گلابی گلابی کپڑوں کی جھلک سی دکھائی دی۔ آواز رک گئی۔

اور

ریحان کو یوں محسوس ہوا جیسے کائنات نے دم روک لیا ہو۔ ریحان دم بخود کھڑے رہے۔

پنہد ثانیوں بعد پھر آواز ہواؤں کے دوش پر لہرائی۔۔۔ اور لہرائی رہی۔ ایک ہی شعر بار بار گنگنا یا جا رہا تھا۔

کبھی مہم سروں میں کبھی دل کش لے میں۔

آواز کے سوز و گداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نغمہ نہیں سیال درو بہد رہا ہو۔ ریحان محتاط قدم اٹھائے جھکے درختوں کی ٹہنیاں ہٹا کر راہ بناتے کسی مقناطیسی کشش سے اس جانب کھینچے جا رہے تھے۔

قریب پہنچ کر درختوں کی گھنیری اوٹ سے ریحان نے دیکھا۔ لمحہ بھر کو تو جیسے ان کا دل دھڑکنے لگا۔

صاف اک انداز بخود ہی سے چوڑے پتھر کے کنارے بیٹھی تھی۔ پاؤں پانی میں ڈکا رکھے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں قدم بوسی کو پھلتے ہوئے گزر رہی تھیں۔ مستانہ ہوا کی ہمیر



سے بال کچھ پریشان سے ہو کر بکھر گئے تھے۔ کلابی ریشمی لباس کی سرسراہٹیں جاں کداز تھیں۔

صاعقہ ماحول سے بے خبر اور گرد و پیش سے لا تعلق سی بیٹھی تھی۔ پہرے پر اواسیوں کے گھلتے رنگ بڑے واضح تھے۔ بڑی بڑی حسین آنکھوں میں اک آزار تھا۔ کتنی افسردہ نظر آرہی تھی۔ اک درد بھرا شعر وجدانی کیفیت سے کبھی مسلسل اور کبھی رک کر دہرا رہی تھی۔ مچھانگی اور سہانی کا ترجمان شعر جس انداز میں گنگنایا جا رہا تھا، پتھر بجی پانی ہو جاتا۔

ریحان تو انسان تھے۔

جو کوشش پوست کا دل رکھتے تھے۔

دل

جو احساسِ ندامت سے دھڑکنا بھی بھولے جا رہا تھا۔

پتوں کی چلمن سے وہ صاعقہ کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے آج پہلی بار دیکھا ہو۔

چمکتا ہوا کارڈِ عمل افسردگی کے روپ میں ہو رہا تھا۔ ریحان بے قرار پہلے ہی تھے، اب اتہانی افسردہ نظر آنے لگے۔

صاعقہ کی آیا سے ہانے کہیں سے آگئی۔ ریحان کلمہ ہوش تاثر ٹوٹ گیا۔ جلدی سے گھنے درختوں کی آڑ میں اس طرح کھڑے ہو گئے جہاں سے وہ کسی کو نظر نہ آتے۔ لیکن پتوں کی آڑ ایسی تھی جہاں سے وہ صاعقہ کو باسانی تک سکتے تھے۔ وہ صرف دوفٹ کے فاصلے پر ہی تو بیٹھی تھی۔

آیا کی آواز پر صاعقہ بھی اس دنیا میں لوٹ آئی۔ اک گہری سانس لے کر اس نے آیا کی طرف دیکھا۔

”چلو بیٹی۔ کب سے یہاں بیٹھی ہو۔۔۔۔۔ آج تو میرے جانے سے پہلے ہی تم اٹھ آئیں۔۔۔۔۔ چائے دیں پڑی ٹمنڈی ہو گئی۔۔۔۔۔“

صاعقہ نے اک ٹھوکتی ہوئی شاخ کو تھام لیا۔ اور اس کے پتے نوچ نوچ کر پانی پیا۔

”اٹھو بھی“

”ہوں“

”دیر ہو رہی ہے بیٹی۔۔۔۔۔ ناشتے پر سب انتظار کر رہے ہوں گے۔“

صاعقہ نے سر گھما کر آیا کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اک استفسار تھا۔ اور ہونٹوں پر طنزِ تبسم۔۔۔۔۔

”ناشتے پر سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے؟“

”وقت ہو گیا ہے۔ سب کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے ہوں گے۔“

آیا جیسے اس کے طنزِ تبسم کو سہار نہ سکی۔

”صرف میں نہیں پہنچی۔“

”ہاں تو۔۔۔۔۔“

”اس لیے سب میرا انتظار کر رہے ہیں؟“

”اٹھو بھی صاعقہ بیٹی“

”آیا۔۔۔۔۔!“

”ہوں“

”تم جھوٹ کیوں بولتی ہو۔“

”میں۔۔۔۔۔؟“

”ہاں“

”میں نے کونسا جھوٹ بولا۔۔۔۔۔؟“

”ابھی ابھی کہہ رہی تھیں نا۔۔۔۔۔ کہ سب ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”اس میں جھوٹ کی کیا بات؟“

”تو یہ سچ ہے؟۔۔۔۔۔“

”ہاں“

اور اس ہاں پر صاعقہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

ریحان کو یہ ہنسی یوں لگی جیسے دق کے مریض کے کھوکھلے سینے سے آخری بار کھانسی اٹھی ہو۔

کتنی کھوکھلی اور طنز بھری ہنسی تھی۔ ریحان نے لاشعوری طور پر اپنے نچلے ہونٹ کے اٹھیں کو شے دستوں تلے دبا لیے۔

”صاعقہ“ آیا کے لہجے میں ممتا بھری ڈانٹ تھی۔ ”کتنی بار سمجھایا ہے الٹ پلٹ



ہائیں نہ کیا کرو۔۔۔“

”کیسے نہ کروں آیا“ صاعقہ سینے میں اٹھتی ہوئی ٹیس کی طرح بل کھا کر پیچھے کھڑی گئی۔ وہ مجسم آنسو نظر آرہی تھی۔

آیا کی آنکھوں کے گوشے غم آلود ہو گئے۔ لیکن اپنے آپ پر قابو پا کر آگے بڑھی اور صاعقہ کا ہاتھ تھام کر اٹھانا چاہا۔

”تم کہتی ہو سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔ آیا۔۔۔ یہ مجھ کو بھلا دے دے کر کب تک بھلائی رہو گی مجھے۔۔۔“

آیا کے نچے نچے چہرے پر جذبات کا تلاطم تھا۔ صاعقہ پھر ہنس دی۔ وہ بے رنگ بے کیف ہنسی۔۔۔ جیسے قوق سینے کی ہڈیاں کھدکھاتی ہوں۔

”میرا کسی کو انتظار نہیں ہوتا آیا۔۔۔ میری موجودگی ان لوگوں کے ذہنوں پر ہوتی ہے آیا۔۔۔ مجھے صبح صبح دیکھ کر ان کی رک و پے میں سنسنیٹ دوڑ جاتی ہے۔

جسٹھلاہٹ سی آ جاتی ہے۔ صبح صبح دیکھ لیں تو سارا دن بد مزگی میں گزر جاتا ہے۔“

”صاعقہ“

”میں بجلی ہوں آیا بجلی۔۔۔ جہاں گری مجسم کر ڈالا“ صاعقہ اسی انداز میں کہتی۔

”اُف۔۔۔ رحمان نے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ صاعقہ انہی کے الفاظ دہرا رہی تھی۔

استثنا اثر لیا تھا اس نے۔۔۔ رحمان نے تو کبھی سوچا تک نہ تھا۔

”میری بچی کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔؟“ آیا اس کے قریب بیٹھ کر اس کے ہونٹوں پر

صاعقہ بہتے پانی پر نظر میں جمائے بیٹھی رہی۔

”کل سارا دن رو رو کر ہلکان ہوتی رہی ہو۔۔۔ کچھ تو کہو۔۔۔ ہوا کیا ہے۔۔۔“

”کوئی نئی بات نہیں آیا۔۔۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”پھر بھی؟“

”جتنی بات بھی ہو۔۔۔ صرف ضرب لگانے کے انداز میں آیا۔“

”پھر کہا کسی نے کچھ؟“

”اگر میں ہاں بھی کہہ دوں تو تم کیا کر لو گی آیا۔۔۔“

آیا کی آنکھوں میں اپنی بے بسی پر آنسو چھلک آئے۔ ذہنوں کے دھارے بدل دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔

”آیا“ قدرے توقف کے بعد صاعقہ بولی۔

”ہوں“

”اگر۔۔۔“ وہ چپ ہو گئی۔ آیا منتظر رہی۔

”اگر میں یہاں چھلنا تک لگا کر ان لہروں کی آغوش۔۔۔“

”صاعقہ۔۔۔“ آیا چیخ اٹھی اور رحمان سر تاپا کانپ گئے۔

”تم یہاں نہ آیا کرو۔۔۔“ آیا نے بے تحاشہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”کیوں؟“ صاعقہ نے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بڑی منحوس جگہ ہے میری بچی۔۔۔“ آیا خوف زدہ سی تھی۔

”منحوس۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ تمہاری بد بخت ماں بھی۔ یہیں بیٹھا کرتی تھی اور قلم و تشدد سے تنگ آ کر یہیں سے۔۔۔“ وہ کہتے کہتے ایک دم رک گئی۔۔۔ پھر گہرا کر بولی۔

”اٹھو۔۔۔ چلو یہاں سے۔۔۔ یہاں نہ آیا کرو۔۔۔ یہ بڑی منحوس جگہ ہے۔۔۔“ رحمان نے قدرے جھک کر آیا کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا رخ صاعقہ کی جانب تھا۔ آیا کی گہراہٹ انہیں کچھ چومکا گئی تھی۔

صاعقہ از خود رفتہ سی بیٹھی تھی۔

”میری ماں بھاگ گئی تھی آیا۔۔۔“ صاعقہ نے کھوئے ہوئے انداز میں بڑے اور بے لہجے میں کہا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں صاعقہ۔۔۔“ آیا نے سردوٹوں ہاتھوں میں تھام لیا۔۔۔

”تم ہمیشہ یہی کہتی رہو گی۔۔۔“ مجھ کو تسلیاں نہ دیا کرو۔۔۔ تمہاری بھرپور بہت

اکہ دستی ہے آیا۔۔۔“

آیا نے کوئی جواب نہ دیا۔

”آیا“



”ہوں“

”تم کیوں کہہ سکتی ہو کہ میری ماں بھاگ نہیں گئی تھی۔۔۔۔۔؟“ آیا اک لڑکھوٹ پٹا گئی۔ لیکن اب صاعقہ کے ایسے ایسے سوالوں کی عادی ہو چکی تھی۔

”ہاں بتاؤ نا۔۔۔!“

”مجھے یقین ہے۔“

”یو نہی؟“

”اگ عمر گزر گئی ہے یہاں رہتے ہوئے۔۔۔۔۔“

”پھر۔۔۔۔۔“

”بہت کچھ سمجھا۔۔۔۔۔ بہت کچھ پایا۔۔۔۔۔“

”یہ یقین کہ میری ماں بھاگی نہیں تھی۔۔۔۔۔“

”میرا ایمان ہے۔۔۔۔۔“

”ہو نہہ۔۔۔۔۔“ صاعقہ ہنس دی۔

”سب کہتے ہیں۔۔۔۔۔“

”غلط کہتے ہیں۔۔۔۔۔“

”تم اکیلی سچ کہتی ہو۔۔۔۔۔؟“

”ہاں“ آیا نے اس یقین سے کہا کہ ریحان نے پتوں کی اوٹ سے اک باد پھر جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

”اس سنگین چہرہ دیواری میں بسنے والوں کے سینوں میں دل نہیں پتھر میں جوا اپنے خون کے ساتھ ناروا سلوک کر سکتے ہیں۔ انھیں اس غریب اور دیہاتی لڑکی سے جارحانہ اور ہیمنہ رویہ روار کہنے میں کیا پابندی ہوگی۔ جو راور تشدد سے تنگ آکر ہو سکتا ہے وہ انہی لہروں کی آغوش میں کھو گئی ہو۔“

صاعقہ نے اُبھرتی ڈوبتی لہروں کی طرف دیکھا اور اس عقیدت سے دیکھا۔ جیسے ان ڈوبتی لہروں میں ان کی ماں کی تربیت ہو۔۔۔ لیکن اک لمحے کے بعد اس نے بے ہوش نظروں سے آری کی طرف دیکھا۔

”یہ سب تمہاری قیاس آرائیاں ہیں آیا۔۔۔“

”ہیں مجھے یقین ہے بچی“

”یقین“ صاعقہ پھر وہی بے رنگ ہنسی ہنس دی۔ آیا اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”تمہیں تو یہ بھی یقین ہے کہ سب ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔“



حلول کر جاتا ہے۔ اک خواب ناک سا اجالا۔ ایک تباہناک سا اندھیرا۔  
ریحان کے لہجے کی ملائمت نئی اور انوکھی تھی۔ لیکن وہ اس تپتے پن سے سکون نہ  
محسوس کر سکی۔ ریحان۔۔۔ یہ وہی ریحان ہی تو تھے جو اسے تھکتے مشق بنانے میں ہمیش  
ہمیش تھے۔۔۔ جو اس کا نام اپنے نام کے ساتھ لینا تک گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اور جو ابھی  
کل ہی دوستوں میں اس کے وقار کی دھجیاں اڑا رہے تھے۔

”بیٹھو نا!“ ریحان نے نادام نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے میں  
سموئے ہوئے لاتعداد غموں نے انہیں بے چین کر دیا۔  
صاعقہ نے پھر ریحان کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں طنز کی دھوپ تھی۔  
ہنچتی ہوئی دھوپ۔

”کافی چیزیں ہیں۔ آیا پیالی لاری ہے۔۔۔ ناشتہ۔ ہمیں کر لو“ ریحان کسی مجرم کی  
طرح سر جھکائے کہہ رہے تھے۔

”کیوں پریشانی مول لیتے ہیں۔۔۔“ وہ زیر لب ہنسی۔

”صاعقہ!“ چیخ ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ میں جاگرا۔

صاعقہ ہنس دی۔ وہی پھینکی بے رنگ ہنسی۔۔۔ جو آج صبح ہی صبح ریحان نے سنی  
تھی۔ وہ بے چین ہو گئے۔

”صبح ہی صبح منہ دیکھ لیں تو سارا دن پریشانی میں گزر جاتا ہے۔ ساتھ بیٹھ کر ناشتہ  
کر لوں گی تو ہفتہ بھر پریشانی سے طبیعت معمول پر نہ آنے کی صاحب زادہ  
ریمان۔۔۔“ وہ ان کی طرف دیکھتے بغیر آگے بڑھ گئی۔

”صاعقہ! آریحان بے ساختہ چیخ اٹھے۔۔۔ ان کے لہجے میں تلملانی ہوئی بے چارگی  
تھی۔

لیکن صاعقہ رکی نہ مڑ کر ہی دیکھا۔ کسی سبک سی لہر کی طرح وہ آگے بڑھی۔ ہال کے  
آخری کونے میں ایک میز کے قریب جا بیٹھی۔ ریحان کی طرف اس کی پشت تھی۔  
ریحان نے کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں پر رکھ دیا۔  
آیا پیالی لے کر آگئی۔  
ریحان کی طرف دیکھا  
اور

ناشتہ کرنے کو اس کا قطعاً جی نہ چاہ رہا تھا۔ کل سے طبیعت سخت پریشان تھی۔  
زندگی سے یزار سی نظر آرہی تھی۔ صبح ہی صبح آیا سے جو باتیں ہوئیں ان سے طبیعت اور  
مکڑ ہو گئی تھی۔

آیا اسے زبردستی ناشتہ کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف لے آئی۔ سب ناشتہ کر چکے  
تھے۔ ہال خالی تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی صاعقہ کی منظر میز کے کونے پر پڑی۔ ناشتہ کا سلمان رکھا  
تھا اور ریحان میز کے کنارے والی کرسی پر بیٹھی پیالی میں چائے انڈیل رہے تھے۔  
”صاحب زادہ صاحب۔۔۔۔۔ آج آپ تنہا ناشتہ کر رہے ہیں۔۔۔؟“ آیا نے  
پوچھا۔

”بس دیر ہو گئی تھی۔۔۔۔۔“ انھوں نے پل بھر کو صاعقہ کی طرف دیکھا۔ سفید لباس  
میں وہ کتنی پُر وقار نظر آرہی تھی۔

”صاحب زادی نے بھی ناشتہ نہیں کیا ابھی۔۔۔۔۔“

”ہمیں آجائیں۔۔۔۔۔ کافی چیزیں پڑی ہیں۔۔۔۔۔“ ریحان جانے کیوں صاعقہ کی  
طرف دیکھنے کی جرات نہیں کر سکے۔

صاعقہ نے رک کر ریحان کی طرف دیکھا۔ حیرانگی سے دیکھا۔

”ہاں بیٹی۔ ہمیں بیٹھ جاؤ۔ میں پیالی لے آتی ہوں۔۔۔۔۔“ آیا الماری سے پیالی  
لانے آگے بڑھ گئی۔

”بیٹھ جاؤ صاعقہ۔۔۔۔۔“ ریحان آہستگی سے بولے۔

صاعقہ نے کرسی کی پشت تھامے تھامے پھر ریحان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں  
میں صبح کے ان نازک لمحوں کی جھلک تھی۔ جوں جوں روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے سے



پھر صاعقہ کی طرف۔

وہ چپ چاپ یہاں لیے صاعقہ کی طرف آگئی۔

”وہیں ناشتہ کر لیتیں۔۔۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”میرے لیے ناشتہ لاؤ“ صاعقہ کے ہلچے میں حکم تھا۔

آیا کچھ اور کہنا نامناسب سمجھتے ہوئے قریبی دروازے سے باہر نکل گئی۔ وسیع ہال پر ایک سکوت طاری تھا۔ ریحان کی چائے یہاں پر پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ سب چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں۔

”صاحب زادہ ریحان“ یہ انوکھا خطاب کانوں سے ٹکرا رہا تھا۔ دونوں ایک ہی ہال میں بیٹھے تھے۔ لیکن کتنی دوریاں حائل تھیں۔ یہ ذہنی دوریاں، کیا انہیں مٹایا جاسکے گا۔ صاعقہ نے ناشتہ کیا یا نہیں۔ ہاں وہ کچھ دیر ناشتہ کی میز پر بیٹھی ضرور رہی۔ اس کے ہال سے جانے کے بعد ریحان بغیر ناشتہ کیے میز سے اٹھ گئے۔ طبیعت پر مردہ پہلے ہی تھی۔ اب تو بچھ ہی گئی۔

سارا دن اپنے کمرے میں سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے رہے۔ اسد، نعیم، فرخ، فرید، شاہد نے دھاوا بول دیا۔ یوں بے شمار پڑے رہنے پر احتجاج کیا لیکن دوستوں کی بے باکی انہیں بن گئی۔ طبیعت کی خرابی کا واسطہ دے کر سب سے پیچھا چھڑایا۔ فرخ نے بزدل کہہ کر طنز بھی کیا۔ اس خرابی طبع کو کل والے واقعے پر محمول کر کے مذاق اڑایا۔

لیکن ریحان خوب صورتی سے بات کو اور موڑ دے گئے۔ طبیعت خراب ظاہر کی۔ سب بات سچ مان گئے۔ ہاں اسد عمیق نظروں سے اس بناوٹ کے پردے میں چھی ہوئی حقیقت کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

دوستوں کا ہنسی مذاق اس نہ آیا۔ سمیرا کی جہر دانہ احوال پُرسی بھی اچھی نہ لگی۔ سارا ماحول اپنی سا لگ رہا تھا انہیں۔ صرف اپنے جرم کا احساس تھا اور وہ شدید ترین ہوا رہا تھا۔

سارا دن جذبات کی شوریہ سرموجوں سے ٹکراتے رہنے کے بعد ریحان نے قفا فیصلہ کر لیا کہ وہ صاعقہ سے معافی مانگیں گے۔ پوری عقیدت سے وہ اس ذہنی دوری کو ختم کر دیں گے۔ وہ اپنی بیست اور بیسکانگی کے احساس کو مٹا کر صاعقہ کو وہی مرتبہ دے دیں گے۔

جس کی وہ اہل ہے۔

جرم کی سنگینی کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے جذبہ عفو طلبی کی گہرائی کا بخوبی احساس تھا۔

اسی شام وہ پچھلے برآمدے کے گول ستون سے ٹیک لگائے ڈوبتے سورج کی

سرخیوں میں جانے کیا دیکھ رہے تھے کہ اچانک بغلی کمرے کا دروازہ کھلا۔

ریحان نے مڑ کر دیکھا۔

صاعقہ دروازے سے باہر آرہی تھی۔

خاموش

سنجیدہ

اور

باوقار

ہلکے بادامی رنگ کے لباس میں شام کے دھندلکے میں وہ اس مسحور کن خواب کی طرح نظر آرہی تھی جو جاگتے میں آنکھوں میں ڈھل رہا ہو۔

اسے شاید بیرونی چمن کی طرف جانا تھا۔

اک ثانیہ ریحان کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ پھر بڑھی اور ان کے قریب سے گزر کر برآمدے کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔

”صاعقہ!“ ریحان کا جذبہ عفو طلبی مچلا۔

صاعقہ نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

لیکن اس کی ہچکیوں میں سنجیدگی کا اک ایسا ستاؤ تھا کہ ریحان کو شش کے باوجود طرف مڑا ہونٹوں پر نہ لاسکے۔

صاعقہ نے محسوس کیا وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

کیا کہنا چاہتے ہیں؟ وہ کچھ نہ سمجھی۔۔۔ استفہامیہ نظروں سے چند ثانیے انہیں دیکھتی رہی۔

ریحان کے خون کا ایک ایک قطرہ حرفِ مد عابثتے کے لیے سڑپ اٹھا۔ لیکن جانے کونسی طاقت تھی جو قوت گویائی سلب کیے جا رہی تھی۔ کئی بار ہچکیاں اٹھیں لیکن اپنے جی ہار سے جھک گئیں۔

ریحان کا منہ بند۔۔۔ پچھلیاٹ اور کش مکش صاعقہ کی نظروں سے نہاں نہ رہا۔



لیکن  
اس نے کچھ پوچھا نہیں۔  
رحمان چپ تھے۔

وہ مڑی

اور

چمن میں اتر گئی۔

رحمان وہیں کھڑے اسے جاتا دیکھتے رہے۔ اپنے اوپر حیرانگی بھی آ رہی تھی اور غصہ بھی۔

کتنا اچھا موقع تھا عشو طلبی کا، ضمیر سے بوجھ ہٹانے کا، ذہنی دُوریاں دُور کرنے کا۔  
لیکن اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

کیا وہ بُزدل تھے

یا جرم کا بار ہی استا تھا کہ اُٹھانا مشکل تھا۔ بار سے زبان بند ہو گئی تھی۔ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ پائے تھے۔

۳۰

اس نشیلی صبح وہ حسبِ معمول دیر تک دریا میں نیم ڈوبے پتھر پر بیٹھی رہی۔ آوارہ  
ہوائیں اس کے بالوں کو چھیڑتی رہیں۔ مست جھونکے اس کے لباس کی سرسراہٹوں کو  
سرکوشیاں بناتے رہے۔ لیکن وہ بے خبر سی بیٹھی رہی۔ وہ جتنی خاموش اور پرسکون  
دکھائی دے رہی تھی، اس کے سینے میں استہیاج، پہچان و تلاطم تھا۔  
پانی میں گرداب اٹھ رہے تھے۔

اور

اس کے ذہن میں بھی کچھ ایسے ہی گرداب بن رہے تھے۔ بگڑ رہے تھے۔ اور پھر بن  
رہے تھے۔ لہریں پھیل پھیل کر اس کے دماغ سے ٹکرا رہی تھیں۔ جن سے دل  
ہچکولے کھا رہا تھا۔

کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ رحمان اس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ دوچار  
مرتبہ آمناسا منا ہونے پر انہوں نے اسے مخاطب بھی کیا۔ لیکن جانے کیوں کہہ دینے سے  
کمزور رہے تھے۔

وہ کیا کہنا چاہتے تھے؟

یقیناً وہ کسی خوش فہمی کو اپنے ذہن میں سرائٹھانے کی مہلت دینے کو تیار نہ تھی۔  
پھر۔۔۔ پھر وہ کیا کہنا چاہتے تھے!

پھر پھر کر دماغ اسی واقعے کی طرف گھوم جاتا۔ جب اس نے رحمان کی زبانی آزرده وہ  
باتیں سنی تھیں اور کمر کی میں پلٹنے کے بعد اس کا رحمان سے سلنا ہو گیا تھا۔  
باتیں انوکھی تھیں نہ نرالی۔ اس کی تو زندگی طرز کے ایسے تیروں سے پھلنی ہو چکی  
تھی۔ رحمان نے اس کے سامنے نہ سہی، پس پشت اس سے بڑھ کر اسے ذلیل کیا تھا۔  
پگھلا وہ تو ایک طرف، کبھی کسی نے نادام نظر بھی اس پر نہ ڈالی تھی لیکن اب۔۔۔؟



وہ متاسف نظر آتے تھے۔

کچھ کہنا چاہتے ہوئے بھی کہہ نہ پائے تھے۔

تاسف اور رجحان دو متضاد چیزیں نظر آتی تھیں۔

وہ دیر سے سوچ رہی تھی۔ یہی باتیں۔

اور پھر

اس کے ذہن میں اک بہر سی اٹھی۔ جس کی کربناک ٹیسوں سے وہ بے چین ہوئی۔

اس نے سوچا۔۔۔ شاید۔۔۔ رجحان کی جدت پسند طبع نے یہ بھی تشفق طبع کا کوئی نیا

ذریعہ ڈھونڈا ہے۔ اسے تختہ تضحیک بنانے کی کوئی نئی سکیم وماغ میں سمائی ہے۔

یہ سوچ یہ خیال معصوم دل و دماغ میں شعلوں کی لپک پیدا کر گیا۔ اس نے جھکا ہوا سر

اپنے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

اور

پھر

اسے چند سال اور کا وہ واقعہ یاد آگیا۔ جب رجحان نے کچھ ایسا ہی روپ بدلاتھا۔ اس

کے ساتھ اپنا رویہ بدل لیا تھا۔ جہد روی، چابست اور غلوص میں ہمیش رہتے تھے۔

اسے منکوس کہنے والوں سے الجھ پڑتے تھے۔

اور صاعقہ کی محبت و پیار کے جذبات کے لیے ترستی روح اس پر لے ہوئے روپ

سے پوری طرح ہمک آتی تھی۔

لیکن

چند ہی دنوں بعد بناوٹ کا پول کھل گیا تھا۔ اپنے جم جلیسوں کے سامنے رجحان نے

وہ مذاق اڑایا تھا کہ بیمار روح تڑپ اٹھی تھی۔

دو گرم گرم آسوس صاعقہ کی آنکھوں سے ہتھیلیوں پر ٹپکے۔ دل کا کتنا درد سمویا تھا ان

آسوسوں میں۔۔۔

انکھوں کی نازک نازک پوروں سے اس نے آنکھوں کے بھیجے گوشے صاف کیے۔

آسوس کی کمزوری کے قمار تھے۔ وہ شاید یہ کمزوری اپنے آپ پر بھی ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔

یہ نمودار ہی سہی۔ لیکن اسی میں مصلحت تھی۔

مورق ابھر آیا تھا۔ ہلکی ہلکی آوازوں کے خشک آنچل سوکھے جا رہے تھے۔ فلانا

طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ نشیلی صبح کچھ ہوش میں آتی جا رہی تھی۔

وہ دل گرفتہ سی اٹھی۔ ڈھیلے ڈھالے گلابی گاؤں میں وہ کوئی ایسا نظر آرہی تھی۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی۔۔۔ سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھی وہ سر جھکائے

الحراء کی بلند و بالا عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔

”صاعقہ“ پشت کی جانب سے کسی نے پکارا۔۔۔ اس نے رک کر پیچھے دیکھا۔ چند

قدم کے فاصلے پر رجحان آرہے تھے۔

وہ اس کے قریب آکر رک گئے۔

اس نے دیکھا۔ آج ان پر پھر وہی کیفیت طاری تھی۔ تذبذب۔۔۔ کشمکش، کچھ کہنے

کو یہ تباہ نظر آرہے تھے۔ لیکن کہہ نہ پاتے تھے۔

صاعقہ نے یہ کانہ سی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ان نظروں میں میرت قطعاً نہ تھی۔

رجحان نے اس کی طرف دیکھا۔ لب پھر پھڑپھڑائے۔ لیکن کچھ بولے نہیں۔ صاعقہ نے

پھر پھر نظر ان پر ڈالی۔ ہلکے نیلے گاؤں میں وہ کتنے حسین نظر آرہے تھے۔

”کاش ان کا دل بھی استابی حسین ہوتا“ ضبط کے باوجود صاعقہ کے دل کے کسی

نامعلوم گوشے سے صدا اٹھ رہی تھی۔

اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

”صاعقہ!“ اک سرگوشی پھر ابھری۔ رجحان اس کے کندھے کے قریب آچکے تھے۔

وہ اک طرف کو ہو گئی۔

”آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔۔۔؟“ بڑی ہمت کر کے اس نے بے نیازی قلمبر کرتے

ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔“ رجحان کے لبوں سے نکلا۔

”کہنیے۔“ وہ رک گئی۔

رجحان اس کے سامنے کھڑے تھے۔ دو ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ جانے کیوں اس

کے سامنے اس سانس بزم استا شدت اختیار کر جاتا کہ زبان سے ایک لفظ نکالنا مشکل ہو جاتا

ہے۔

”میں منتظر ہوں صاحب زادہ رجحان“ جذبات سے ماری آواز تھی۔

”صاعقہ“ رجحان اس طرز تقابل سے تھلائے گئے۔



صاعقہ بظاہر مطمئن سی کھڑی تھی۔

”یہ انوکھا طرزِ تحت طلب کب سے سیکھا ہے؟“ ریحان کے خوبصورت چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر اک زہریلا تبسم بکھر گیا۔ بڑے یہاں انداز میں بولی ”جب سے اپنے اور آپ کے رتبے کے تفاوت کا احساس ہوا ہے۔“

”صاعقہ!“ ریحان اس چوٹ پر تڑپ گئی۔

لیکن وہ تیزی سے وہاں سے چل دی۔

ریحان کا زخمی ذہن اس چوٹ پہ تڑپ رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ صاعقہ درختوں کے گھمبیر سائوں تلے ہوتی الحراء کی طرف جا رہی تھی۔ وہ ان سے چند گز کے فاصلے پر تھی۔

لیکن

ریحان کو

یہ فاصلہ

صدیوں پر پھیلا ہوا محسوس ہوا۔

انہیں یوں لگا جیسے وہ اور صاعقہ ازل وابد کے دوسرے ہوں۔ یہ سرے کیوں کر ملیں گی!

کیا انہیں ملانے کو کوئی قیامت مچل اٹھے گی؟

قیامت۔۔۔ قیامت

قیامت تو ریحان کے سینے میں پہا تھی۔

کیوں نہ یہ قیامت آج ہی مچل جائے۔

تیزی سے قدم اٹھاتے ریحان صاعقہ کی طرف بڑھے۔ اور پھر اس کے برابر آگئے۔

”صاعقہ!“ انہوں نے تیزی سے پکارا۔

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔۔۔؟“ وہ تنک کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”تم ناراض ہو صاعقہ؟“ ریحان نے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

صاعقہ کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا لیکن اس نے اپنے انگلیختہ جذبات پر جلد ہی قابو لیا۔ ریحان کو وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ پھر بھلا کسی خوش فہمی کو کیونکر سر اٹھانے دیتی۔

”ناراض ہو؟“ ریحان ہر دم کی طرح اس کے سامنے سر جھکانے لگے۔

”ناراض“ سنجیدگی کی ٹھنڈی لہر کی طرح وہ گویا ہوئی۔

”مجھے انتہائی افسوس ہے۔ اس دن میری بے ہودہ کوئی سے تمہارے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ اس کے لیے آپ پریشان ہیں۔“ طنزیہ لہجہ تھا۔

ریحان کا سر اور جھک گیا۔ میتابی سے ہاتھ مسئلے جا رہے تھے۔

”میں نادم ہوں“

”یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں۔ جس کے لیے آپ پریشان ہوں۔“

”صاعقہ۔۔۔۔۔ مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔“

”شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ راہ میں پڑی لاوارث چیزیں ٹھوکروں کے لیے ہی تو ہوتی ہیں۔ جس کے وجود کی تحقیق ہی تختہ مشق بننے کے لیے ہوتی ہے۔“

”صاعقہ“ ریحان نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر آنکھیں بند کر لیں۔ صاعقہ کی بات

ادھوری رہ گئی۔

صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ کئی ثانیے اسی حالت میں کھڑے رہے۔ وہ اس

وقت اس مجرم کی طرح نظر آرہے تھے جس نے پولیس کی گرفت سے پہلے ہی اپنے آپ کو

قانون کے حوالے کر دیا ہو۔

وہ حقیقتاً متاسف تھے یا اداکاری کر رہے تھے۔ صاعقہ کچھ بھی تو نہ سمجھ سکی۔ یہ چند

ثانیے کتنے کٹھن تھے۔ یہ صاعقہ کا دل ہی جانتا تھا۔ لیکن گزرے ہوئے ماہ و سال کے

سینے پر پھیلے ہوئے لاتعداد داغ صاعقہ کا ذہن اپنی طرف منتقل کر رہے تھے۔ اور ان

داغوں کی موجودگی سے وہ اس وقت اسے ریحان کی اداکاری ہی سمجھ سکی۔ یہ کوئی نئی سکیم

نہی۔ اسے بنانے کی وہ اپنے ہم جلیسوں کے لیے شاید قہقہوں کا سامان فراہم کر رہے

تھے۔

ریحان سر جھکانے لگے۔

صاعقہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ دل برداشتہ ہو کر ’دل گرفتہ ہو کر وہ مڑی۔

اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔ نہ جانے کیوں اسے اپنا گھما بندہ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

آنکھوں کے آگینے بھی تو جھلملا رہے تھے۔

”میں انتہائی نادم ہوں۔۔۔ صاعقہ مجھے معاف کر دو۔“ قدم بڑھا کر ریحان اس کے

برابر آگئے۔



صاعقہ رکی۔

پلٹ کر ریحان کی طرف دیکھا۔

اور ڈوبتے ہلچے میں بولی۔ ”آپ کی ستورع پسند طبیعت نے تفتن کی شایہ مٹی راہ نکالی ہے۔ لیکن۔۔۔ کبھی تو خیال کیا کیجئے کہ جسے آپ تختہ مشق بناتے ہیں وہ بھی انسان ہے۔ پتھر نہیں۔“

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کی آواز آنسوؤں سے رندھی تھی۔ ریحان گنگ سے کھڑے اسے دیکھتے رہ گئے۔

وہ درختوں کے جھنڈ میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور ریحان کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی مجبور و مجبور کے ہونٹوں سے اک سسکی پھسل کر فضا میں تحلیل ہو گئی ہو۔

○

(۳۱)

”لیکن اسنا تو خیال کیا کیجئے کہ جسے آپ تختہ مشق بناتے ہیں وہ بھی انسان ہے پتھر نہیں۔۔۔۔۔“

آنسوؤں میں ڈوبتی آواز ریحان کے کانوں سے مسلسل گرا رہی تھی۔ بستر پر بے چین کروٹیں بدلتے ہوئے وہ اس آواز کے سوز میں اپنا دل مٹھتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

رات دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی۔ ریحان کئی بار سر جھٹک کر افکار پریشان سے چمٹکار پانے کی کوشش کر چکے تھے۔ سو جانے کی کوشش میں بار بار آنکھیں بند کر چکے تھے۔ لیکن نہ نیند آتی تھی نہ قرار۔ دل سیماب کی طرح بے قرار تھا۔ رُوح لا تعداد وزنی ہتھروں کا دباؤ محسوس کر رہی تھی۔ سگریٹ پی پی کران کا حلق چلنے لگا تھا۔ کروٹیں بدل بدل کر جسم دگھ رہا تھا۔

خواب گاہ کا خواب ناک ماحول بھی نیند لانے میں مددگار ثابت نہ ہو رہا تھا۔ سبز لیمپ کی دھیمی روشنی کئی بار بجھی اور جلائی گئی۔ نہ اندھیرے سکون بخش تھے نہ اُجالے۔

ایک ہی جملہ قیامت پیا کیے تھا۔ دلسوز تاثر سے دل سینے میں مٹھا جا رہا تھا۔ ”صاعقہ۔۔۔۔۔ صاعقہ“ ان کا رواں رواں ہم آواز بنا جا رہا تھا۔

کھیرا کر ریحان بستر سے اٹھے۔ جلدی سے عقبی دریچے کے پٹ کھول دیئے۔

انہیں کیا ہو گیا تھا؟

کیا ہو رہا تھا؟

کچھتا وہ استنا جاں گسل کیوں بنا جا رہا تھا؟



احساسِ بزمِ شہید کیوں ہو گیا تھا کہ چین و سکون ان کے لیے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ریحان کے تپتے ہوئے دل و دماغ کو کچھ سکون بخشا۔ دو دو چاندنی کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ گلابی جاڑوں کی چاندنی رات دلکشی کے اعتبار سے انوکھی ہی تو تھی۔ انھیں کچھ سکون ملا۔۔۔۔۔ اور اپنے جذبات کا تجزیہ کرنے کو وہ اپنے ذہن میں توانائی سی پانے لگے۔

سگریٹ سلا کر وہ کھڑکی میں کھڑے فضا میں گھورنے لگے۔ وہ کھو گئے۔ اپنے آپ میں کھو گئے۔

اور

جب الحمراء کے گھڑیاں کی آواز نے انھیں چوٹیا تو ان کے دل کا کوئی گوشہ چپکے چپکے سلگ رہا تھا۔ لیکن یہ جلن اذیت نہ دے رہی تھی۔

اک انوکھا سرور۔۔۔۔۔ اک کسک بھرا سکون۔۔۔۔۔ اک مسکون کن سی ٹرپ دے رہی تھی یہ جلن

اور

یہ اسرار یہ سکون، یہ ٹرپ ان کے حواس پر نشہ بن کر چھا رہی تھی۔ بوٹیوں پر اک محبوب تبسم تھا۔ آنکھوں میں نکھرے ہوئے جلووں کا پر تو۔۔۔۔۔ سگریٹ باہر پھینک کر وہ پلٹے۔

سوچ رہے تھے کہ اب تک وہ کہاں تھے۔ صاعقہ کے قریب رہتے ہوئے بھی وہ اس گلی کی رنگینی سے بھابھوں کو سیراب کیوں نہ کر سکے۔

صاعقہ۔۔۔۔۔

جسے اک بے رنگ مصرعہ سمجھ کر نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ عمرِ قیام کا غمور کلام تھی۔

وہ کھڑکی سے بیٹھے۔۔۔۔۔ نیا سگریٹ سلاکایا اور مسہری پر ایٹ گئے۔ کافی دیر تک وہ

یو نہی پڑے رہے۔۔۔۔۔ صرف صاعقہ کا خیال ان کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ توں کا سویا ہوا پیار اُس اک لمحہ میں جاگ اٹھا تھا جب انھوں نے صاعقہ کی وحند لائی آنکھوں میں پہلی بار جھانکا تھا۔

اس

اک لمحہ میں

ازل وابد کی ساری مسافتیں طے ہو گئی تھیں۔ صاعقہ سے معافی مانگنے کا جذبہ پچھتاوہ نہیں تھا بلکہ

پیار کی مچلی ہوئی جبلتیں تھیں۔

سگریٹ پھینک کر انھوں نے اک طویل انگڑائی لی۔ یوں بستر پر لیٹے جیسے سارے روحانی بوجھ جھٹک کر ہلکے پھلکے ہو گئے ہوں۔ صاعقہ اور ریحان، ریحان اور صاعقہ ایک ہی چیز کے دو نام محسوس ہو رہے تھے۔ جیسے وہ ان کی جنم جنم کی ساتھی ہو۔ ان کے دل کا درد ہو۔۔۔۔۔۔۔ اور ان کی حیات کی گرمی ہو۔ رات گزر گئی۔

اور

اس گدلی رات کی آغوش سے اک نورانی صبح جنم لے کر سیدار ہوئی۔ ریحان کی زندگی میں روشنی ہی روشنی ابھر آئی تھی۔ گدلی رات کے ملگے اندھیروں کا کہیں نام نہ تھا۔ وہ سرتا پاپدلی ہوئی ذہنیتوں سے دوچار تھے۔

آنکھیں اوچوری نیند کے نشے سے کچھ غمور سی تھیں۔ بند بندہ میں اک لطیف سا کھنکھائی اگڑاؤ تھا۔ رات بھر کی بے قراری سے اک کیف آمیز سی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ دل میں اک انوکھا سا۔۔۔۔۔ نرالا سا۔۔۔۔۔ سکون بخش درد تھا۔

صاعقہ کی محرومیوں، مایوسیوں اور تنہائیوں کو اپنے پیار کی وسعتوں میں سمولینے کا تہیہ کر کے وہ کتنے مسرور منظر آرہے تھے۔

زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر کے ریحان انتہائی مطمئن منظر آرہے تھے۔

اور

اس دن کئی دنوں کی پروردگی کے بعد ان کی طبیعت اپنے معمول پر آئی۔ ساتھی ان سے







”ابھی تمہیں کہہ رہا تھا نا کنارہ نظر آگیا۔۔۔۔۔“

اسد نے کچھ اور پوچھنا چاہا۔ لیکن ریحان نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”کنارہ نظر آجائے تو پالینا و شوار نہیں ہوتا اسد۔ موجیں کتنی طوفانی ہوں۔ ارادے ان سے ٹکرائے جاتے ہیں۔“

اسد کچھ مجھے تو نہیں۔ ریحان انھیں تذبذب میں دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس دیئے۔



”ہاں مرگئی کم بخت۔ چابیوں کے لیے بھیجا تھا نہ خود آئی نہ چابیاں بھیجیں۔ لڑکی کے تیور دن بدن اور سے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اللہ جالے کیا دن دکھائے گی۔“

”یہ کس پر عتاب نازل ہو رہا ہے دادی حضور؟“ ریحان نے دادی کی نشست کلاہ میں آتے ہی پوچھا۔ دادی غصہ میں بھری چیزیں الٹ پلٹ کر رہی تھیں۔ بڑبڑاتی ہوئی ریحان کی بات کا جواب دیے بغیر برابر والے کمرے کا پردہ اٹھا کر اندر چلی گئیں۔

”یہ کس کی شامت آئی۔“ ریحان نے مسکراتے ہوئے انجم پوچھی ہے پوچھا۔

”ایک ہی تو ہے جس کی تقدیر میں عتاب ہی عتاب ہے۔“ انجم کا دل دکھ رہا تھا۔ ریحان کا رنگ اک لمحہ میں کئی رنگ بدل گیا۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی اور ہر سے پر اک خمبیر سی سنجیدگی چھا گئی۔ وہ جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے چپ چاپ سے۔

واپس پاتھ منٹھی ہوئی فوزیہ بڑے طنز انداز میں بولی ”بڑا برا لکھا؟“

”برا لکھے؟“ انجم برس پڑیں۔ ”صبح شام اسی کم بخت کو کو سا جاسا ہے۔ قصور ہوتا ہو مورد الزام وہی ہے۔“

”قصور کے بغیر بھی کوئی کچھ کہتا ہے۔“ الماری میں سجدہ کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے بولیں۔

”دو کھنٹے سے چابیوں کے لیے کہا تھا خالہ جان نے۔۔۔ ابھی تک لپٹ ہے وہ“ فوزیہ بولی۔۔۔ ”دادی کے حکم کا پاس تو ہونا چاہیئے تھا۔“

”کیا ہوا۔۔۔ بھول گئی ہو گئی۔ ایسی کوئی قیامت ٹوٹ پڑی جو اسے متواتر کوٹنے مل رہے ہیں۔“ انجم غصہ میں تھیں۔ ”اس کی کسی بات کو درگزر کرنا تو کوئی جانتا ہی نہیں۔ بات بڑھائی جاتی ہے۔ وہائی نہیں جاتی۔“

”اے ہے آپ تو ہمارے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ جیسے ہم اسے کوں رہے ہیں۔“ فوزیہ



نے خشکی سے منہ سورتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیا پڑی ہے۔۔۔ تم خواہ مخواہ الجھ پڑے۔۔۔“ سعدیہ نے بہن کو ملاست کی۔

”دادی کے حکم کا پاس تو ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے تو اتنی سی بات کہی ہے۔“ فوزیہ شاید لڑائی کے موڈ میں تھی۔

”انجم تم بھی خواہ مخواہ پرانے مانو۔۔۔ سب دیکھ رہے ہیں لڑکی دن بدن لاہر وا ہوتی جا رہی ہے۔ کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔۔۔“ سعدیہ نے کلمہ کیا۔

”تو گھر سے دلچسپی نہ گھر والوں سے۔۔۔“ فوزیہ نے لقمہ دیا ”ماں کی طرح یہ زاری رہتی ہے ہر وقت۔۔۔“

”یہ زار نہ رہے گی تو اور کیا ہو گا۔ گھر والوں کا سلوک اس سے کونسا اچھا ہے۔ بہیمانہ سلوک سوائے زاری کے اور کونسا جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔۔۔“ انجم نے زہرا کھلا۔

”سب اسے ہاتھ سمجھتے ہیں پھوپھی جان۔۔۔ پتھر۔۔۔!“ ریحان کے ہونٹ پہلی بار ہلے۔

فوزیہ اور سعدیہ نے پلٹ کر حیرت سے ریحان کی طرف دیکھا۔ اسے سنجیدہ دیکھ کر فوزیہ ہنس دی۔ ”سبحان اللہ تمہیں بھی زبان مل گئی اس کی قصیدہ گوئی کے لیے۔۔۔“

”حق کی بات کہہ رہا ہوں“ ریحان اسی سنجیدگی سے بولے۔

”انجم تو حمایت کرتی ہی تھیں، اب یہ بھی بولنے لگے۔“ سعدیہ نے تیز نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”کچھ خوف خدا بھی ہونا چاہیئے سعدیہ“ انجم سمجھانے کے انداز میں گویا تھیں۔

”ہاں ماں باپ کی بچی ہے۔ کسی وقت تو اس کی۔۔۔!“

”کیا بات ہے؟“ دلی حسن بانو کے کمرے میں آتے ہوئے بولیں۔ ریحان کمرے سے چپ چاپ نکل گئے۔

”آپ بھئی کو کوس رہی تھیں۔ انجم کو برا لگا۔۔۔“ سعدیہ نے بات بڑھائی۔

”کیا تیر مار دیا میں نے؟“ ماں پھر گئیں۔۔۔ تمہیں نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے انجم۔ کام کی رہی ہے نہ کالج کی۔“

”ای مشور“ انجم نے زبان کھولی۔۔۔ ”سارا دن کنیزوں کی طرح آپ اس سے“

لیٹا چاہتی ہیں؟“

”اے ہے لڑکی۔۔۔ کیا ہو گیا ہے تجھے۔۔۔ کونسا کولہو کے میل کی طرح بچی رہتی ہے وہ کام میں۔۔۔ وہ تو کسی کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ کام کیا کرے گی۔“

”میں نے تو اسے اکثر کام کرتے ہی دیکھا ہے۔ اور بھی تو اس کے برابر کی لڑکیاں ہیں گھر میں۔۔۔“

”ہماری لڑکیوں کا تو اس سے مقابلہ نہ کرو بہن۔“ سعدیہ نے ٹوک دیا۔ بات خاصی الجھ گئی اور اچھی دیر تک بحث ہوتی رہی۔

ریحان کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ ماں، چچی اور دادی کے سلوک کو دیکھ کر طبیعت مکہ رسی ہو گئی۔ صاعقہ کے ساتھ سب کا سلوک ناروا تھا۔ شاید آج انہیں اس بات کا صحیح اندازہ ہوا تھا۔

ریحان باغ میں اتر گئے۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا۔ فضا میں خشکی تھی۔ جس میں سبزے کی باس رہی ہوئی تھی۔ رنگ برنگے پھولوں نے کیاریوں میں جیسے آگ لگا رکھی تھی۔

تناور درختوں جھکی جھکی گھنیری شاخیں ہوئی پھیرے جموم رہی تھیں۔ ریحان اپنی سونپوں میں گم اچھے اچھے نظر آرہے تھے۔

وہ سر جھکانے دھیرے دھیرے درختوں کے مہکتے سلیوں سے بڑھتے پلے جا رہے تھے۔

اپناٹک

دورک گئے

سارے جلدوں کی کوئی پھیر رہا تھا۔ اک مبہم سی لے تھی۔ جو فضا میں نرم بکھر رہی تھی۔

چند جھپٹے رک کر ریحان نے ادھر ادھر دیکھا۔ آواز کی سمت کا اندازہ لگایا۔ آواز انہیں طرف درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے آرہی تھی۔ ریحان مڑے اور اسی سمت چلنے لگے۔ آواز جیسے مقناطیسی کشش تھی جو انہیں کھینچنے لیے جا رہی تھی۔

ایک برگد کے بوڑھے درخت کے گرد گھومنے پر ان کی ٹھالیں سامنے سبزے پر ہلکی۔ صاعقہ بے خودی کے عالم میں درخت کے تنے سے کھلانے نیم دراز تھی۔ اس



کی گود میں ستار تھا۔ اس کی انگلیاں لاشعوری طور پر تاروں کو پھیر رہی تھیں۔  
وہ ستار بجا نہیں رہی تھی۔ یوں ہی تاروں سے کھیل رہی تھی۔ نظروں کا جمود بتا رہا تھا  
کہ وہ لاشعل سوچوں کے تانے بانے میں الجھی ہوئی ہے۔ بے چین خیالوں میں ڈوبی  
ہوئی ہے۔

اس کے ڈوبنے کا انداز کتنا دافریب تھا۔

ریحان کا بے ساختہ جی چاہا کہ وقت کے پاؤں کی زنجیر بن کر اس کی رفتار کو یہیں روک

لے لیں۔

لمحاتِ تحفہ جاہلیں۔ صاعقہ اسی انداز میں ڈوبی رہے۔

اور

29

درخت کی جھولتی شاخوں کا سہارا لیے اس کے ڈوبنے کے دلفریب انداز میں کھولے

سہولتیں۔

لیکن

وقت رگ نہ سکا۔

لمحات تحمید:۔

جائے کوئی آبیٹ ہوئی یا دل کی دھڑکن آوازِ پابن گنتی تھی۔ صاعقہ کی نظروں کا ہموار

نوٹ کیا۔

اس نے گردن موڑ کر دائیں طرف دیکھا۔

”سبحان۔۔۔۔۔“ اک حیران سی۔۔۔۔۔ ”بہم سی آواز اس کے لبوں سے نکلی۔ اس

آنکھوں میں وہ کیفیت لہرائی جو سینے حقیقت بن جانے پر آنکھوں میں اهل جانی

۷

لیکن

دوسرے لم

اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔

اس پر قہر بہت طاری تھی۔

۴  
جائے

لیکن جلد ہی گجرات پر قابو پالیا۔ دماغ میں اس شقت و گجرات کو چھپانے کی بات آگئی۔

”محبے؟“ کشادہ آنکھیں حیرت سے کچھ اور کھل گئیں۔  
 دو قدم اٹھا کر اس کے قریب آئے اور بولے۔ ”تمہیں داوی ضرور یاد ہی ہیں۔“

ہاں

”کیوں؟“

”شاید ان کی چاییاں۔۔۔۔۔“

"ا۔۔۔۔۔و۔۔۔۔۔!" صاعقہ ایک دم سبم گئی۔ اس کی خوبصورت

آنکھوں میں ڈر کے تاریک سائے لہرا گئے۔ مضرب اتارتے ہوئے وہ بری طرح گھبراہی تھی۔ ”وہ غصہ ہو رہی ہوں گی“ وہ بڑبڑائی۔

”بہت!“

صناعت نے ستار ایک طرف رکھ دیا۔ ”میں قطعاً بھول گئی تھی۔۔۔۔“ وہ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر جانے لگی۔

”بھولنے کی سزا بھی تو پاؤ گی۔“ رحمان نے شوخی سے کہا۔

”سزا تو مقدمہ بن چکی ہے۔“ آہستگی سے کہہ کر صاعقہ تیز قدموں سے چل دی۔  
ریحان اسے دیکھتے رہ گئے۔

صاعقہ کے لمحے کی افسردگی نے رحمان کو بھی افسردہ کر دیا۔ پہلے ہی طبیعت مکدر تھی۔ اس پر یہ مایوس محکم۔۔۔ وہ بے طرح افسردہ منظر آنے لگے۔

صاعقتہ جب تک غمظروں سے اوچھل نہ ہو گئی۔ وہ اسے دیکھتے

درخت کے تنے کے قریب سناور دکھا تھا۔

انہوں نے ستار کی طرف دیکھا اور جانے کہ

معاذ کی جگہ بیٹھتے ہوئے انھوں نے ستار اٹھایا مضراب لی اور ستار کے تاروں پر ان کی ٹھیکیاں رقص کرنے لگیں۔

اور

کافی دیر بعد صاعقہ واپس لوٹی تو باغ کا شناسا ستار کے عین سروں سے ٹوٹ رہا تھا۔



وہ بے قدموں سے آگے بڑھی۔  
جھجکتی سی نگاہ ڈالی۔

ریحان بے خود تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے۔ اور  
اٹھکیاں تیزی سے تاروں کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ نغمے ابل رہے تھے۔ تار جھنجھنا رہے  
تھے۔ اور ساری فضا میں درد بکھرا ہوا تھا۔

صاعقہ آج ریحان کا یہ نیاروپ دیکھ کر ششدر و مبہوت رہ گئی۔  
وہ دیکھتی رہی۔

ریحان کی وجہ انی کیفیت عروج پر تھی۔

تار چنچ رہے تھے۔ اور ان چنچنوں میں صاعقہ کو اپنی زخمی روح کی پکار سنائی دے  
رہی تھی۔

اس پر مجنونانہ سی کیفیت طاری ہونے لگی۔

استیا عظیم فن کار۔۔۔۔۔ جس نے اس کے دردِ دل کو چھو لیا تھا۔ صاعقہ کا جی چاہا  
اس کے قدموں سے لپٹ جائے۔ ان اٹھکیوں کو تھام لے جو اس کی روح کے تاروں کو  
چھیر رہی تھیں۔

تار چنچتے رہے۔ درد فضا میں بکھرتا رہا۔

ریحان پر بے خودی طاری رہی۔

”اُف ریحان“ صاعقہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ آنسو بے  
اختیار آنکھوں سے کرنے لگے۔

”بس کرو۔۔۔۔۔ ریحان بس کرو۔۔۔۔۔ وہ چنچ چنچ کر کہنا چاہتی تھی۔ لیکن کہ نہ  
سکی۔

وہ بے اختیار ہو گئی۔

اور بے اختیار نہ ریحان کی طرف بڑھی۔ اس عظیم فنکار کے قدموں کو چھونے کے  
لیے۔ اس کی درد بکھیرتی اٹھکیوں کو تھام لینے کے لیے۔

لیکن

دفعتاً اسے ہوش آگیا۔ وہ کیا کرنے والی تھی۔ اٹھاروں کی چپش دور ہی سے کیا کم نمی

اسے ان اٹھاروں سے دور رہنا چاہیے۔ دور۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔ اور دور!

وہ پلٹ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

تیزی سے بھاگتی رہی۔

دور۔ دور۔۔۔۔۔ وہ ان اٹھاروں سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔





اس موسم میں شام نگر کے باغوں میں پکنک تو اب اک رسم ہی بن گئی تھی۔ ہر سال یہ پکنک اک خاص اہتمام سے منائی جاتی۔ سارا کنبہ اکٹھا ہوتا اور تین چار دن ان مہکتی فضاؤں میں جی بھر کر لطفِ زندگانی اٹھایا جاتا۔

حسبِ سابق اس سال بھی پکنک کا پروگرام تھا۔ تیاریاں زوروں پر تھیں، خدام اور کنیزوں کا ایک قافلہ ساروانہ ہو چکا تھا تاکہ اہل خانہ کے پہنچنے سے پہلے ضرورت و آرام کی ہر چیز تیار رکھی جائے۔

چھوٹے بڑے پکنک کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ سمیرا نے تو پُھولوں کی مناسبت سے لباس تیار کروائے تھے۔ خاندان کی سب جوان لڑکیاں اُمنگوں اور چاہتوں سے اپنے لباسوں کی ترتیب میں مصروف تھیں۔

خوشی کی اک لہر تھی۔ جو گھر کے ہر فرد کو چھوتے ہوئے گزر رہی تھی۔ ریحان بھی اک نئی رنگ اک نئے ولولے سے تیاری کر رہے تھے۔ صاعقہ کی قربت ان دنوں میسر آنے کی بڑی توقع تھی۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنیں اس رنگین فضا میں صاعقہ تک ضرور پہنچا دیں گے۔

لیکن خوشی کی لہر صاعقہ سے ٹکرا کر رنج و غم کی ندی بن جاتی تھی۔ وہ آجکل کتنی پریشان تھی۔ طوفانوں میں گھر کر رہ گئی تھی۔ ریحان کا بڑھتا ہوا التفات ساری ذہنی پریشانیوں کا موجب تھا۔ ان کی نظروں کی ملائت۔۔۔ خاموش تعاقب اور اندازِ شیفٹ سے وہ بے خبر نہ تھی۔ لیکن اس کا ذہن ان کی صداقت سے انکاری تھا۔ وہ اس پہلے ہوئے رویے کو ریحان کی جدت پسند طبع کا اک کرشمہ سمجھ رہی تھی۔ بہرہ و پینے دوستوں اور ہم جلیسوں کی دل لگی اور قہقہوں کے لیے سلمان فراہم کرنے کے لیے اک نیا

انجم پھوپھی اور فخر چچا تو گھر والوں کے ذہنی دھارے نہ بدل سکے تھے۔ ہاں اس نے اپنے ہم عمر ساتھیوں کی سوچ کے رخ کسی حد تک ضرور موڑ لیے تھے۔ اور اب ریحان کے بدلے ہوئے رویے سے متقریباً سب نوجوانوں کا رویہ صاعقہ سے کسی حد تک نرم ضرور ہو گیا تھا۔

اب اسے اپنی محفل میں شرکت کی دعوت دی جاتی۔ سینما کا پروگرام ہوتا تو اسے عموماً کیا جاتا۔ گھر میں کوئی تقریب ہوتی تو اس کی شرکت دوسرے افراد کی طرح ضروری سمجھی جاتی۔ حسن بانو کو کوفت ہوتی۔ سعدیہ اور فوزیہ غزاقی رہتیں۔ لیکن تھی پود نے اپنے رویے میں خاصی لچک پیدا کر لی تھی۔ صرف سمیرا واحد فرد تھی جس کے رویے میں تبدیلی نہ ہوئی۔ صاعقہ اب بھی اس کی نظروں میں تیج تھی۔ منحوس تھی۔ بد شکلیوں کا عنوان تھی۔ یہ سب اس کی والدہ فوزیہ کی تربیت کا نتیجہ تھا۔

پکنک کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ ٹینڈے نے صاعقہ سے چلنے کی ہر زور سفارش کی تھی۔ گلرخ، شاہرخ اور فریدہ نے بھی یاد دہانی کرائی تھی۔ لیکن صاعقہ پکنک پر نہ جانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ ان سب کا التفات تو اس کی ذہنی پریشانیوں میں تھے اضافے کا باعث بنتا جا رہا تھا۔ وہ اس اخلاق و مروت کو ریحان کی سوچی سمجھی سازش سے تعبیر کر رہی تھی۔ مطمئن ہونے کی بجائے وہ خوف زدہ سی ہو جاتی تھی۔

پکنک پر روانگی کا دن آپہنچا۔ صبح ہی صبح یہ قافلہ کوچ کرنے والا تھا۔ موٹروں کی قطار سی تھی۔ جو گیٹ تک جا پہنچی تھی۔ کچھ ضروری سامان و مینگنوں میں لاوا جا رہا تھا۔

صاعقہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اداس پریشان افسردہ زندگی نے کاش اسے بھی جینے کا حق دیا ہوتا۔ کتنی پہل پہل تھی الحما میں۔ اس کی ہم عمر لڑکیوں کے شوخ و شنگ لباس ان کے سینے میں دھڑکتی ہوئی خوشیوں، اُمنگوں اور ولولوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ مسکراتے چہروں پر ذہنی سکون و طمانیت کی کتنی واضح جھلک تھی۔ وہ ٹینڈے، شاہرخ اور فریدہ وغیرہ کے اصرار کے باوجود پکنک پر نہیں جا رہی تھی۔

پچھلے ہی سال کا تو واقعہ تھا۔ گہما گہمی اسی طرح تھی۔ صبح ہی صبح کارس الحما کے پورچ سے لے کر گیٹ تک اپنی قطار بناتی چلی گئی تھیں۔ بجھے بجھے دل سے وہ بھی تیار ہوئی تھی۔



اور پورچ میں ایک ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی کاروں میں سوار ہونے والوں کو دیکھ رہی تھی۔  
آجاؤ صاعقہ! انجم نے پھوپھی نے بلایا تھا۔

”اس موٹر میں جگہ نہیں ہے۔“ ریحان نے سٹیئرنگ تھامتے ہوئے کہا تھا اور اس کے اٹھتے قدم پر آم سے کی سیڑھیوں پر ہی رک گئے تھے۔  
”کیوں سبک کرتے ہو ریحان۔۔۔۔۔“ چمکلی سیٹ پر حسین لڑکیاں بیٹھ سکتی ہیں۔“

”صاعقہ نہیں۔“ ریحان نے ہنس کر آہستگی سے کہا تھا۔ لیکن اس نے اپنا نام سن لیا تھا۔  
”کیوں؟“

”پھوپھی جان کیوں اہل ہمارے ساتھ سوار کرا رہی ہیں۔۔۔۔۔ آپ چاہتی ہیں راستے ہی میں ٹکڑ ہو جائے۔۔۔۔۔“  
”ریحان۔۔۔۔۔ چپ رہو“ انجم پھوپھی نہیں چاہتی تھیں۔ یہ آواز صاعقہ تک پہنچے۔

”غلط تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ ہماری زندگی عزیز نہیں تو بے شک آزما دیکھیں۔“  
”اسے بھی تو جانا ہے آخر۔۔۔۔۔“  
”سلمان ولی ویگنوں میں بٹھا دیجئے۔۔۔۔۔ فکر ہو بھی گئی۔ تو مالی نقصان ہو گا۔ جانی نہیں۔۔۔۔۔“ ریحان نے قہقہہ لگایا تھا۔

اور صاعقہ اٹے پاؤں اپنے کمرے میں بھاگی تھی۔  
ریحان کو بری طرح ملامت کرنے کے بعد انجم پھوپھی نے آکر کتنے پیار سے اسے پرکارا تھا۔ کتنی تسلیاں دی تھیں۔ کس محبت سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔ اور جب بھی وہ چپ نہ ہوتی تو خود بھی رونے لگی تھیں۔ کتنا فراخ اور درد مند دل تھا ان کے سینے میں۔ صاعقہ والہانہ ان سے لپٹ گئی تھی۔

لیکن اس پیار کے باوجود ریحان کی باتوں کی خلش دل سے نہ نکلی تھی۔ پچھلے سال کا واقعہ پشیمان بن گیا تھا۔ اور فرید، شاہ رخ اور شینہ کے محبت بھرے اصرار کے باوجود وہ پشیمان نہ پھلانگ سکی تھی۔

اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی رنگ و بو کے کے جھلملاتے سیلاب کو دیکھ رہی تھی۔  
الحراء کے بیرونی برآمدے میں ایک مسرور سا شور تھا۔ نئی پود آج ولای حسن پانوں سے بھی مرعوب نہ تھی۔ ہنسی خوشی پہچھا رہے تھے سب۔۔۔۔۔  
ریحان آئے۔ فاختی سوٹ میں ان کا مردانہ حسن کتنا نکھرا ہوا تھا۔ کتنے مسرور نظر آ رہے تھے وہ۔۔۔

آتے ہی انھوں نے برآمدے اور پورچ میں جمع شدہ لوگوں پر اک اچھتی سی جھاد ڈالی۔ نکلیں گوہر مقصود نہ پا کر حیران سی ہو گئیں۔ لوگ کاروں میں بیٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ ریحان جلدی سے کاروں کی طرف آئے۔ ایک ایک گاڑی دیکھی۔۔۔۔۔ رنگ و بو کا سیلاب موٹروں میں سما گیا تھا لیکن صاعقہ انھیں کہیں نظر آئی۔ کیا وہ پکنک پر نہیں جا رہی؟

اس خیال سے ان کی ساری خوشیوں پر جیسے اوس پر گئی۔  
کار میں بیٹھنا شروع ہو گئیں۔ اسد، فرخ، فرید وں اور شاہد نے موٹر کا ہارن زور سے دے کر انھیں متوجہ کیا۔  
لیکن ریحان ان کی طرف دیکھے بغیر اندر کی طرف لپکے۔ وہ صاعقہ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔

برآمدے میں آیا سے مڈھیر ہوئی۔  
”صاعقہ کہاں ہیں؟“ ریحان نے جلدی سے پوچھا۔  
”اپنے کمرے میں۔“  
”تیار ہو رہی ہیں؟“  
”نہیں۔“  
”کیوں؟“  
”وہ تو نہیں جا رہیں۔“  
”کیوں؟“

”اللہ جانے۔ بہتیرا کہا ہے۔ ایک ہی نہ۔۔۔۔۔“  
آیا جانے کیا کہتی رہی۔ ریحان تیز قدموں سے اس کے کمرے کی طرف چل دیئے۔  
”صاعقہ؟“ پر وہ ہٹاتے ہوئے انھوں نے ملائت سے پکارا۔







کتنی ہی دیر اس پر دے کو دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ جو ان کے جانے کے بعد لرز رہا تھا۔  
جانے کیوں اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا۔

ریحان چلے گئے تھے۔ شاید اس کا دل متمنی تھا کہ اس کے کہنے کے باوجود وہ یہیں ٹھہرے رہتے۔

ان کا چلے جانا ہی تو ٹھیس تھی۔ جو بھرے پیمانوں کو لگی۔۔۔ لبالب پیمانے نے چمک جاتے ہی تو تھے۔

وہ خوب روئی۔۔۔۔۔

دو پہر کے کھانے کے لیے جب آیا اسے کہنے آئی، تو اس کی سرخ سرخ متورم آنکھوں کو دیکھ کر یہ قرار ہو گئی۔ اس کی حرماں نصیبی پر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ لیکن کسی قسم کی جذباتی کمزوری کا اظہار کر کے وہ اسے اور غمزدہ نہ کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر یہ کوئی نئی بات بھی تو نہ تھی۔ سالوں کے سیاہ و سفید سینوں پر یہ دھبے پڑتے ہی چلے آئے تھے۔

جماعت نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

”بھوک نہیں ہے آیا۔۔۔۔“

”تھوڑا سا کھا لو۔۔۔۔۔!“

”مطلقاً جی نہیں چاہ رہا۔۔۔۔۔“

”بھئی تو مان لیا کرو بات۔۔۔۔۔ چلو میری خاطر دو لقمے لے لو۔ تم نے کہا نا کہ کیا

”تو میں بھی نہ کھاؤں گی۔۔۔۔۔“

”یہ بڑی بُری عادت ہے تمہاری۔“

”تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

لیکن جی نہیں، جام رہا۔

”سہت الجہا“ محمد بن عبد اللہ

ہست ہستی ہے۔ جیسے تخت، چوک لک رہی ہے۔ لیکن میں کھڑا نہیں

سکھو ۱۱

الحمد لله الذي هدانا لهذا الذي كنا لنهتدي لولا أن هدانا الله

اور اسے ایسا ہی خطرہ اٹھنا پڑا۔ واقعی جس دن بھی اس نے لکھنا نہیں لکھا۔

1000

مونس آیا کی خوشنودی کے لیے صاعقه انجم اور ہیم

جلوست ہزار تھی۔ اس نے لباس بھی تبدیل کر کے کرنا۔

کے ہر ایک پروردگار کے پاس ہے۔ کیا۔ روئے سے چہرہ اترا اترا سا تھا۔

کے لئے کہہ کر معصومہ نے اپنے آج کے فرائض کو ختم کیا۔

تھا کہ اس کے مرے میں داخل ہوئے بی اس کی منظر میز کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے

ریحان پر پری۔ میز پر کھانا چننا ہوا تھا۔ لیکن ریحان نے شروع نہیں کیا تھا۔ سر قدرے

مکمل رہا تھا۔ بڑے پریشان کے منظر آ رہے تھے۔

صاعقه آهیں دیکھ کر ششدر سی رہ گئی۔

کیا وہ اس کی وجہ سے پکٹ پڑ نہ گئے تھے؟

دل سے اک مسرت بھری لہرائی

دماغی نسلوں سے ٹکراتے ہی پاش پاش ہو گئی۔ صاعقہ کو چکر مہا آگیا۔ وہ گر پڑا۔

نے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ کہنیاں میز پر ٹکا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام

یہاں یہاں کے لوگوں کے لئے ہے

[illegible]

کھیتی ذہنی دورسار تحصیل

یہ کیوں کر مشہور ہو گیا۔

یہ فاصلہ کم سے کم ایک سال کا ہو۔

کرم ضمیمہ کے پانچواں حصے کا۔

۱۔ اسی خان یہی سوچتے رہے۔

یہاں سے ال بار پھر ڈکاکا رہی تھی۔ یقیناً اور بے یقینی کا خدا لہذا پر نظر تھا۔ وہ

ہیں۔ لیکن اس سے ٹکرا کر ڈوب رہی تھی۔

قصائد ریحان نے پھر یہاں تصانیف صاعقہ نے۔۔۔ اک خاموشی مسلط تھی۔ سینہ:

نہروں کو لایا اور پھر پھیر دیا تھی۔



انہوں نے کہا تو کیا۔

کہنے لگے بے چین اور بے قرار منظر آئے وہ۔۔۔

انہوں نے کچھ کہنا چاہا

لیکن

صاعقہ اٹھ کر چل دی۔

رجحان کھانا کھانے کی بجائے بے دردی سے سگریٹ پھونکتے رہے۔

”آیا“

”ہوں“

”ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو۔۔۔“

”آیا۔۔۔!“

”ہبہ بھی چکو۔۔۔“

”آیا۔۔۔ سورج مغرب سے بھی نکل سکتا ہے؟“

”قیامت کے دن نکلے گا۔“

”آیا۔۔۔!“ بے اختیارانہ چیخ اٹھی۔ اور آیا کے ہاتھوں میں چائے کی پیالی

لڑ گئی۔

”کیا ہوا بیٹی؟“ پیالی میز پر رکھتے ہوئے آیا نے کھیرا کر پوچھا۔

”کبھی تو دل خوش ہونے دیا کرو آیا۔۔۔ کبھی تو خوش ہونے دیا کرو۔“ صاعقہ

نے ٹکیے پر سر ہنچ دیا۔

”بیٹی۔۔۔!“

”کبھی تو دل خوش ہونے دیا کرو۔۔۔“ اس نے ٹکیے میں منہ چھپا لیا۔

”کیا ہوا میری بچی؟“۔۔۔ آیا اس پر جھک گئی۔ شفقت سے ہاتھ اس کے بالوں

پر ہیرتے ہوئے پوچھا۔

صاعقہ اسی طرح ہڑی بڑھاتی رہی۔

”بتاؤ کی نہیں؟“ آیا نے کندھوں سے پکڑ کر اسے اٹھایا ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ صاعقہ اپنے سیمائی جذبات پر قہقہہ پاکر



آہستگی سے بولی۔  
لیکن اس کچھ نہیں سے آیا کی تسکین نہ ہو سکی۔  
”کیا بات ہے؟“ صاعقہ کے قریب بیٹھ کر آیا نے اس کی پریشانی سے ہال ہٹا دیا  
ہوئے قدر سے مسکرا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔“ وہ بڑبڑائی۔

”کوئی خواب دیکھا ہے؟“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ خواب ہی دیکھا ہے۔“

”کیا دیکھا؟“

”کچھ نہیں۔۔۔“ صاعقہ نے سر مٹھی میں ہلا کر کہا۔

”بتاؤ تو سہی۔۔۔“ آیا نے پیار سے چمکارا۔ ”تعبیر بتاؤں گی۔۔۔“ کیسا

خواب تھا۔

”بڑا سہانا۔“ صاعقہ گہرا سانس لے کر بولی۔

”پھر اس قدر گہرائی کیوں ہو؟“

صاعقہ نے اک گہری سانس لے کر آیا کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے لیے صبح کی

چائے لے کر آئی تھی۔ لیکن صاعقہ کی پریشانی نے اُسے بھی پریشان کر دیا تھا۔

لیکن وہ بھی تو مجبور تھی۔

”کیا دیکھا تھا؟“ آیا نے اس کے مرمیس شانوں پر ڈھلکتی ڈوریوں کو درست کیا۔

مکابی ریشمی مٹاؤں کے پھیلاؤ کو سمیٹ کر اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی ڈوری کی گرہ ڈال

دی۔

صاعقہ چپ چاپ میٹھی سامنے دروازے کو دیکھتی رہی۔

”کیسا خواب تھا؟“

”کہہ دیا نا بڑا سہانا۔“

”گب دیکھا۔۔۔؟“

”گب۔۔۔؟ ہر روز دیکھتی ہوں آیا۔۔۔ مسلسل دیکھ رہی ہوں۔

آج رات بھی دیکھا۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

”یہی تو پوچھتی ہوں۔۔۔ کیا دیکھتی ہو۔۔۔؟“

”دیکھتی ہوں۔۔۔ دیکھتی ہوں آیا۔۔۔ سورج مغرب سے نکل رہا ہے۔۔۔

مغرب سے۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن یہ ممکن تو نہیں۔۔۔ تم۔۔۔ تم کہتی

ہو۔۔۔ سورج قیامت کے دن مغرب سے نکلے گا۔۔۔ آیا۔۔۔ آیا۔۔۔ یہ کہہ کر تم

نے میرے حسین خواب کا طلسم توڑ دیا ہے۔“ اس نے آیا کی چھاتی میں منہ چھپا لیا۔

آیا نے محسوس کیا کہ اس کا جسم دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ آیا نے اسے

باروؤں میں سمیٹ لیا۔ پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ”گہرائی کی بات نہیں

ہی۔۔۔ خواب کی تعبیر الٹ ہوتی ہے۔ جو کچھ دیکھتی ہو۔۔۔ اس کے برعکس بات ہو

گی۔۔۔“

”آیا۔۔۔“ صاعقہ تڑپ کر اس سے الگ ہو گئی۔ سر کو اضطرابی جنبش دیتی

ہوئی وہ بستر پر گر گئی اور تکیوں میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

”یا اللہ“ آیا بے طرح گھبرا گئی۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔“ گہرائی گہرائی سی

آیا کبھی پیار سے تھپک کر۔۔۔ کبھی اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے، کبھی اس کے

بالوں کو سہلاتے ہوئے رونے کا سبب پوچھنے لگی۔

لیکن

وہ سسکتی رہی۔۔۔ کچھ نہ بتایا۔

”اللہ جانے کیا ہوتا جا رہا ہے اسے۔“ آیا بڑبڑائی۔۔۔ ”کل پکنک پہ چلی

جائیں تو اچھا تھا۔ طبیعت بہل جاتی۔ صبح شام کوئی کوئی رہتی ہو۔ صحت کتنی گرتی جا

رہی ہے۔ اٹھو۔۔۔ اٹھو میری بچی۔۔۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے لو پیالی۔۔۔“

”آیا۔۔۔ تم جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔۔۔!“ صاعقہ نے

لجھت سے کہا۔

”چائے تو پی لو۔“

”تم جاؤ۔۔۔ چلی جاؤ۔۔۔ مجھے نہ ستاؤ۔۔۔ چلی جاؤ“ صاعقہ چیخ اٹھنے کو

تھی۔

آیا چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

صاعقہ کی یہ حرکت اُس کی ذہنی پریشانیوں کی غماز تھی۔

پریشان وہ کئی دنوں سے تھی۔ لیکن کل کے واقعہ سے تو پریشانیوں جنون کی



حدود کو چھوئے لگی تھیں۔

ریحان پکنک کے لیے کس اصرار سے اسے لینے آئے تھے۔

وہ نہیں گنتی تھی۔

ریحان خود بھی رہ گئے۔

کیوں؟؟؟

یہ کیوں استنا پھیلتا گیا، استنا پھیلتا گیا کہ اس کی ساری ہستی اس کی پیٹ میں آگئی۔

اس کی ذہنی صلاحیتیں اور دماغی قوتیں اس کیوں کا جواب نہ دے سکیں۔ ریحان کسی مسلسل مذاق کی بنیادیں استوار کر رہے تھے۔

یقیناً یقیناً

صاعقہ کی ذہنی کیفیتوں کا ایک ہی جواب تھا۔ دماغی قوتوں کا متحدہ فیصلہ۔

لیکن اس منفی کے باوجود اس کے دل کی دنیا میں کچھ رنگین سی پرچھائیں لہرانے لگی تھیں۔ اک خوش فہمی جسے وہ کسی طور سر اٹھانے نہ دیتی تھی، پیدا ہو ہی گئی۔

جذباتی تضاد نے صاعقہ کو پاگل بنا رکھا تھا۔ رات اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اس کا سیمیں بدن دُکھنے لگا۔ اس کا سینہ پھٹ جانے کو تھا۔ گھبرا کر وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

جانے رات کا کونسا پہر تھا۔ وہ اپنے سلگتے جذبات کی تسکین کے لیے چمن کی طرف آ چکی تھی۔

چاند کا سفینہ نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں تیر رہا تھا۔ ہر چیز پر چاندنی کا عکس لرزاں تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے کسی نے اندھیروں پر سیمائی خول چڑھا دیا ہو۔ اس سیمائی خول میں لیٹے ہوئے اندھیرے بڑے دلکش تھے۔

لیکن صاعقہ کے من کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ پارے کی طرح مضطرب تھی۔ گھبرا کر وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر آٹھنچی۔ گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ اپنے پتے ہوئے ذہن سے بہت کچھ پوچھنے لگی۔

”کون؟“

اور صاعقہ نے اس آواز پر سر اٹھا کر دیکھا۔

بالکل سامنے

ریحان کھڑے تھے۔۔۔ وہ گھبرائی۔ اس کا دل بے طرح دھڑکا۔

”صاعقہ؟“ ریحان نے ایک پاؤں سیڑھی پر رکھ دیا۔ ان کے لباس شبنوابی کی

سبھری ڈوریاں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔

صاعقہ کی ساری ہمت جیسے کسی نے سلب کر لی۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی صدا نہ نکل سکی۔

”صاعقہ؟“ ریحان قدرے جھٹک گئے۔ وہ اس کے کتنے قریب تھے۔ گھبرا کر وہ

اُٹھ کھڑی ہوئی، بلکہ گلابی رنگ کے ریشمی کماؤن کی سمٹی تھیں پھیل گئیں۔ اس کا سبھری ہتکڑ کماؤن میں لپٹا ہوا کتنا حسین منظر آ رہا تھا۔ سیاہ بکھری زلفیں۔۔۔ نیند کے نشے سے مخمور آنکھیں، تھکا ہوا حسین چہرہ۔ ریحان کو وہ کسی گیت۔۔۔ دلنوازی گیت کا باثر معلوم ہو رہی تھی۔

”اس وقت یہاں کیا کر رہی تھیں؟“ ریحان نے اس کے جانے کے ارادے کو

بھانپ لیا۔

”کچھ نہیں۔“

”جاتی ہو کیا وقت ہے؟“

”نہیں“

”دو بج رہے ہیں۔“

صاعقہ نے حیرانگی کا مطلقاً اظہار نہیں کیا۔ اسے وقت کا بخوبی اندازہ تھا۔

”اب تک کیوں جاگ رہی ہو۔۔۔“ بڑی ہمت سے ریحان نے پوچھ لیا۔ صاعقہ

جواب دیے بغیر مڑی۔

”صاعقہ!“ ریحان جلدی سے سیڑھیوں پر قدم رکھتے اس کے برابر آ گئے۔ لیکن

وہ لڑکی نہیں۔۔۔ برآمدے میں آگئی۔ ریحان نے پھر اُسے پکارا۔ اس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

کچھ سوچ کر ریحان بڑھے۔ صاعقہ کے سامنے آتے ہوئے انہوں نے اس کا

رستہ روک لیا۔ ”میری کسی بات کا جواب بھی دینا تمہیں گوارا نہیں؟“ کتنا کلمہ تھا۔ کتنی

سبکدوشی تھی۔

صاعقہ نے دراز پلکوں کو اٹھا کر انہیں دیکھا۔۔۔ مہربانی دڑوں سے چاندنی



برآمدے میں پڑ رہی تھی۔ ریحان اندھیرے میں تھی۔ لیکن اُن کا خاکہ لپالو کے مجسمے کی طرح منظر آ رہا تھا۔

گھبرا کر صاعقہ نے نظریں جھکا لیں۔

”خطاکار سنگینی جرم کے باوجود مستحسن سلوک کا متمنی رہتا ہے۔ میں۔۔۔ میں اپنی خطاؤں۔۔۔“

”مجھے جانے دیں“ وہ گھبراہٹ سے گرا چاہتی تھی۔ ریحان کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت ہی نہ رہی تھی۔

”کچھ دیر کے لیے رُک جاؤ“ ریحان کا انداز جذباتی ہو گیا۔

”کیوں؟“ نہ جانے کیوں صاعقہ کے لبوں سے نکلا۔

”کیوں؟“ ریحان نے اسے دیکھا۔۔۔ نیم وا خواہیدہ سی نظروں سے صاعقہ نے ستون کا سہارا لے لیا۔۔۔ ریحان کیا کہنا چاہتے تھے، وہ سمجھنے کے باوجود سمجھنا نہ چاہتی تھی۔

ریحان اس کے قریب آ گئے۔ ان کی مخمور نگاہوں میں پیسار کے مسحور کن جذبے لہرا رہے تھے۔ صاعقہ نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

”شاید۔۔۔ شاید مجھے یہ بات نہ کہنا چاہیے تھی۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن میں خود نہیں جانتا۔۔۔ صاعقہ۔۔۔“

اُن کی پوری بات سننے بغیر صاعقہ بھاگی۔

اور بھاگتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر مسہری پر گر گئی۔

اس کا دم یوں پھول رہا تھا جیسے میلوں کی مسافت دوڑتے ہوئے ٹپ کر آئی ہو۔

اور پھر باقی رات اُس نے آنکھوں میں کٹ دی۔ اور جب اس کا ذہن معمول پر

آیا۔ تو

وہ

ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔

”کیا سورج مغرب سے بھی نکل سکتا ہے۔“

اس کا جی چاہتا تھا کہ اس انہونی بات کو اٹل حقیقت سمجھ لے۔

لیکن ناممکن سمجھ لینا بھی تو اس کے بس میں نہیں تھا۔

صبح سویرے جب آیا اس کے لیے چائے کی ٹرے لے کر آئی۔ تو وہ اسی ادھیر بن میں تھی۔ کبھی یقین سے ہم کنار تھی۔ اور کبھی بے یقینی کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ اسی گومگو کی کیفیت میں اُس نے آیا سے پوچھا تھا کہ ”کیا سورج مغرب سے بھی نکل سکتا ہے۔۔۔“

اور

آیا کے جواب نے اُس کے جذبات کی کرچیاں کرچیاں کر دی تھیں۔

صاعقہ کا یقین محکم ہو گیا۔

کہ

سورج کبھی مغرب سے نہیں نکل سکتا۔

ناممکن کبھی ممکن نہیں بن سکتا۔

اور۔۔۔ اور!

ریحان وہ کبھی نہیں ہو سکتے۔ جو آجکل بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بڑے ہی

ذہنی اتار چڑھاؤ کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ ریحان کے اس طرح بننے کی کوشش کا وہ

منہ توڑ جواب دے گی۔۔۔ وہ کسی کمزوری سے مغلوب نہ ہوگی۔۔۔ وہ اپنے وقار کے

تحفظ کے لیے سینے میں پھلتے طوفانوں کا پوری طرح مقابلہ کرے گی۔



ریحان نے ان ذہنی دُوریوں اور خیالی تفرقوں کو جو صاعقہ اور اُن کے درمیان غائب بن چکے تھے، دور کرنے کا عزم کر لیا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ ریحان بیرونی باغ میں ٹہل رہے تھے۔ اپنے اس عزم پر وہ پورے استحکام سے قائم تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی بارے میں سوچ رہے تھے۔ دفعتاً ان کی نگاہ درختوں کے جھنڈ کے عقب میں مرمیس چبوترے پر پڑی۔ وہاں صاعقہ بیٹھی تھی۔ ہلکے پھلکے سفید لباس میں وہ کوئی فردوسی مخلوق نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زرد ٹکڑا تھا۔ بے خیالی کے عالم میں اس کی پتیاں نوچ رہی تھی۔ چہرے پر ہلاکت نہ تھی۔ اک تھکن تھی۔ جو پڑمردگی سے مشابہ تھی۔۔۔ سوگوار شبنمی آنکھوں میں غم کے گہرے سائے رنگ رہے تھے۔

ریحان کے قدم خود بخود اس کی جانب اٹھنے لگے۔ چند لمحوں بعد وہ درختوں کا جھنڈ پار کر کے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

صاعقہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ سوگوار آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے اک چمک ابھری۔

لیکن دوسرے لمحہ یہ چمک بجھ گئی۔ آنکھوں میں تاریکی ہی تاریکی رہ گئی۔ بالکل ایسے جیسے بجلی کی چمک معدوم ہونے پر بادلوں سے کشیف مطاع پر تاریکی ہی تاریکی رہ جائے۔ چہرے پر بیزارگی کا تاثر لاتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لیں۔

”صاعقہ!“ ریحان نے چبوترے کی سیڑھی پر دایاں پاؤں رکھتے ہوئے آہستگی سے پکارا۔

”جی“ بلا جھجک جواب تھا۔ وہ تو جیسے ہر آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لیے ہنسنے لگی تھی۔

”یہاں تنہا“ جی ہو۔ پلٹ کر چلی جاتیں تو اچھا ہی تھا۔“

”میری تنہائیوں کا آپ کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی احساس ہونے لگا ہے۔“ طہنہ لہجہ دل میں نشتر کی طرح اتر گیا۔ لیکن ریحان اس طہنہ کو خفیف سی مسکراہٹ میں ڈبو تے ہوئے بولے۔ ”شکر ہے تم نے استاجان تو لیا۔“

”جان لینے کو تو بہت کچھ جان لیا ہے۔۔۔“ وہ بدستور تلخ لہجے میں طہنہ کر رہی تھی۔

”پھر بھی یقین نہیں۔۔۔“ ریحان آج شاید بعد کی ساری مسافتیں طے کر لینے پہنچے تھے۔

”اندھیرے کو اُجالا کہنا خود فریبی ہوگی“ وہ لا تعلقی سے بولی۔

”صاعقہ“ ریحان نے سر جھکا کر کہا۔ ”میرے جذبات کو یوں مجروح نہ کرو۔“ صاعقہ نے اُن کی جانب بڑی بے باکی سے دیکھا۔ نادام نادام سے ریحان دل کی گہرائیوں میں کس سرعت سے اترے جا رہے تھے۔ لیکن وہ کسی جذباتی کمزوری کا شکار نہ ہونے کا تہیہ کر چکی تھی۔

”آپ کے جذبات قابل احترام ہیں ریحان۔۔۔“ اس کی آنکھوں میں شعلے سے رقصاں تھیں۔ ”مجروح کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ انہیں تو ٹھیس پہنچانا بھی گناہ ہے۔۔۔“

”استنا طہنہ کرو۔۔۔ جس کام میں متحمل نہ ہو سکوں۔۔۔“ وہ تڑپے۔

”اور استنا بنائیے بھی نہیں۔۔۔ جس کی میں متحمل نہ ہو سکوں“ صاعقہ الجھ پڑی۔

”تم کتنا غلط سمجھ رہی ہو۔۔۔ کتنا غلط سمجھ رہی ہو صاعقہ۔“ ریحان کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

”صدق و خلوص کو پرکھ تو لیا ہوتا۔“

”غم بھر پر کھا ہے۔۔۔“ صاعقہ کی آواز رندہ گئی۔ اس کی سوگوار آنکھوں میں اداسیاں کھلنے لگیں۔ اس نے دھیرے سے ریحان کی طرف پشت موڑ لی۔

”صاعقہ۔۔۔ میں بے حد نادام ہوں۔۔۔ جانتا ہوں۔۔۔ طویل برسوں پر

پہلایا ہوا میرا سلوک بھلا دینا تمہارے لیے آسان نہیں۔۔۔ تمہاری حیات کا گزرا ہوا ہر لمحہ میرے لیے رحم رویے پر خونچکاں ہے۔ لیکن میں نادام ہوں۔ تم شلیہ اندازہ بھی نہ



کر سکو۔۔۔ اک اک لمحہ میری روح کے لیے گراں بار ہو مجھ بنا ہوا ہے۔“  
صاعقہ کی پشت پر نظریں جمائے وہ دل گرفتہ سے انداز میں کہہ رہے تھے۔  
صاعقہ گھبرا گئی۔

لیکن  
سنہلے ہوئے اٹھی۔ ریحان کو سر تا پا بغور دیکھا اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔  
اس کے چہرے پر اک آوروہ سی یزاری تھی۔  
”صاعقہ۔۔۔۔۔ ریحان آگے بڑھ کر اس کے سامنے آگئے۔ جذبہ غصہ طلبی  
بخشش کا منتظر تھا۔

”مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔“ ریحان نے اک دل فکار آہ کو روکتے ہوئے صاعقہ کی  
طرف دیکھا۔

”آپ کی ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟“ صاعقہ نے تلخی سے پوچھا۔  
ریحان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ نیم وا خواب ناک سی نظریں اپنا مفہوم واضح کر  
گئیں۔ ان کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ سر جھکا کر آہستگی سے  
بولے۔۔۔۔۔ ”تمہیں کیسے سمجھاؤں۔“

”ریحان۔۔۔۔۔“ صاعقہ ان فسون کار نظروں کے وار سے بہک سی گئی۔  
”صاعقہ“ مسخور کن خوابیدہ سی نظریں پھر اس کی جانب اٹھ گئیں۔  
صاعقہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ دھانپ لیا۔ وہ نظروں کے طلسم سے  
بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے حواس منتشر تھے۔ اور سخت گھبراہٹ طاری تھی۔  
”میری تہہ پٹی تمہارے لیے پریشان کن ہے۔۔۔۔۔ میں خود نہیں جانتا کہ  
سب کیسے اور کیونکر ہوا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“ وہ اپنے عشق کا اعتراف کر رہے تھے۔

”لیکن میں تمہیں یقین۔۔۔۔۔“ قدرے رکنے کے بعد وہ بولے۔  
”ریحان“ صاعقہ نے ان کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا ”مجھے ابھی اپنے آپ سے  
بہرہ روی ہے۔ استمانہ بنائیے کہ میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگوں۔۔۔۔۔“  
”صاعقہ“ ریحان بے قرار ہو گئے۔

”آپ کی تفریق میری زندگی کا مہلک زخم ہوگی۔“ وہ رو دی۔  
”میری زندگی کی اہل حقیقت کو تفریق کا نام نہ دو۔۔۔۔۔“ ریحان مچھانک سے

بولے۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں“ وہ چیخ اٹھی۔۔۔۔۔ ”سورج مغرب سے کبھی نہیں نکل  
سکتا۔ میں ابھی طرح جانتی ہوں۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ سب کچھ جانتی ہوں۔۔۔۔۔“  
گناہگار کو بار بار گناہگار نہ کہو صاعقہ۔۔۔۔۔ گناہوں کا بوجھ پہنچے ہی کچھ کم تو  
نہیں۔ تم احساس دلا کر اسے گراں بار تو نہ بناؤ کہ اٹھانے کی ہمت بھی نہ رہے۔۔۔۔۔“  
صاعقہ نے ریحان کی طرف دیکھا۔ عجز و انکساری کا مجسمہ نظر آرہے تھے۔ کیا یہ  
حقیقت تھی۔

”نہیں۔ نہیں“ وہ دیوانہ وار چیخ اٹھی۔  
”صاعقہ“ ریحان نے قدرے سختی سے پکارا۔  
لیکن وہ ”نہیں نہیں“ کہتی بھاگ گئی۔  
ریحان اس کے مجنونانہ انداز و رویے سے کچھ جوش میں آگئے۔ لپک کر اس  
کے سامنے آگئے۔

اس نے ایک طرف سے کترا کر نکل جانا چاہا۔ ریحان نے اسے کندھوں سے پکڑ  
لیا۔ اپنے مقابل کھڑا کرتے ہوئے بولے ”تمہیں کیوں یقین نہیں آتا؟“  
”چھوڑ دو۔۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔!“  
”پاکل نہ بنو۔۔۔۔۔ ہوش میں آؤ“

ریحان نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔۔۔۔۔ صاعقہ کے آنسو تیزی سے بہہ نکلے۔  
”تمہیں میری باتوں کا کیوں یقین نہیں آتا۔۔۔۔۔ صاعقہ۔۔۔۔۔ میری  
ندامتوں کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ میں اپنا دل چیر کر کیسے تمہیں دکھاؤں۔۔۔۔۔  
میرے سینے میں طوفان ہیں۔۔۔۔۔ میری آنکھوں میں دیکھو۔۔۔۔۔ صاعقہ میری آنکھوں  
میں دیکھو۔۔۔۔۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔ بتاؤ۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ کچھ نظر نہیں  
آتا۔۔۔۔۔“ ریحان پر بنون سا طاری تھا۔ صاعقہ کو کندھوں سے تھامے جھنجھوڑ جھنجھوڑ  
کہہ رہے تھے۔۔۔۔۔ ”میری آنکھوں میں دیکھو۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔“

صاعقہ نے ان کی آنکھوں میں دیکھا اور روتے روتے ہنس دی۔  
”کہو۔۔۔۔۔ کہو نا۔۔۔۔۔ کچھ نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔“ ریحان اسی وار تلخی سے پوچھ  
رہے تھے۔



”آتا ہے“ وہ روتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے بولی۔

”کیا؟“ ریحان تیز سے بولے۔

”ظنر۔۔۔ تسخر۔۔۔ مذاق۔۔۔“ وہ روتے ہوئے ہنسے جا رہی تھی۔

”صاعقہ۔۔۔“ ریحان تڑپ کر چیخے۔

”ہٹ جاؤ مجھے چھوڑ دو۔“ صاعقہ مجنونانہ انداز میں بولی۔ ریحان نے ہاتھ د

پٹائے۔

”چھوڑ دو۔۔۔“ مجھے چھوڑ دو۔“ بڑے وحشیانہ طریق سے ان کے ہاتھ جھٹک کر

وہ وہاں سے بھاگ گئی۔

ریحان سکتے میں آگئے۔

اور

جب

کئی لمحوں بعد ان کا سکتہ ٹوٹا۔

تو صاعقہ وہاں نظر نہ آ رہی تھی۔

ریحان آج ازل وابد کی مسافتیں طے کر لینے پر کچھ اور ٹٹل گئے تیز قدم اٹھاتے

ہوئے اس کے تعاقب میں چل دیئے۔

جب ریحان صاعقہ کی خواب گاہ کا بھاری سبز پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو وہ

مسہری پر پڑی ٹکیے میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ آیا اس پر ٹھکی ہوئی بڑی

محبت سے رونے کا سبب پوچھ رہی تھی۔

ریحان آگے بڑھے۔

آیا نے انہیں دیکھا۔ زرد چہرہ، خشک ہونٹ، بکھرے بال اور پریشان نظریں

بہت کچھ کہہ گئیں۔

”نہ چائے کیا ہو گیا ہے میری بچی کو“ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”تم جاؤ آیا۔“ ریحان نے سنگین سے لہجے میں کہا۔

آیا تعمیل حکم کے لیے کمرے سے نکل گئی۔

ریحان مسہری کے قریب آئے۔

”صاعقہ“ انہوں نے مایوسیوں میں ڈوبتی آواز میں پکارا۔

لیکن وہ اسی انداز میں پڑے رونے لگی۔

ریحان قدرے جھٹکے۔ ایک ہاتھ مسہری کے ٹکیے پر تھا۔ دوسرے سے صاعقہ کا

کندھا ہلایا۔

صاعقہ نے سر اٹھایا۔ سرخ سرخ آنکھوں سے لپٹیں نکل رہی تھیں۔ آج اس

کے سینے میں طوفان ٹکرا رہے تھے اور اس کی ساری ہستی اس ٹکراؤ میں ہستی جا رہی

تھی۔

”صاعقہ“ ڈکھی آواز میں ریحان نے پکارا۔

”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ یہاں کیوں آگئے۔۔۔ کیوں آگئے۔۔۔“ وہ

بھری۔

”اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں کی معافی کے لیے۔“ ریحان افسردگی سے سر جھٹکا کر

بولے۔

”صرف ایک بار۔۔۔ ایک بار اقرار کر لو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔“

”مجھے کیوں ستاتے ہیں ریحان۔۔۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ آپ کا

مذاق میری جان لے لے گا۔ میں نے آپ کی ہر زیادتی خاموشی سے سہہ لی ہے۔

لیکن۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ زیادتی۔۔۔“ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ کس

رہزدی سے رونے جا رہی تھی وہ۔۔۔

ریحان گنگ سے اسے دیکھتے رہے۔ یہ بُعہ کی منزلیں کیونکر پاٹ دیں۔ مچھلکی،

افسردگی اور جذبات شکستگی نے ان کے چہرے کو قابلِ رحم بنا رکھا تھا۔ آنکھیں جذبات

سے سرخ ہو رہی تھیں۔ بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے۔

”تمہیں کیسے یقین دلاؤں“ انہوں نے آخری کوشش کی۔

”یقین دلا کر اپنے آپ کو فرشتہ بنانے کی کوشش نہ کرو ریحان۔ آپ۔۔۔

آپ وہ نہیں ہیں جو بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔ میں سب جانتی ہوں۔۔۔

خلوص کا یوں مظاہرہ کر کے خلوص کی دھجیاں نہ اڑاؤ۔“ اس نے زار و قطار روتے ہوئے

رگ رگ کر یہ الفاظ کہے۔ یہ الفاظ نہ تھے، آگ تھی جو اس نے ریحان پر ایشیل دی۔ وہ

سب سے بڑی کے عالم میں اسے نکلتے رہ گئے۔ صاعقہ کے الفاظ نے ان کی حیات کا جیسے سدا

رہا ہوس لیا وہ بے جان تودے کی طرح کھڑے تھے۔



صاعقہ روئے جاری تھی۔

پتلا پوٹ کھٹے ہوئے انہوں نے ویران نظروں سے اُسے دیکھا۔  
"صاعقہ" انہوں نے ہمت کر کے پکارا۔

"چلے جائیے رحمان۔۔۔۔۔ چلے جائیے۔۔۔۔۔" وہ چیختی تھی۔

"میں مائوس لوٹ جاؤں۔۔۔۔۔" ان کی آواز ڈوب رہی تھی۔

"رحمان۔۔۔۔۔" وہ پھر ویسے اُنھی "آپ مجھے جینے بھی دس کے یا نہیں۔

یہاں سے چلے جائیے۔۔۔۔۔ میں آپ کی موبو کی ایک لمحہ کو برداشت نہیں کر

سکتی۔۔۔۔۔ چلے جائیے۔۔۔۔۔" وہ چیختی رہی۔

رحمان کی افسردگی اتہا کو پہنچ چکی تھی۔ مسلسل پوٹ سے احساس کے شیشے پکنا

پُور ہو گئے تھے۔

وہ پٹے۔

اور

کمرے سے تیزی سے باہر نکل گئے۔

"چلے جائیے۔۔۔۔۔ چلے جائیے" صاعقہ کے مجنونانہ انداز میں چیخنے کی آواز انہیں

برآمدے کے آخری موڑ تک سنائی دیتی رہی۔



رحمان صاعقہ کی ثواب کاہ سے نکلے تو دل کی طرح ان کی ہر آرزو بھی لٹ چکی تھی۔

طبیعت ییزار تھی۔ گھبراہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی پہلو قرار نہ آ رہا تھا۔ گھٹتے ہر

بلخ میں پھرتے رہے۔ طبیعت میں رہی بسی افسردگیاں اور گہری ہو گئیں۔ روح

ہذبات کے سینچے پر چڑھی تھی۔ قرار آتا بھی کیوں کر۔!

صاعقہ ان سے اس قدر دُور ہو گئی۔ یہ انہیں کبھی کمان بھی نہ ہوا تھا۔ کاش وہ

انہیں صرف معاف ہی کر دیتی۔ اس کی محبت نہ سہی۔ اس خیال سے تسکین تو ہوتی

کہ اس کے لہو لبان ماضی کا وہ مہ ادا تو کر پائے ہیں۔

رحمان کی طبیعت ییزار سے ییزار تر ہوتی کئی۔ وہ سکون چاہتے تھے۔ لیکن الحراء

کے دُر و دیوار ان کی شکست پر خندہ زن تھے۔ الحراء کی اونچی اونچی چمتوں تلے ان کا دم

گھٹ رہا تھا۔ یہ گھر۔۔۔۔۔ یہ گھر اک جلتے الاؤ سے کم نہیں تھا۔ ہر طرف سے آک کی لپٹیں

آ رہی تھیں۔

انہوں نے سکون دل کی خاطر اس گھر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ عالم آباد والی

پُر سکون کوٹھی میں ان کی پھلی ہوئی جیلتوں کی تسکین کا سامان ہو سکتا تھا۔ اس خیال کو

انہوں نے فوراً عملی جامہ پہنایا۔۔۔۔۔ رختِ سحر باندھا۔

اور

رات کا کھانا کھانے بغیر وہ الحراء سے حاصم آباد روانہ ہو گئے۔

صاعقہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی اسے رہ رہ کر یہی احساس مارے جا رہا تھا کہ اس

سے منزل پا کر منزل کھودی ہے۔

دوسری شام پکنک منانے والا قافلہ لوٹ آیا۔ الحراء کا سکوت ٹوٹ گیا۔ ہر طرف

شور و غل۔ ہر طرفی زلزلہ کی کیسا گہمی۔



لیکن ہر زبان پر ریحان کی عدم شمولیت کا شکوہ تھا۔

”سدا لطف کر کراہو گیا۔“

”کچھ مزاحی نہیں آیا۔“

”جان محفل جو نہ تھا۔“

”اللہ جائے کیا بات ہوئی۔“

”خیال تھا کہ دوسرے دن ہی آجائیں گے۔“

”کچھ سمجھ نہیں آیا۔۔۔ اچھے بھلے تیار تو ہوئے تھے۔۔۔“

”اچانک ایسا کونسا کام ہو گیا۔ جو اتنے دن فرصت ہی نہ مل سکی۔“

آنے والوں کی باتیں اور قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ حسن بانو نے آتے ہی

ریحان کو طلب کیا۔

”وہ تو عاصم آباد تشریف لے گئے ہیں“ نوکر نے مؤدبانہ کہا۔

”کب؟“ میرا نگہ سے پوچھا گیا۔

”کئی شام“

”کیوں؟“

”معلوم نہیں سرکار“

”کچھ کہہ کر نہیں گئے“

”کی نہیں۔۔۔“

”آنے کا بھی نہیں کہا۔۔۔“

”تہیں۔۔۔“

”عجیب بات ہے!“

”شاید کوئی کام ہو گا۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک تو تھے نا؟“

”جی۔۔۔ کچھ۔۔۔ طبیعت پریشان سی نظر آتی تھی۔۔۔ ویسے ٹھیک

تھے۔۔۔“

ریحان گھر والوں کے لیے ایک اچھا خاصہ موضوع بن گئے۔ ماں فکر مند تھیں۔

دادی فکر مند تھیں۔ ہم جلیس فکر مند تھے۔ اور سب سے زیادہ تو سمیرا فکر مند تھی۔

جس نے اللہ جانے چار دن کیسے گزارے تھے۔ کتنے۔۔۔ ہانے پہنے دیکھے تھے اس نے پنک

کے۔ کتنے کتنے حسین ملبوسات اک امنگ سے تیار کروائے تھے۔ گورنمنٹ نے اس

سے کبھی محبت و چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اپنی ذات میں اُن کی دلچسپی کو وہ اچھی

طرح سمجھتی تھی۔ اور پھر۔۔۔ پھر ایسا بھی تو جانتی تھی کہ تھکے کی گردان دونوں کو

یک جا کرنے والی ہے۔

عاصم آباد اس نے دو تین بار فون کیا۔ لیکن ریحان ملے نہیں۔۔۔ ڈوہڑی

بے چین نظر آنے لگی تھی۔

سب زندگی کی مصروفیتوں میں کھو گئے۔ اس دن ریحان کے ٹیلیفون سے

سب کو تسلی بھی تو ہو گئی تھی۔ کچھ کام کا بہانہ اس خوبصورتی سے کیا تھا کہ سب کو تسکین

ہو گئی تھی۔ اور جب ان سے واپسی کا پوچھا گیا تو انہوں نے ملائت سے جواب دیا۔

”شاید تین چار ہفتے رکنا پڑے۔۔۔ کام پہلے ختم ہو گیا۔ تو جلد ہی آجاؤں گا۔“

اسد کو ریحان کے اس جواب سے کچھ تسکین نہ ہو سکی۔۔۔ انہوں نے اسی

رات ٹووا انہیں فون کیا۔

”کیا بات ہے ریحان؟“

”کچھ بھی نہیں“

”یہ فرار کیسا؟“

”تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔۔۔ کاش فرار ممکن ہوتا۔۔۔ میں تو اس حد تک

بگڑا گیا ہوں کہ چھٹنے کی امید ہی نہیں رہی۔“

”یہ انداز فلسفیانہ کب سے سیکھا ہے؟“

”سب باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں۔۔۔“

”تم تو خاصہ معمہ بنتے جا رہے ہو کہو کب آرہے ہو؟“

”فی الحال پروگرام نہیں۔“

”وہاں اکیلے کیا کرتے رہتے ہو؟“

”سکون دل کی تلاش۔۔۔“

”معملہ کچھ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ نہیں کل آؤں گا۔“



”نہ ہی آؤ تو لچھا ہے اسد۔“

”کیوں؟“

”میں تنہائی چاہتا ہوں۔۔۔ اس تنہائی میں جہاں میرے اپنے خیالوں کا بھی گزر نہ ہو۔ تم آئے تو میرا یہ ظاہری سکون بھی ختم ہو جائے گا۔“

”آدمیرازی کی وجہ؟“

”خدا حافظ۔“

ریحان نے رسیور رکھ دیا۔ اسد نے پھر سلسلہ جوڑنے کی بہتیری کوشش کی۔ لیکن ادھر سے جواب نہ ملا۔

دو تین دن اسد نے فون سے رابطہ جوڑنے میں گزار دیے۔ ریحان عید کے چاند ہو گئے۔ مجبوراً تیسری شام انہوں نے عاصم آباد جانے کی ٹھانی۔ رات وہ ریحان کے پاس تھے۔

”تم ابھی گئے آخر“ ریحان نے افسردہ سی مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا۔

”خود ہی بلایا ہے۔“

”میں نے؟“

”اور کس نے۔“

”کب؟“

”میاں فون پہ مل جاتے تو یہاں آنے کی کسے ضرورت پڑی تھی۔“

”سخت غلطی کی ہے۔“ ریحان مسکرائے۔

”اب خمیازہ بھگتو۔“

”کتنے دن؟“

”جتنے دن یہاں رہو۔“

”تم جاؤ گے نہیں؟“

”نہیں۔“

”پھر مجھے راتوں رات کہیں اور منتقل ہونا پڑے گا۔۔۔“

”سایہ ہر جگہ تعاقب کرے گا۔۔۔ جاؤ گے کہاں۔“

”اندھیروں میں۔۔۔ جہاں سایہ تعاقب چھوڑ دیتا ہے۔“

ریحان نے اتنے سوگوار انداز میں کہا کہ اسد گھبرا کر انہیں دیکھنے لگے۔

اس رات دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ زمانے بھر کی باتیں کیں۔ لیکن اپنی ذات تک کوئی نہ آیا۔ اوپری۔۔۔۔۔ ظاہری اور دنیا داری کی باتیں۔ اسد نے محسوس کر لیا کہ ریحان زخم خوردہ ہیں۔ ان کی ہر مسکراہٹ سے خون رس بہا ہے۔۔۔۔۔

لیکن اس کا سبب؟

بہت کڑید نے پر بھی نہ پاسکے۔۔۔ اس سلسلے میں ریحان کے لبوں پر ایک ہی جملہ چپ تھی۔

اسد کا خیال پھر پھر کر انہیں صاعقہ تک لے آیا۔

لیکن

صاعقہ

ریحان

تضاد کا نام نہ سہی۔ پھر بھی۔۔۔۔۔ ریحان اور صاعقہ کے لیے استاذِ خوب جائیں کہ اپنی ہستی کو بھول بیٹھیں۔ یہ ممکن کیونکر تھا۔

اس سے ہمدردی ماتے کی بات تھی۔

چمکتا وے کے ردِ عمل کے طور پر پریشانی بھی ہو سکتی تھی۔

لیکن

یہاں تو معاملہ حدِ دوسے بہت آگے چکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات ظاہر تھی لیکن اس ظاہر پہ یقین کون کرتا۔ کیونکر کرتا۔۔۔ کیسے کرتا۔۔۔!

دو دن تک اسد وہیں رہے لیکن کچھ سمجھ نہ پائے۔ دو ایک بار انہوں نے محسوس بھی کیا کہ ریحان کچھ کہتے کہتے رک گئے ہیں۔ لیکن اصرار پر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔۔۔۔۔

ان کی ہر پریشانی روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ وہ اسد کی موجودگی میں خوش نظر آنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ لیکن بناوٹ کے چادر پار دے حقیقت کی ستر پوشی سے قاصر نظر آتے تھے۔

تین چار دن بد مزگی سے گزارنے کے بعد اسد نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔



ریحان نے انہیں روکا نہیں۔۔۔ صرف استنکابا۔ ”اگر تم نے کچھ محسوس کیا بھی ہو اسد تو وہاں جا کر کسی سے کچھ نہ کہنا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں پریشان ہوں۔“  
 لیکن یہ پریشانی گھروالوں، دوستوں اور ہم جلیسوں کے استفسار سے بھی ناقابل برداشت بن جاتی ہے۔۔۔ میں یہاں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ یقین ہے کہ طبیعت جلد ہی سنبھل جائے گی۔ میں خود ہی آجاؤں گا۔۔۔ ذرا۔۔۔ سکون چاہتا ہوں۔۔۔ تم صرف اتنا کہہ دینا کہ میں۔۔۔ کسی دوست کے لیے یہاں رکا ہوا ہوں۔۔۔“  
 ریحان کے لہجے میں اتنی دل کھنکی تھی کہ اسد بے چین ہو گئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہیں گے بلکہ سب کو یقین دلائیں گے کہ وہ خوش و غرم ہیں۔

لیکن

اسد کی باتوں کے باوجود دادی حسن بانو نے روزانہ فون کروانا معمول بنالیا۔ سمیرا پر روز رات کو فون کر کے ان کی تنہائیوں میں مٹل ہوتی رہی۔۔۔ جب بھی سمیرا کا فون آتا۔۔۔ ریحان کی سیزاری نقطہ عروج پر پہنچ جاتی۔ ترش کھائی پہ بھی اتر آتے لیکن سمیرا نے فون کرنا بند نہ کیا۔

○

(۳۷)

”رات سے بڑا جھکڑا ہو رہا ہے۔“ آیا قالین پر منٹھی صاعقہ کے دوپٹے میں فیتہ بانگ رہی تھی۔

”جھکڑا کیسا؟“ کھڑکی میں کھڑی صاعقہ نے منہ پھیرے بغیر پوچھا۔  
 ”ریحان سیاحت کے لیے یورپ جانا چاہتے ہیں۔۔۔“ سونی میں جاگ اٹھتے ہوئے آیا بولی۔

”ہو۔۔۔۔۔۔“ بے آواز سی صدا ہوشوں پر تھرائی۔ صاعقہ نے پلٹ کر آیا کی طرف دیکھا۔ حیران سرا سیمہ سی نظروں سے۔

آیا نے اک منظر اس پر ڈلی۔ وہ صاعقہ کی پریشانیوں کا راز سمجھ چکی تھی۔ اس دن ریحان جس انداز میں صاعقہ کی خواب گاہ میں آئے اور جس طرح مایوس لوٹے تھے۔ آیا کی جہاندیدہ نظروں نے پرکھ لیا تھا کہ کوئی شدید سی غلط فہمی دونوں کے مابین حاصل ہے۔ ریحان کے طرز عمل سے وہ آگاہ تھی۔ صاعقہ کے سب سے بڑے دشمن وہی تھے۔۔۔ لیکن اب ریحان یکسر بدلے ہوئے تھے۔ ریحان کے غلو ص اور صدق کالتے ان کی حالت دیکھ کر پختہ یقین ہو گیا تھا۔

”ریحان واپس آگئے ہیں نا۔“ آیا نے پھر بات پھیر دی۔

”میں۔۔۔ جانتی ہوں۔۔۔“ وہ آہستگی سے بڑبڑائی۔

”بس انہی کی وجہ سے جھکڑا ہو رہا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”ریحان یورپ جانا چاہتے ہیں۔“

صاعقہ چپ چاپ آیا کا منہ ٹکٹنے لگی۔

”لیکن بڑی سکم صاحبہ برہم ہیں۔ گھر کا ہر فرد مخالفت کر رہا ہے۔ ریحان کی فیتہ



ایک ہی ہے۔۔۔ رات تو ریحان اتنے بھر کے تھے کہ دادی کو بھی جواب دینے رہے۔۔۔

صاعقہ کم سُم کھڑی آیا کو دیکھتی رہی۔

”جائے کیا ہو گیا ہے صاحبزادے کو۔۔۔“ آیا فیتہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”میں بشتے حاصم آباد رہ آئے ہیں۔ اب آتے ہی باہر جانے کی ضد پکڑ رکھی ہے۔ کسی کی سنتے ہی نہیں۔ دادی نے بہتیرا سمجھایا۔ پھر کبھی سیر کا پروگرام بنالینے کو کہا۔ باپ نے روکا۔۔۔ لیکن وہ تو کسی کی سنتے ہی نہیں۔۔۔ کتنے پریشان ہیں۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔ بشارت تو چہرے پر نام کو نہیں رہی، لٹے لٹائے سے نظر آتے ہیں۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے۔ یہ وہی ریحان ہیں جو۔۔۔“

”چپ رہو آیا۔۔۔“ صاعقہ نے جلدی سے کہا اور گھبرا کر منہ پھیر لیا۔

”کیوں بیٹی“ آیا نے سوئی دوپٹے میں ٹانگ دی۔ ٹوکری ایک طرف رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

صاعقہ نے اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ پر اپنے بازوؤں کے حلقے میں رکھ دیا تھا۔

”صاعقہ بیٹی!“ آیا نے اسے پکارا۔

”کیا ہے آیا؟“ اس نے سر اٹھایا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں“

”منضمحل کیوں ہو گئی ہو؟“

”آیا۔۔۔ آیا۔۔۔“

”کیوں بیٹی۔۔۔“

”میرا دل گھبرا رہا ہے آیا۔۔۔“ صاعقہ کی آنکھیں ڈبڈب رہی تھیں۔ لیکن بہانہ لیا پر کارگر نہ ہوا۔ وہ صاعقہ کی ذہنی کیفیت سے پوری طرح آگاہ تھی۔

”صاعقہ“ وہ اس کے قریب آگئی۔

”ہوں۔“

”ایک بات پوچھوں؟“

”کیا؟“ صاعقہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”ریحان کیوں جا رہے ہیں۔۔۔؟“

”ریحان۔۔۔“ صاعقہ ایک دم گھبرا گئی۔ جیسے وہ ان کے جانے کا سبب جانتی ہو اور یہ جان لینا اک ایسا جرم ہو جس کی تشہیر سے اسے گزند پہنچنے کا احتمال ہو۔

”کیوں جانا چاہتے ہیں وہ۔۔۔“ آیا نے پھر سوال دہرایا۔

”میں۔۔۔ میں کیا جانوں آیا۔“ اس نے جیسے مجھوٹ بولا۔

”تم جانتی ہو۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتی۔۔۔ مجھے کچھ علم نہیں۔“

”میں بتا دوں۔۔۔!“

”نہیں۔۔۔“ اس نے آیا کی چھاتی میں منہ چھپا لیا۔ اس کی تیز سانسیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ آیا اس کی اضطراری حرکت اور اضطرانی کیفیت سے کیا کچھ نہ سمجھ گئی۔

”میری بچی“ آیا نے اس کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”آیا“ صاعقہ اس کے سینے کی شفیق گہرائیوں میں ڈوب جانا چاہتی تھی۔

”غلط فہمیاں بعض اوقات ابدی جُدائیوں کا روپ دھار لیتی ہیں میری بچی“ آیا سوچوں کے اتھاہ ساگر میں ڈوبتے ہوئے بولی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے، جنہیں آنکھوں ہی میں پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آیا“ صاعقہ نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ ”تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔؟“

”سچ کہتی ہوں۔۔۔“ وہ سوچ کے ساگر سے ابھری۔ آنکھوں کے گوشے صاف کر کے اداس لہجے میں بولی۔۔۔ ”غلط فہمی بُری بلا ہے میری بچی۔۔۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو آیا؟“

”عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ اور تم ضرورت سے زیادہ عقل مند ہو۔“

”تمہارا مطلب؟“

”اچھی طرح جانتی ہو۔“

”آیا“

”میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔“



”ازلی بد نصیبوں سے ایسی توقع؟“  
”تقصدیر کے پلٹے ان وہموں کی تذکرہ کرو۔“

”حقیقت کو پرکھا کرو آیا۔ خوش فہمیاں جان لیوہ بھی بن جاتی ہیں۔“  
”تم نادان ہو۔“

”یہ بھی تمہاری غلطی ہے آیا۔۔۔“

”یہ نہ سمجھو کہ میں قطعاً بے خبر ہوں۔۔۔ رحمان تم سے ملاوس ہو کر فوراً چاہتے ہیں۔ انہیں روک لو۔۔۔ صاعقہ۔۔۔ ورنہ کیا وقت لوٹ کر نہیں آئے گا۔۔۔“

”میں۔۔۔ میں کیا کروں آیا؟“ صاعقہ بے چارگی سے رو دی۔

”میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔۔۔ رحمان کو اس دن تم نے مایوس کر دیا تھا۔ وہ عاصم آباد چلے گئے۔ اب باہر جانے کے لیے بضد ہیں۔“

صاعقہ سر جو کائے خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

”ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا۔۔۔ حالات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ تم انہیں جانے سے روک لو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آیا۔ رحمان کے فیالات سے تم بھی بے خبر تو نہیں ہو۔۔۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے سحر سمجھا ہے۔۔۔ اب بھی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ شاید کوئی مسلسل مذاق کر رہے ہیں۔۔۔ طویل تفریح“ صاعقہ کو اپنے الفاظ آپ ہی جمونے لگ رہے تھے۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو صاعقہ۔ تفریح اتنی طویل اور مذاق ایسا مسلسل نہیں ہو سکتا۔ یہ ان کی زندگی کی اٹل حقیقت ہے۔“

”رحمان کے پہرے کے جلد سنائے، آنکھوں کی ویران چُپ، طبیعت کی وحشت۔۔۔ پکار پکار کر تو کہہ رہی ہے۔۔۔“

”آیا۔۔۔“ صاعقہ اس کے سینے سے لگ کر بے اختیار ہو کر رو دی۔

”لفظ فہمیاں خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہیں بیٹی۔۔۔ رحمان کو باہر جانے سے روک لو۔ وہ یہ نہیں بھگتے پھریں گے۔ منزل سے دور ہو کر وہ زندگی سے بےزار ہو جائیں گے۔“

”آیا“ وہ سسک رہی تھی۔۔۔ آیا اسے تھپتھپاتی رہی۔

”لیکن میں۔۔۔ میں کیسے یقین کر لوں۔۔۔ کہ یہ سب سراب نہیں حقیقت ہے؟“

”رحمان کی ہکا ہوں کی کھمبیر ادا سی یقین دلانے کو کافی ہے۔۔۔“

”مجھے یقین نہ دلاؤ۔۔۔ میں ازلی بد نصیب ہوں۔۔۔ خوش فہمی۔۔۔“  
”حقیقت کو خوش فہمی نہ کہو۔“

”اپنے نصیبوں کو استیاد رخشاں کیسے مان لوں آیا۔۔۔ تاریکیاں ہی مقدار ہیں۔۔۔ روشنی کی کرنیں کیسے پھوٹ سکتی ہیں۔۔۔“

”اکثر اوقات سیاہ بادل اچانک پھٹ جاتے ہیں صاعقہ۔۔۔ روشنی ہی روشنی بکھر جاتی ہے۔ تقصدیر کے پلٹے کسی کے بس میں نہیں ہوتے۔“  
”سچ آیا؟“

”بالکل سچ میری بچی۔۔۔“

”آیا۔۔۔ آیا۔!“ صاعقہ اس سے پٹ گئی۔ وہ اب بھی تذبذب کے عالم میں تھی۔ آیا نے اسے سینے سے پمٹا لیا۔ تسلیوں اور تحفوں سے اس کی ہمت بندھانے لگی۔



دونوں کچھ دیر خاموشی سے سکریٹ پھونکتے رہے۔ ریحان اپنی نشست گاہ کی عقبی کھڑکی کے قریب کھڑے تھے۔ کمرے کی دودھیا روشنی میں ان کے چہرے پر پریشانی اور جھنجھلاہٹ کے تاثرات نمایاں نظر آ رہے تھے۔

اسد صوفے پر بیٹھے تھے۔ میز پر تازہ میگزین رکھا تھا۔ لیکن وہ سوچ میں ڈوبے تھے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد انہوں نے بغور ریحان کو دیکھا۔

”اس ضد کی وجہ؟“ اسد نے سکریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے ریحان کو مخاطب کیا۔۔۔

”شاید میں بتانے سے انکار کر دوں۔“ ریحان نے دھوئیں کے مرغولے پھوڑتے ہوئے کہا۔

”میں۔۔۔ جانتا ہوں“ اسد گھمبیر آواز میں بولے۔

”تو پھر پوچھتے کیوں ہو“ ریحان لاپرواہی سے بولے۔

”کچھ۔۔۔ انہونی سی بات نظر آتی ہے“ لمبے میں ہچکچاہٹ تھی۔

”انہونی جب ہو جائے تو شدت کی انتہا ہوتی ہے“ ریحان نے جیسے اعتراف کر لیا۔

”کیا واقعی؟“

”ہوں۔“

”کیا واقعی ایک انتہا دوسری انتہا کو جنم دے چکی؟“

”مجھے اقرار میں کوئی باک نہیں۔۔۔“

اسد نے منظر میں ریحان کے چہرے پر کاڑھس۔ ریحان سکریٹ پھونکتے جا رہے تھے۔ اسد کو اس اقرار سے کچھ ملی جلی مسرت ہو رہی تھی۔

”لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا“ اسد بولے۔

”کیا؟“

”تمہاری اس آدمی زاری۔۔۔ افسردگی۔۔۔ پریشانی کی وجہ کیا ہے، یہ پتا تو خوش گوار ہونا چاہیے تھا!“

ریحان نے کچھ جواب نہ دیا۔ نیا سکریٹ سلکاتے وقت ان کے چہرے پر رنج و غم کے تاریک سائے لہرا رہے تھے۔ اک ٹھنڈی اور دل دوز سی آہ کھینچ کر رو گئے۔

(۳۸)

”حد کر دی تم نے بھی۔۔۔ نانی حضور کے سامنے اتنی بیباکی سے جواب دینے رہے۔“

”میں مجبور ہوں اسد۔“

”ان کے لحاظ۔۔۔“

”حیران ہوں۔ سب اس قدر مشتعل کیوں ہیں۔ یورپ جا رہا ہوں، جہنم میں تو نہیں جا رہا ہوں۔ اتنی کھرباہٹ۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا، گھر کا ہر فرد زنجیر کیوں بننا چاہتا ہے۔۔۔ باہر جانا جرم ہے کیا؟“

”قطعاً نہیں۔“

”تو پھر اتنی لے دے کیوں ہو رہی ہے۔۔۔ ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے جیسے میں

کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو رہا ہوں۔“

”یہ بات نہیں۔۔۔“

”تو اور کیا ہے؟“

”تمہیں جشن تک روکنا چاہتے ہیں سب۔“

”اونہ۔“

”کچھ تو سوچو۔۔۔ ریحان۔“

”بہت کچھ سوچ لیا۔“

”ریحان نے سکریٹ سلکایا۔ وہ جھلٹانے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ آج دای سے خاصی جھڑپ ہوئی تھی۔ وہ راستے کا سنگ گراں جو بن رہی تھیں۔ ریحان جیسی فطرت کے انسان کا اس سنگ گراں سے فکر انا بعید از قیاس تو نہ تھا۔ اسد دیر سے انہیں سمجھا رہے تھے لیکن ہر نصیحت نقش بر آب تھی۔



سگریٹ سلکا کر انہوں نے منہ پھیر لیا۔ صحن چمن میں چاندنی ساحرائہ جال پھیلا رہی تھی۔ وہ اس طلسماتی جال سے نظریں الجھائے جانے لگا سوچنے لگے۔  
اسد اٹھ کر ان کے قریب آگئے۔ کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا۔  
”ہوں“ ریحان اسی انداز میں کھڑے رہے۔

”بتاؤ گے نہیں؟“

”کیا؟“

”اس سارے عقدے۔۔۔۔۔“

”اسد کچھ نہ پوچھو۔۔۔۔۔“

”تمہارا دوست بھی ہوں اور بھائی بھی۔۔۔۔۔“

”پھر۔۔۔۔۔!“

”کیا معذرت ہے؟“

”پریشان نہ کرو اسد“

”خواہ مخواہ بات بڑھائے جا رہے ہو۔ کہہ بھی دو۔۔۔۔۔!“

”کیا کہہ دوں۔ کچھ کہنے کو ہے ہی نہیں۔“

”متکلف برستے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔“

”اسد“

”کچھ تو کہو دوست“

”کچھ بھی نہیں کہنے کو۔۔۔۔۔“

”میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔ تمہاری اور صاعقہ۔۔۔۔۔“

”صاعقہ۔۔۔۔۔ صاعقہ“ وہ گہری سانس لے کر بولے ”مجھے احترام ہے اسد کو“

”میری روح میں سما چکی ہے۔“

ریحان نے گہری سانس لے کر سگریٹ باہر پھینک دیا۔ مگر اسد کی طرف دیکھا۔

ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی جو افسردگی میں گھل مل گئی تھی۔ وہ قدرے

مسکرائے۔ لیکن اس مسکراہٹ کو جیسے آگ سی لگی تھی۔

”یہی راز اگلوانا چاہتے تھانا“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں کئی دنوں سے جان گیا تھا۔“

”پھر۔۔۔۔۔ پھر کیا چاہتے ہو؟“

”اس احترام کے باوجود پریشان کیوں ہو۔“

”اسد۔۔۔۔۔“

”ہوں۔“

”میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے اور کیونکر ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ سوئے ہوئے جذبے

کس شدت سے بیدار ہوئے ہیں۔ تمہیں کیونکر بتاؤں اسد۔ اب تو اس کے بغیر زندگی

کا تصور بھی ممکن نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔“ وہ چپ ہو گئے۔ نچلے ہونٹ کو کاٹتے ہوئے وہ

اپنے زخمی جذبات کو چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔

”ہوں۔۔۔۔۔؟“ اسد نے آہستگی سے کہا۔

”اسد۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں اپنے والہانہ عشق کے جواب میں کچھ ایسے ہی

جذبات کا متمنی ہوں۔“

”یہ فطری بات ہے۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“ ریحان چپ ہو گئے۔ ان کے چہرے سے آثارِ کرب مترشح

تھے۔

اسد خاموش رہے۔ ریحان کی گفتگو سمجھ کر وہ پریشان ہو گئے۔

”وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اسد۔۔۔۔۔ شدید نفرت۔۔۔۔۔ ایسی نفرت جس

میں کسی لچک کی گنجائش نہیں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ میری موجودگی تک برداشت نہیں کر

سکتی۔ اتنی سنگین نفرت ہے مجھ سے۔“

اسد کچھ کہنے کو الفاظ تلاش کر رہے تھے۔ غیر متوقع سی بات تھی نا؟

”اور تو پوچھنے کو کچھ باقی نہیں رہ گیا۔“ ریحان نے مسکرائے کی کوشش کی۔

پریشان چہرے پر افسردگیوں کا لامتناہی سیلاب سا اُمٹ رہا تھا۔

چھ دیر خاموشی رہی۔۔۔۔۔ دونوں مضطرب تھے۔ بیدردی سے سگریٹ

ہلکتے رہے۔

”صاعقہ تم سے نفرت نہیں کر سکتی۔“ آخر اسد بولے۔

”طفل تسلیوں سے پہلانے کی کوشش نہ کرو۔“

”تمہیں ضرور غلط فہمی۔۔۔۔۔“



”اسد۔۔۔ معاملہ ان خوش فہمیوں کی حدود سے آگے نکل چکا ہے۔“  
”تمہیں اس نے کچھ کہا؟“

”اس نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ وہ میری شکل دیکھنے کی روادار نہیں۔۔۔ وہ بحر سے نفرت کرتی ہے۔ نفرت۔۔۔“

اور

پھر

ریحان نے اسی طرح کھڑے کھڑے اپنی انوکھی محبت کی ادھوری اور ناتمام داستان اسد کے گوش گزار کر دی اسد سُنتے گئے۔ ریحان کی حالت دیکھ کر انہیں ان پر کتنا رحم آیا تھا۔

”میری یہی سزا ہے اسد“ ریحان ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے ”میں نے بحر جو کچھ اس کے ساتھ کیا ہے، وہ اسی جذبہ تنفر کو جنم دے سکتا ہے۔ قدرت کا انتقام خاموش ہوتا ہے۔ لیکن کتنا زبردست۔۔۔“

ریحان نے کھڑکی کی پٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسد کا دل ان کی حالت دیکھ کر مسلا جا رہا تھا۔

چند لمحوں بعد ریحان نے آنکھیں کھول کر اسد کی طرف دیکھا۔ قدرے آگے کو جھک کر ملیوس آواز میں بولے۔ ”کاش وہ مجھے ایک بار معاف کر دیتی۔ مجھے اپنی ناکامی کا دکھ استا شدید نہ ہوتا۔ میں اپنے گناہوں کی سزا سمجھ کر یہ دکھ سینے سے لکھ لیتا۔ لیکن وہ تو مجھ سے اس حد تک متنفر ہے کہ میری ہتھم کوششوں کے باوجود مجھے معاف تک نہیں کر سکی۔ کوئی اور توقع رکھنے کا تو سوال ہی نہیں اسد۔۔۔“

”ہوں“ اسد گم ضم کھڑے تھے۔

”تم ہی کہو اسد میں کیسے یہاں رو سکتا ہوں۔ یہاں آگ کی لپٹیں ہیں جو میری زندگی کو بھسم کیے دے رہی ہیں۔ میں ان آگ کی لپٹوں سے دور بھاگ جانا چاہتا ہوں۔۔۔ دور۔۔۔ بہت دور۔۔۔“

”سمجھتے ہو کہ دوری تمہیں سکون دے گی؟“

”میں نہیں جانتا۔۔۔“

”زخم تو جہاں بھی جاؤ گے کسک دے گا۔“

”صرف کسک ہی ہوگی نا۔۔۔ نشتروں کی چبھن تو نہ ہوگی۔ تنفر بحری نظروں کا تعاقب تو نہ ہو گا۔۔۔ یہ لمحہ لمحہ کی موت میری برداشت سے باہر ہے اسد۔۔۔ یہاں ہاکلیاں میرا منہ چڑاتی ہیں۔۔۔“

اسد چپ تھا۔ کافی دیر خاموشی رہی۔ سکریٹ سلگتے اور ختم ہوتے رہے۔ ریحان نے ان کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے مسکرائے۔۔۔ ”تم جیسے لوگوں سے بھی تو چھٹکارا مل جائے گا۔ پریشان کر کر کے زیست کو ناقابل برداشت بنا دیا ہے۔۔۔۔“

اسد مسکرا نہ سکے۔

وہ

سنجیدگی سے کسی سوچ میں ڈوبے تھے۔





ہر جذبہ انتہا سے ٹکرا کر احساس کارنگ کھو دیتا ہے۔ انسانی ذہن اس لمحہ چٹیل میدان کی طرح سپاٹ ہو جاتا ہے۔

اس لمحہ سے صاعقہ بھی دوچار ہوئی۔

وہ اسی دریچے کے قریب کھڑی تھی۔ جس میں ریحان اسد کے سامنے اپنے دل کے پچھو لے پھوڑ رہے تھے۔ وہ دانستہ باتیں سننے نہیں رکی تھی۔ لاشعوری طور پر اس کے قدم رک گئے تھے۔ کچھ بے نام سے جذباتوں کی کشاکش نے مغلوب کر لیا تھا۔

ریحان کا سنجیدہ سا اعتراف سن کر وہ انتہا کی ان حدود سے جا ٹکرانی جہاں خوشی و غم احساس کارنگ کھو دیتے ہیں۔ اور جہاں ثانیہ بھر کے لیے ذہن چٹیل میدان کی طرح سپاٹ ہو جاتا ہے۔

لیکن

جب وہ ہوش میں آئی تو اس کی حالت اس شرابی کی سی تھی۔ جو کیف و سرور سے بہک بہک جائے۔

اس رات وہ کتنی خوش تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا، چٹیل ہواؤں کی طرح سرسراہی پھرے۔۔۔ مترنم نغموں کی طرح لہرائے۔

اور

اپنی بے پناہ مسرتوں کے سینے سے لپٹ کر سو جائے۔ جسے وہ اک طویل مذاق اور مسلسل تفریح سمجھ رہی تھی۔ وہ ریحان کی زندگی کی اہل حقیقت تھی۔ یہ یقین آیا نے بھی دلا دیا تھا۔ خود اس کی روح اس بات پر ایمان لائے کو پھل رہی تھی۔

لیکن

صاعقہ

جس نے زندگی کے بیس سالوں میں متفرق۔۔۔ حقارت اور تضحیک کے سوا ریحان سے کچھ نہ پایا تھا۔ اس یقین کو جھٹلاتی رہی۔

آج

اچانک

ریحان کے اعترافِ عشق نے اس کے ذہن سے سارے بوجھ ہٹا دیے۔ وہ مجھوم مجھوم گئی۔ اس کی روح میں لطیف سی گدگدی برداشت کی حدود توڑ توڑ گئی۔

ریحان

جنہیں ان کے متفرق و حقارت کے باوجود اس نے چاہا تھا۔

جنہیں ناکامی کے روح فرسا احساس کے باوجود پوچھا تھا۔

جنہیں اک ہولناک تعبیر کے تعین کے باوجود رنگین سپنوں میں بسایا تھا۔

وہ ریحان

وہ دیوتا

وہ محبوب

وہ جانِ آرزو اس کا اپنا تھا۔

بالکل اپنا اپنا

صاعقہ بلند یوں پر پرواز کر رہی تھی۔ اس کی روح رقصاں تھی۔ اک وجدانی سی کیفیت اس کے سراپا پر چھانی ہوئی تھی۔

رات گئے حسبِ عادت آیا اس کی خواب گاہ میں آئی تو دو جاگ رہی تھی۔

”سوئی نہیں ابھی تک؟“

”نہیں“

”نہیں نہیں آ رہی؟“

”نہیں“

”بہی کل کر دوں؟“

”نہیں۔۔۔“

”سو جاؤ!“

”نہیں۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے صاعقہ کھلکھلا کر ہنس دی۔



آیا نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ کنبل ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔ میں نہیں سوؤں گی آیا۔۔۔

”آدھی رات بیت چکی ہے۔“

”پوری بیت جانے دو آیا۔۔۔۔۔ اس نے وفور جذبات سے مغلوب ہو کر آیا

کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔۔۔۔۔

”کیا بات ہے؟“

”آیا!“

”میری بچی“

”میں آج کتنی خوش ہوں آیا۔ تم نہیں جانتیں میں کتنی خوش ہوں۔ جاگ کر

مجھے ان خوشیوں سے لطف اندوز تو ہونے دو۔۔۔۔۔“ وہ آیا کے بازو ہٹا کر الگ ہو گئی۔

آیا نے پہلی بار اسے استخوانوش دیکھا تھا زندگی میں پہلی بار۔۔۔ اس کی حسین

آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند لہٹوں کی جگہ خوشیوں کے سوتے ابلتے دیکھے تھے۔ پہلی بار

اس کے چہرے کی سپیدی میں مسرتوں کی چمک دیکھی تھی۔ کانپتی پلکوں کے اٹنے

گرتے سلاخوں میں پہلی بار خوشیوں کے رقص دیکھے تھے۔

”مجھ سے پوچھو تو سہی آیا۔۔۔۔۔!“ اس نے پیار سے آیا کا چہرہ ہاتھوں میں

تھام لیا۔ وہ کتنی مجنونانہ حرکتیں کر رہی تھی۔

صاعقہ کو خوش دیکھ کر آیا کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے۔ کتنی مطمئن نظر

آ رہی تھی وہ۔۔۔۔۔ جیسے غم بھر کی ریاضت کا اثر پایا ہو۔

”کیا بات ہے؟“ آیا نے جذبات سے رندھی آواز میں پوچھا۔ اک والہانہ انداز سے

آیا کو دیکھ کر صاعقہ مسکرائی۔

موت کی طرح بل کھا کر مڑی۔

اور

مغربی دریچے کے پٹ کھول دیے۔

نرم رو جھونکے اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے گزر گئے۔

”کھڑکی بند کر دو ہوا ٹھنڈی ہے“ آیا نے کہا۔

”آج مجھے مت روکو آیا۔ کسی بات سے مت روکو۔۔۔ مجھے دہی کرنے دو جو

میں چاہتی ہوں۔۔۔۔۔“

”بڑی خوش ہو آج“ آیا نے قریب آ کر اس کے کالوں کو چھوا۔

”میری خوشیوں کا اندازہ نہ کر سکو گی آیا۔۔۔۔۔“ وہ جھوم گئی۔

”کیا پایا؟“

”جس کی تمنا بھی جرم سمجھتی تھی۔“

”سچ؟“

”سچ آیا۔۔۔۔۔ بالکل سچ“ اس نے آیا کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں موند

لیں۔ ”تم سچ کہتی تھیں۔۔۔۔۔ آیا۔۔۔۔۔ سچ کہتی تھیں تم۔۔۔۔۔ رحمان میرے

دشمن۔۔۔۔۔ میرے بیٹے آیا۔۔۔۔۔ ڈر لگتا ہے خوشی سے میں پاگل نہ ہو جاؤں

کہیں۔۔۔۔۔“

وہ آیا سے لپٹ گئی۔

آیا کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ صاعقہ کو ساتھ لپٹا کر اس نے اس کے

اند میری راتوں جیسے سیاہ بال چوم لیے۔

”تمہاری خوشیاں تمہیں مبارک ہوں میری بچی۔۔۔۔۔“

صبح ناشتے کی میز پر صاعقہ نے رحمان کو دیکھا۔ اک سنسنیاتی سی اس کے رنگ و

رپ میں دوڑ گئی۔ لطیف سی کپکپی ہونے لگی۔ خواہ مخواہ چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا۔ کتنا

جلب آ رہا تھا اسے رحمان سے۔ گھبراہٹ بھی تو رہی تھی۔ وہ ان کے سامنے سے۔

رحمان کتنے پڑمردہ اور نڈھال سے نظر آرہے تھے۔ سب کا ساتھ دینے کو آہٹ

تھے۔ صرف پناے کی دو پیہلیاں پی تھیں۔ ناشتے کی کسی چیز کو چھوا تک نہیں تھا۔

صاعقہ ان کے سامنے والی قطار میں بیٹھی تھی۔ لیکن انہوں نے ایک بار بھی اس کی طرف

نہ دیکھا تھا۔

یہ دکھاوے کا تغافل دیکھ کر آج صاعقہ کتنی مسرت بھری ٹوپ محسوس کر رہی

تھی۔ میز سے اٹھتے وقت دونوں کی منقروں کا ٹکڑا ہو گیا۔ رحمان کی ملبوس افسردہ چھڑیں

کتنی مسرتیں لیے تھیں۔

صاعقہ کا دل اس ملبوس خفگی پر چل گیا۔



جانے کیوں اس کے ہوشوں پر جسم بکھر گیا۔  
ریحان نے بھی یہ جسم دیکھا اور پھر بڑی دل آزاری سے منہ دوسری طرف پھیر

لیا۔

ریحان باہر جانے کے لیے ضدی بچے کی طرح مچلے تھے۔ دادی کا کہنا مان رہے تھے  
نہ والدہ بن کی سرزنش کی پرواہ تھی۔

پیارا اور سختی کسی طرح سے بھی تو قابو میں نہ آ رہے تھے۔ حسن بانو کو ان دنوں  
ظاہر یاد آ جاتے تھے۔ دونوں کے مزاج میں کتنی ہم آہنگی تھی۔ نٹ کھٹ ضدی سے  
ریحان ظاہری تو لگتے تھے۔

حسن بانو کو پختہ یقین تھا کہ ریحان ضد سے ملنے کے نہیں۔ اس لیے ان کے  
روئے میں کچھ چمک آگئی۔ جانے کی اجازت اس صورت میں دی کہ وہ عید کے بعد  
منائے جانے والے جشن میں شرکت کر کے جائیں۔

ریحان بھلا ان حد بند یوں کے قائل کیوں کر ہوتے۔ اور یہ جشن جس سلسلے میں  
منایا جانے والا تھا، اس سے بھی آگہی تھی۔ پھر بھلا وہ اتنی مدت کیسے رک جائے۔  
فوزیہ بھی چاہتی تھی کہ ریحان جشن کے بعد ہی جائیں۔ جوان لڑکے کو منگنی کی  
بندش ڈال دینے سے ان کا باہر جانا محذور نہ تھا۔ لیکن ریحان جہاں دادی کی بات نہیں  
سن رہے تھے، ماں باپ کے سامنے بھی غم نہیں کھا رہے تھے۔ فوزیہ کا کہنا بھلا کتنا  
سو مند ہو سکتا تھا۔

لیکن اس کے زیرِ رک دماغ نے اک راہ نکالی۔ سمیرا ریحان کو روک سکتی تھی۔  
ریحان کا ترجمانی سلوک اور سمیرا کے جذبات سے وہ واقف بھی تو تھی۔  
سمیرا ریحان کی ضد سے خود ہی متاثر تھی۔ ماں کی ایاہ اس نے ریحان کو روکنے  
کے بارے میں سوچا۔

اپنے آپ پر اسے اعتماد تھا۔  
وہ مناسب موقع کی تلاش میں رہی۔







تمہارے لیے بار نہ بنتا۔“

ریحان کی چوٹ پر صاعقہ وحیرے سے مسکرا دی۔ جیسے ہواؤں کی آوارہ ہیرے سے کلیاں مجھوم گئی ہوں۔

اس خواب ناک سی بھیگی بھیگی جیسا بار مسکراہٹ کا مفہوم ریحان نہ سمجھ سکے۔ میز پر قدرے جھک کر قائل کھولی اور مطلوبہ کاغذات نکالنے لگے۔ صاعقہ اسی جگہ کھڑی رہی۔

ریحان نے فارغ ہو کر قائل بند کر دی۔ کاغذات اکٹھے کر کے میز پر رکھ دیئے۔ اور قائل واپس الماری میں رکھنے کے لیے اس طرف آئے۔

الماری کے پٹ کے ساتھ ہی صاعقہ کھڑی تھی۔ لیکن ریحان نے اس پر ہلکا نہیں ڈالی۔

اس تعاقب پر وہ پھر مسکرا دی۔

ریحان نے قائل اوپر والے خانے میں رکھنے کے لیے ایک طرف جگہ بنائی۔ ”آپ واقعی یورپ جا رہے ہیں۔۔۔؟“ اک نغمہ بار آواز ریحان کے کانوں سے گزرائی۔

اور

اس غیر متوقع استفسار پر وہ بلاشبہ بڑی ہی اپنائیت سے کیا گیا تھا۔ ریحان حیران سے ہوئے۔ قائل پر ہاتھ رکھے انہوں نے گردن کو قدرے خم دے کر صاعقہ کی طرف دیکھا۔

صاعقہ سر جھکائے پاؤں سے قالین کو مسلے جا رہی تھی۔ ہاتھ پشت کی طرف تھے۔ جس سے اس نے کھڑے ہونے کے لیے الماری کے پٹ کا سہارا لے لیا تھا۔ رسمی استفسار سمجھ کر ریحان کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ گردن موڑ کر اوپر والے خانے کے دائیں طرف کتاب اٹھا کر قائل رکھ دی۔۔۔ اور بڑی لا تعلقی سے بولے ”میں ہفتے کو پرواز کر جاؤں گا۔“

”کیوں جا رہے ہیں۔۔۔؟“ اک چور تبسم بوٹیوں میں دبائے صاعقہ نے آہستگی سے کہا۔

ریحان نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ حیرانگی سے کہیں زیادہ وہ چونک گئے تھے۔

اس دفعہ۔۔۔ صاعقہ کے لہجے کی اپنائیت اور لگاؤ اچھے کا باعث تھا۔ لیکن یہ لگاؤ اجنبی سا لگا۔ سوچ کے دھاروں کا لٹ پل نہ سکا۔ قدرے شرشی سے بولے۔ ”یہ پوچھنے کا تمہیں کیا حق ہے۔“

”شاید کوئی ہو۔۔۔۔“ وہی مسخوڑ کن آواز ابھری۔ لگاؤ سے بھرپور۔ اپنائیت کا پہلو لیے ہوئے۔

ریحان کے ہاتھوں سے کتاب گرتے گرتے بچی۔ صاعقہ کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے بوٹیوں میں دبا دبا سا تبسم بکھر جانے کی کوشش میں تھا۔ ریحان کو اپنی بصارت و سماعت پر قطعاً یقین نہ آ رہا تھا۔

چند ثانیے خاموشی رہی۔ وہ اسے دیکھتے رہے۔

خاموشی سے گھبرا کر سر کو ہلکا سا جھکادے کر صاعقہ نے سر اٹھا کر ان کی طرف جیسا بار نظروں سے دیکھا۔ مسکراہٹ قابو میں نہ رہ سکی۔ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر رو گئی۔ چور تبسم پھسل پھسل گیا۔

”صاعقہ“ ریحان جیسے خواب میں بڑبڑائے۔

”جی“ خواب میں سر کوشی ابھری۔

”کیا کہا تھا؟“ بہت کچھ سمجھنے کے باوجود یہ استفسار بے محل نہ تھا۔

”سن لیا ہوتا“ اک شوخ ادا سے عکاس لفظ انداز ان پر ڈالتے ہوئے وہ قریبی کھڑکی کی طرف گھوم گئی۔

ریحان گنگ سے کھڑے تھے۔

صاعقہ بظاہر لا تعلقی سے دریچے میں کھڑی باہر سے عکاس تک پھیلے ہوئے سبزے کو دیکھتی رہی۔

چند ثانیے یونہی گزر گئے۔

امید نے اک نئی راہ دکھائی۔ ریحان ونگھکاتے قدموں سے اس پر ہل دیے۔

بڑھ کر اس کے قریب آگئے ”سن تو لیا۔۔۔ لیکن سمجھا نہیں۔“

صاعقہ نے اک کافر عکاس ان پر ڈالی۔ ”سمجھ میں نہ آنے والی کیا بات تھی۔“

ریحان از خود رفتہ سے کھڑے رہ گئے۔

صاعقہ نے ادائے دل نوازی سے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر حیات افروز



جیتتم بہر اگیا۔ گردن موڑ کر وہ پھر باہر دیکھنے لگی۔

ریحان بے سدھ بے خود سے نظر آرہے تھے۔ ان کی حالت اس مسافر کی سی تھی جوہ توں بھٹکتے رہنے کے بعد اچانک اور بالکل اچانک منزل سے ہم کنار ہو گیا ہو۔  
”صاعقہ نے حسین گردن کو ہلکا سا خم دے کر انہیں گوشہ چشم سے بڑے مستیز انداز میں دیکھا۔ آج کوشش کے باوجود لبوں پر مسکراہٹ بہرانے سے باز نہ آ رہی تھی۔

اس کا ہر انداز جرات کی کھلی دعوت تھا۔ ریحان کی سنجیدگی کچھ اور بڑھ گئی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے عالم خواب میں ہوں۔ واقعات خود بخود دھلتے جا رہے ہوں۔ اور ان کا ان پر اختیار ہونہ قابو۔۔۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

خاموشی جو دونوں کے صبر کی انتہا سے ٹکرا رہی تھی۔

اور پھر خاموشی ہی خاموشی میں جذبات مچل گئے۔

ریحان نے صاعقہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

ریحان نے اس کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔

وہ کسی مشین کی گڑیا کی طرح ان کی طرف گھوم گئی۔

خاموشی کے طلسم سے دونوں مسحور نظر آرہے تھے۔

وہ ریحان کے مقابل کھڑی تھی۔ ریحان کا بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر تھا دائیں

ہاتھ سے انہوں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔ اٹھکی کے۔ ہمارے سے اس کا چہرہ اونچا کیا۔

صاعقہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

”تمہیں۔۔۔ کیا۔۔۔ سمجھوں۔۔۔“ خاموشی میں اک سرگوشی ابھری۔

”اپنے دل کی آواز“ صاعقہ نے لمحہ بھر کو آنکھیں کھول کر ریحان کی آنکھوں میں

جھانکا۔

”سچی“ و فور جذبات سے آواز کا پ گئی۔

صاعقہ کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ وہ بہر اگئی۔ جیسے اپنا ہی بوجھ اٹھانے کی نکت

نہ رہی ہو۔

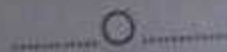
”صاعقہ“ بے تابی سے ریحان نے اس کے بہر اگتے وجود کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

وہ کسی نہ افعت و مزاحمت کے بغیر ان کی پھیلتی سے جا ٹکرائی۔

ریحان کے بازوؤں کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ وہ اسے سینے میں پھپھالینا چاہتے تھے۔ جیسے دل کی آواز کو دل ہی میں سمولینا چاہتے ہوں۔

”ریحان!“ صاعقہ سسک اٹھی۔ اس کے آنسوؤں سے ریحان کی قیص نم ہو گئی۔ ریحان گنگ سے ہو گئے۔ صاعقہ کے ریشمی بالوں پر کمال ٹکا کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ اس مسافر کی طرح نظر آرہے تھے جو پہروں تپتی دو پہر میں ریتلے میدان میں ٹکے پاؤں چلنے کے بعد اچانک کسی گھنیرے درخت کی چھاؤں پا کر بے سدھ ہو گیا ہو۔۔۔





اسی شام کے ڈوبتے اندھیروں میں سمیرا ریحان کے انتظار میں برآمدے کے ستون کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ ماں کے ایما اور دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر آج وہ ریحان کو باہر جانے کی ضد سے باز رکھنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

حسب توقع ریحان ادھر آئے۔ وہ بڑی ترنگ میں تھے۔۔۔ کسی دنوار نغمے کی طرح لہرا رہے تھے۔ سمیرا کو دیکھ کر وہ خود ہی رک گئے۔ دو چار رسمی سی باتوں کے بعد ریحان نے جانا چاہا۔ لیکن سمیرا نے انہیں باتوں میں الجھائے رکھا۔

”آپ کب تک جا رہے ہیں۔ ریحان؟“ اس نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں“

”یورپ“

ریحان مسکرا دیئے۔

”کب جا رہے ہیں۔“

”تمہیں کس نے کہا۔“

”کیا؟“

”کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔“

”مائے نہیں۔“

”مائے کی کیا بات۔ میں جا ہی کب رہا ہوں“ وہ ہنس دیے۔  
”ارادہ بدل دیا۔۔۔؟“ سمیرا سنجیدہ تھی۔ ”بنائیے نہیں۔ سچ سچ کہیے۔“  
”ہاں“

”بالکل“

”آپ کی ضد تو ہنگامہ بن چکی تھی۔ یہ اچانک تبدیلی کیسی۔۔۔ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے؟“

”نہیں سمیرا مذاق نہیں۔۔۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔“

”اچانک ارادہ بدل گیا۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”کیوں؟“

”ہر بات پوچھا نہیں کرتے“ ریحان نے اس طرح کہا جیسے کسی چھوٹے سے بچے کو پہلانے کی کوشش کی ہو۔

”پھر بھی؟“ سمیرا سنجیدہ تھی۔

”تم کیا چاہتی ہو۔۔۔ کہتی ہو تو چلا جاتا ہوں۔“ ریحان نے مذاق میں کہا۔

”ہائے اللہ! آپ تو ہر بات مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔۔۔ میں تو پوچھ رہی ہوں آپ یوں اچانک ارادہ ملتوی کیوں کر بیٹھیے۔۔۔؟“

”کہہ دینا ہر بات پوچھا نہیں کرتے۔۔۔“ ریحان کی خوشی چھپانے نہ چھپ رہی تھی۔ سمیرا انہیں اتنے دنوں بعد مسرور دیکھ کر حیران بھی تھی۔

”بڑے خوش نظر آ رہے ہیں۔“

”مجھ سے دشمنی ہے کوئی۔“

”کیوں۔“

”خوش دیکھ جو نہیں سکتیں۔“

”ہائے اللہ“ وہ لجا گئی۔

”بھئی کہتی ہو میں نے جانے کا ارادہ کیوں ترک کر دیا۔ یعنی تمہارے خیال کے مطابق مجھے چلے جانا چاہیے تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میرے جانے سے خوش ہو۔۔۔“

”تو۔۔۔؟“ ہاتھیں بنانا تو کوئی آپ سے سکھے۔ میں آپ کے جانے سے خوش کیوں ہونے لگی۔۔۔ میں تو خود نہیں چاہتی تھی کہ آپ جائیں۔“



سمیرا کی آواز کچھ کانپ سی گئی۔

”دیکھ لو ہم نے تمہاری خواہش کا کتنا احترام کیا۔ ریحان نے بڑی ترنگ میں کہا۔۔۔“ جانے کا ارادہ ہی بدل دیا۔“

سمیرا مذاق کو حقیقت کا رنگ دے کر فرط مسرت سے سُرخ ہو گئی، شاہ رخ کے آنے سے وہ چپ ہو گئی۔ ریحان چند ایک ادھر اُدھر کی باتیں کر کے چل دیے۔ آج وہ کتنے خوش تھے۔ یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ پھول کی طرح کھل رہے تھے۔

لبکتے لبکتے وہ طویل برآمدہ طے کر کے دائیں طرف مڑے۔ اپنی دھن میں تھے۔ اسد سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

”اوہ!“ دونوں کے منہ سے نکلا۔ پھر دونوں مسکرا دیے۔  
”میں تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا۔۔۔ کہاں تھے۔ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔“ اسد نے کہا۔

”ایسی کیا ضرورت تھی۔۔۔؟“ ریحان شوخی سے مسکرائے۔  
”تمہارے کافذات لے آیا ہوں۔“  
”اوہ!“

”پورا دن نذر ہو گیا ان سرکاری کاروائیوں میں۔“  
”مجھے افسوس ہے۔۔۔ تمہاری محنت رائیگاں گئی“ وہ ہنس دیے۔  
”کیوں؟“ اسد کچھ نہ سمجھے۔  
ریحان شوخی سے مسکرائے۔  
”محنت رائیگاں کیوں گئی؟“

”ان کافذوں کو آگ دکھا دو“ وہ شوخ نظروں سے اسد کی طرف دیکھ کر بولے۔  
”کیا کہہ رہے ہو۔“ اسد جھنجھلائے۔

”میں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اسد“ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ریحان خوشی سے مسکرا دیئے۔۔۔ ”اب میں نہیں جاؤں گا۔۔۔ نہیں جا سکتا۔ نہیں جا سکتا اسد!“

ریحان وفور جذبات سے مغلوب ہو کر اسد سے لپٹ گئے۔ یہ والہانہ انداز ان کی

بے پناہ خوشیوں کا غماز تھا۔ اسد کو اپنے عزیز دوست کی خوشی سے بے پناہ مسرت ملی۔  
”یہ مجھ سے زور آزمائی کس لیے کر رہے ہو۔۔۔ بات کیا ہے۔ مجھے تو اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آ رہا۔ چہرہ تو دکھاؤ۔ ریحان ہی ہو۔۔۔ یا اس مردے کے پتھر میں کوئی اور روح سما گئی ہے۔“ اسد ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔  
”مذاق نہ کرو اسد۔۔۔ میری خوش بختیوں پر مجھے مبارک باد دو“ ریحان ان سے الگ ہو کر بولے۔

”یہ خوش بختیاں اچانک کہاں سے ٹپک پڑیں۔“  
”اللہ کی دین ہے۔“  
”وہ تو ہے ہی۔ لیکن یہ دین اچانک ہونی کیسے؟ وہ آگ کی لپٹیں کیا ہوئیں؟“  
”گلزار بن گئیں۔“  
”وہی تو پوچھ رہا ہوں کیسے؟“  
”یہ تو میں ابھی تک خود بھی سمجھ نہیں پایا۔“  
”بنتے کیوں ہو۔“  
”اللہ نہیں۔۔۔ سچ کہہ رہا ہوں۔“

اور پھر  
اسد کے اصرار پر ریحان نے صاعقہ سے ملاقات کی ساری روئے اد کہہ ڈالی۔  
اسد مسکراتے ہوئے سن رہے تھے۔  
”میں نہ کہتا تھا۔ تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔“  
”ہو سکتا ہے۔“  
”ملاووسی کے اندھیروں میں ہر چیز ڈوب جاتی ہے۔“  
”واقعی ہر چیز تیرہ و تار نظر آتی تھی۔“  
”اور اب؟“ اسد نے شوخی سے پوچھا۔

”اب۔۔۔ اب۔۔۔ کچھ نہ پوچھو دوست۔۔۔“ ریحان خوشی سے مجھم گئے۔  
”شعر کی لطافت صرف محسوس کی جاسکتی ہے۔۔۔ تشریح اس لطافت کو کلمہ کے رکھ دیتی ہے۔“  
”اوہ۔“  
دونوں مسکرائے۔



رات فسون خیز تھی۔  
ریحان خواب گاہ کے مغربی دریچے کھولے باغ کی اونگھتی فضاؤں اور مدہوش  
ہواؤں میں گم سے تھے۔ تقدیر کا اچانک اور غیر متوقع التفات جہاں بے پناہ خوشیوں کا  
حامل تھا، وہاں اک لطیف سی الجھن بھی پیدا کر گیا تھا۔  
صاعقہ کے نرم و گداز جسم کا لمس اور اس کے مہکتے سانسوں کا پوشریا طلسم ابھی  
تک حواس پہ چھایا تھا۔  
جوں جوں وقت گزر رہا تھا انھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے جاگتے میں کوئی حسین سا  
خواب دیکھ لیا ہو۔

اور

پھر

جانے کیوں وہ یہ سوچ کر بیقرار سے ہو گئے۔ کہ یہ کہیں کوئی انوکھا خواب ہی نہ  
ہو۔ کوئی فریب خیال، کوئی سراب۔۔۔۔۔ اپنی تشنہ آرزوؤں کا عکس۔  
وہ سوچ سوچ کر گھبرانے لگے۔  
وہ رات کے کھانے پر بھی حاضر نہ تھی۔  
کیا عجب سہیلی کے فسون نے ان لمحوں کو جنم دیا ہو۔ جنہیں اپنی تقدیر کے  
درخشندہ ستارے سمجھ بیٹھے ہوں۔

یہ خیال مضحکہ خیز بھی، حقیقت سے بعید بھی لیکن ریحان اس خیال سے بے  
طرح گھبرانے لگے۔ بعض اوقات انسان اپنی الٹ پلٹ سوچوں ہی سے اپنے لیے خامی  
الجھنیں پیدا کر لیتا ہے۔ ریحان بھی اس وقت کچھ اسی کیفیت سے دوچار تھے۔  
فدہ کمرے سے نکل آئے۔ کچھ دیر برآمدے میں ٹہکتے رہے۔

ان کا جی چاہا۔ صاعقہ کی خواب گاہ میں جا کر اسے بلا لائیں۔ اور مدہوش اور  
متولی فضاؤں میں ایک دوسرے کے قریب، ایک دوسرے میں کھولے کھولے بیٹھے  
ریں۔ وقت گزرتا جائے۔ گزرتا جائے۔ اور وہ وقت اور ماحول کی قید سے آزاد ایک  
دوسرے میں کھولے رہیں۔  
وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔

جرات کے قدم ڈنگا رہے تھے۔  
لیکن عشق عقل کی قید و بند میں کب تک محبوس رہ سکتا تھا۔ وہ بڑے برآمدے  
کا آخری موڑ گھوم کر صاعقہ کی خواب گاہ کی طرف چل دیئے۔  
دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر تھے کہ آیا خواب گاہ سے باہر نکلی۔  
ریحان کچھ جھجکے۔

پھر

آگے بڑھ گئے۔

”صاعقہ سو تو نہیں گئیں؟“ ریحان نے چلتے چلتے آیا سے پوچھا۔  
”نہیں“ آیا نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں کیسی لازوال چمک تھی۔  
ریحان قدم بڑھا کر دروازے کے قریب پہنچے۔ لیکن پردہ اٹھانے سے پہلے آیا  
کی آواز پر پلٹے۔

”صاحبزادہ صاحب وہ کمرے میں نہیں ہیں۔“

”کہاں گئیں؟“

”شاید باغ میں۔“

”اس وقت؟“

”ہاں۔ کہہ رہی تھیں نیند نہیں آرہی۔۔۔۔۔“

ریحان نے چاہا پوچھ لیں۔ بیرونی باغ میں گئی۔۔۔۔۔ یا پھلے۔۔۔۔۔  
لیکن آیا سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جہاں بھی ہوگی جذبہ عشق اسے ڈھونڈ لے گا۔  
وہ مڑے۔

آیا نے آہستگی سے کہا ”پھلے باغ میں شاید بارہ دری کی طرف گئی ہیں۔“  
شام مجھے ستار وہاں پہنچانے کے لیے کہا تھا۔“



آیا مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ریحان اس مسکراہٹ سے کچھ خفیف سے  
منظر آنے لگے۔ آیا کو ممنونیت سے دیکھتے ہوئے وہ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر  
اندروا داخل ہو گئے۔ پچھلے باغ میں جانے کے لیے یہ راستہ مختصر تھا۔

ریحان جیسے ہواؤں کے دوش پر اڑتے چلے جا رہے تھے۔ مقناطیسی کشش  
منزل کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہی تھی۔

بارہ دری کی سنگین عمارت ٹھنڈی اور دھیمی چاندنی میں بڑی پراسرار دکھائی دے  
رہی تھی۔ ریحان کا سبیل شوق انھیں بہانے لیے جا رہا تھا۔

آیا کا کہنا درست تھا۔ صاعقہ بارہ دری میں تھی۔ دائیں جانب کی سیڑھیوں پر  
ارغوانی قالین بچھا تھا۔ جو چاندنی میں سیاہی مائل نظر آ رہا تھا۔

صاعقہ نے دودھیا رنگ کا چمکیلا کاؤن پہن رکھا تھا جس کی ڈوریاں اس کے  
کندھوں کی ڈھلانوں پر پھسل رہی تھیں۔ باریک سادو پٹے شانوں پر پھیلا تھا۔ کاؤن  
کا پھیلاؤ بارہ دری کی دو سیڑھیوں پر تھا۔ وہ اس لمحے سی چاندنی میں کوئی خوابناک سا  
تصور لگ رہی تھی۔ ستار قریب ہی رکھا تھا۔ لیکن صاعقہ کا دھیان اس کی طرف نہ تھا۔  
قریب ہی پھولوں کی میبلیں اٹھتی چلی گئی تھیں۔ صاعقہ لاشعوری طور پر میل سے  
پھول اور پتیاں نوچتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھیں۔

ریحان دبے قدموں سے اس کے قریب آ گئے۔ دودھیا چمکیلے لباس میں صاعقہ  
میٹھی انھیں یوں محسوس ہوئی۔ جیسے چاند کی ساری چاندنی صاعقہ کے پیکر میں سمٹ  
آئی ہو۔

بھلا شوق و تجسس سے دیکھتے ہوئے وہ اس کے سامنے آتے ہوئے رک گئے۔  
”اوہ۔۔۔“ صاعقہ کی محویت ٹوٹی۔ کچھ گھبراہٹ، کچھ شوق، کچھ وارفتگی  
اس کے سراپا پر چھا گئی۔ ریحان مسکرا دیئے۔ جواباً وہ بھی مسکرا دی۔ لیکن اس کی  
مسکراہٹ میں جیسا کا بارا سنا تھا کہ وہ پھر ریحان کی طرف نہ دیکھ سکی۔

آج شام اسے جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ کس بیبکی سے ریحان کے سینے سے جا لگی  
تھی۔ اس احساس سے وہ کتنی زیر بار تھی۔ کتنی شرم آ رہی تھی اُسے۔۔۔ رات  
وہ کھانے کے کمرے میں بھی تو اسی لیے نہ گئی تھی۔ ریحان سے سامنا کرتے ہوئے اسے  
بڑی ہی جھجک آئی تھی۔ وہ دیر ہی سے سوچ سوچ کر شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔

اب ریحان کو یوں سامنے کھڑے دیکھ کر وہ گھبراہٹ اور ندامت کے ملے جلے  
جذبات سے دوچار تھی۔

لیکن ان جذبات میں شوق کا عنصر بھی تھا۔ بجوم تمنا بھی اور جانفزا آرزو بھی۔  
وہ جھجک کر سمٹی۔

ریحان بلا جھجک اس کے قریب جا بیٹھی۔  
صاعقہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ ریحان کی جواں جواں نظروں سے اسے  
کنجاہب آ رہا تھا۔

”مفل تو نہیں ہوا؟“ ریحان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
صاعقہ لجا گئی۔

”صاعقہ“ ریحان قدرے وقفے کے بعد پھر بولے۔

صاعقہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی تو زبان گنگ ہو گئی تھی جیسے ریحان کی  
قربت لطیف احساسات کو بھڑکا رہی تھی۔ اک سرور سا تھا جو سرتاپا مچھلیا جا رہا تھا۔  
بول دینے کی فرصت ہی کسے تھی۔

ریحان نے گردن کو خم دے کر قدرے جھکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا شرماتی لجاتی  
صاعقہ دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ اک طمانیت کا احساس ان کی شریانوں میں دوڑنے  
لہو میں کتنی کیفیت پیدا کر گیا۔

”میری موجودگی ناقابل برداشت تو نہیں؟“ محبوب نظروں کی شہ پا کر ریحان  
ٹوٹی سے بولے۔

صاعقہ نے اک ہکا غلط انداز ان پر ڈالی۔ اس کے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو رہا  
تھا۔ اس نے شرمناک منہ پھیر لیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ایسی خاموشی جس میں نقوں کا ترنم تھا۔ بہاروں کی  
دل کشی تھی۔ ایک دوسرے کی جانفزا قربت کا احساس حواس پر سرور و انبساط بن کر چھا  
ہا تھا۔

”صاعقہ“ سکوت کو اس سرگوشی نے توڑ دیا۔  
”ہی“ وہ آہستگی سے بولی۔  
”نیند آ رہی ہے؟“



اس نے غشی میں سر ہلا دیا۔

”پھر چپ کیوں ہو۔ کوئی بات کرو۔“

صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ ایسی نظروں سے جن پر خواہ مخواہ پیارا آجائے۔

اس کی نظریں کہہ رہی تھیں اب بات کرنے کو رکھا ہی کیا ہے۔

”ستہائی چاہتی ہو۔ تو میں چلا جاؤں۔“ کچھ رک کر ریحان بولے۔

”ستہائیوں سے نباہ کرتے تھک چکی ہوں“ صاعقہ مترنم لہجے میں بڑی آہستگی

سے بولی۔

”صاعقہ“ ریحان و فور جذبات سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ بے اختیار ہو کر انہوں

نے صاعقہ کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اسی مترنم خاموشی کا فسون طاری ہو گیا۔

نرم و گداز سنہری ہاتھ ریحان کے مضبوط ہاتھ میں تھا۔ وہ بے اختیاری کے عالم

میں بار بار ہاتھ دہرا رہے تھے۔ یہ دباؤ ان کے بار کی شدت اور عشق کی سندی کا غماز تھا۔

صاعقہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ریحان نے اس کا ہاتھ نہیں اس کی زندگی کی

باگ ڈور اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لی ہو۔

اس رات دونوں دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔

ایک دوسرے کی قربت کا جانفزا احساس نشہ بن کر چھایا رہا۔

دونوں نے بہت کم باتیں کیں۔

لیکن

جو سرورِ محکم اس خاموشی میں تھا، وہ شاید صدیوں باتیں کرنے پر بھی میسر نہ

آسکتا تھا۔

۴۳

ابھرتی صبحوں کے فرخت بخش اجالے اور ڈوبتی راتوں کی چاندنی کے نور میں

ڈوبے اندھیرے صاعقہ اور ریحان کے عشق کے شہد تھے۔ دن میں بہت کم دونوں کا

ٹکراؤ ہوتا۔ اگر ہوتا بھی تو صاعقہ بڑی خوب صورتی سے کترا جاتی۔ ریحان بعض اوقات

جھنجھلا بھی جاتے۔ شاکی ہوتے تو صاعقہ بڑی اپنائیت سے کہتی۔ ”آپ بدل گئے ہیں

ریحان۔ زمانہ تو نہیں بدلا۔۔۔ چبھتی ہوئی نظروں کا نشانہ کیوں بنانا چاہتے ہیں

مجھے۔“

ریحان قائل ہو جاتے۔ گھر والوں کے خیالات سے وہ بے خبر تو نہ تھے۔ صاعقہ

تہی ہی تو تھی۔ یہ اسی کی محتاط روی تھی۔ جو اب تک دونوں کے تعلقات عشق کی

بلندیوں کو چھونے کے باوجود کسی کی نظروں میں نہ کھٹکتے تھے۔ ریحان کے ہم دم و ہمراز

اسد تھے۔ ریحان دل کی دھڑکنوں کی لے پر تھرکتے ہوئے نغمے انہیں سنا دیا کرتے

تھے۔ اسد کتنے خوش تھے۔ لیکن اس کے باوجود ماحول و فضا دیکھتے ہوئے ریحان کے

رازان کے سینے کی گہرائیوں میں دفن تھے۔

لیکن احتیاط کے باوجود صادق جذبات کا اظہار موقع بے موقع ہونے ہی لگا۔ کوئی

صاعقہ کی غوسہ کا نام لیتا تو ریحان کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو جاتا، بات کرنے والے کو

لینے کے دینے پڑ جاتے۔ یہ حمایت اکثر نظروں میں کھٹکتے لگی۔

کوئی کھیل کھیلا جاتا تو صاعقہ کا وہاں ہونا ضروری ہو جاتا۔ کھیل میں حصہ لینا نہ

تھی۔ خاموش تماشائی کی حیثیت سے اسے وہاں بیٹھنا پڑتا۔ اب تو ریحان کی ٹھکانیں

ایکے موقعوں پر محبت و عقیدت کے خاموش اظہار میں بھی میلکی سے کام لینے لگی

تھیں۔

ریحان کے بدلتے تیور کئی ہم جلیسوں کی نظروں میں کھٹک رہے تھے۔ لیکن



ابھی تک اظہار خیال کی جرات کسی کو نہ ہوئی تھی۔ ایسی انہونی بات پر یقین کرنا بھی تو آسان نہ تھا۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔

فرخ نے سینما کا پروگرام بنایا۔ اس تفریح کے لیے وہ دن موزوں بھی بہت تھا۔ کچھ روکد کے بعد داوی حسن بانو سے اجازت لے لی گئی۔ کہ نوجوانوں کی پارٹی سینما جانے کی۔

مقررہ وقت پر دس پندرہ لڑکوں اور لڑکیوں کا حسین جگہشتا برآمدے میں تھا۔ چار موٹرس تیار تھیں۔ سب سے اگلی موٹر ریحان کی ذاتی گاڑی تھی۔ جس کے پائیدان پر ایک پاؤں رکھے وہ سیاہ چشمہ ہاتھ سے گھما رہے تھے۔ اگلی سیٹ پر کیمہ بھی رکھا تھا۔ سب سے الگ تھلگ کھڑے وہ سراپا انتظار تھے۔

برآمدے میں خاصا شور تھا۔ ریشمی اور رنگین لباسوں کی مہکتی سرسراہٹیں اس شور کو مترنم بنا رہی تھیں۔

”سب آگئے؟“ فرید نے آتے ہی اک اچھتی سی نظر اس حسین جگہشتے پر ڈالی۔

”ہاں“ کسی نے جواب دیا۔

”تو انتظار کس کا ہے۔ وقت تو ہو رہا ہے۔“

”صاعقہ نہیں آئیں“ ثینہ نے کہا۔

”وہ بھی جانے گی؟“ سمیرا نے بڑی نخوت سے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں“ شاہد بولے۔

”کسی نے کہا تھا اس سے؟“ فرخ نے پوچھا۔

”پروگرام تم نے بنایا کہنا بھی تمہارا ہی فرض تھا“ نعیم بولے۔

”مجھے تو اس کا خیال ہی نہ آیا“ فرخ نے کہا۔

”اب جا کر کہہ دیں وہ کونسا جائے گی“ سمیرا نے جیسے اس کی کسمپرسی پر رحم کھایا۔

”جائیں گی کیوں نہیں“ اسد بولے۔

”اب کہوں تو ہر امانیں گی“ فرخ کچھ کتراتے۔

”کچھ ضرورت نہیں اب۔ میں نے کہہ دیا تھا۔“ اسد بولے۔

”پھر آئی کیوں نہیں۔“

”میں نے کہا نا۔ اس نے جانا تو رہا ہی ہے۔ یہ پروگرام کوئی نیا تو نہیں۔ پہلے کب ہمارے کسی پروگرام میں حصہ لیا ہے اس نے۔“ سمیرا بڑے غرور سے بولی۔

”بھئی جائیں گی اور ضرور جائیں گی۔۔۔“ اسد نے دور کھڑے ریحان کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن اس مسکراہٹ کو معنی کا جامہ کوئی نہ پہناسکا۔

یونہی باتیں ہوا کیں۔

”وہ آگئیں“ اسد نے برآمدے کے آخری سرے پر صاعقہ کو دیکھا سفید لباس میں وہ یوں نمودار ہوئی جیسے شفاف مطلع پر اچانک ماہ کامل نمودار ہوا ہو۔ جھجکتے قدموں سے وہ اس رنگ و بو کے سیلاب کی طرف بڑھی۔

”چلو چلو جلدی کرو“ نعیم نے آستین کھینچ کر وقت دیکھا۔

کئی نظریں صاعقہ کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ کوئی اس کے حسن کی معترف ہوئیں۔ کوئی مرعوب ہو کر رہ گئیں۔

سمیرا نے اسے سر تاپایوں کھورا جیسے آج پہلی بار دیکھا ہو۔ اس کے آجانے سے نفل کارنگ بھی تو پھیکا پڑ گیا۔ اب تک ستارے ہی جھلملا رہے تھے۔ چاند اتر آنے سے جیسے ستاروں میں روشنی نہ رہی ہو۔

باتیں کرتے ہوئے لڑکوں لڑکیوں کا حسین جھرمٹ پورچ میں آگیا۔ صاعقہ سب سے پیچھے تھی۔ ثینہ ساتھ دینے کو کچھ رسمی سی باتیں کر رہی تھی۔

ریحان اسے دیکھ کر سب کی طرف آگئے۔

”بٹھنے کی کیا ترتیب ہوگی؟“ فرخ نے سب پر طائرانہ نظر ڈالی۔

”چار موٹرس ہیں۔ حساب نکالو“ نعیم بولے۔

”چار نہیں“ ریحان نے ٹوکا۔

”کیوں۔۔۔ چار ہی تو ہیں۔“ فرید گنتے ہونے بولے۔

”میری گاڑی شامل نہ کرو“ ریحان اسد کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر بولے۔

”کیوں؟“ کئی آوازیں تھیں۔

”اس میں صرف ایک سواری کی گنجائش ہے۔“ ریحان ہنسنے لگی۔ اسد انہیں گھور کر مسکرائے۔ اور صاعقہ اس شوخ جسارت پر سر تاپا کاٹپ گئی۔



”وہ کون خوش نصیب ہے؟“ نعیم نے کن اٹھیوں سے سمیرا کی طرف دیکھا۔  
شاہرخ نے سمیرا کی کمر میں ٹھوکا دیا اور سمیرا کانوں کی لوؤں تک سُرخ ہو گئی۔  
”بھٹی جلدی کرونا دیر ہو رہی ہے۔“ اسد نے بات کا رخ بدلا۔  
”کون کس گاڑی میں بیٹھے یہ بھی تو پتہ چلے۔“ ریحان نے تو صاف جواب دے دیا  
ہے۔ اب ایک گاڑی اور نکالنا پڑے گی۔“  
”تو پھر لے جائیے اپنی سواری کو۔۔۔“

ریحان بڑھے۔

سب کی نظریں سمیرا پر لگی تھیں۔ جو پھولوں سے لدی شاخ کی طرح دوہری  
ہوئی جا رہی تھی۔  
لیکن

سب کا قیافہ غلط تھا۔

ریحان سب کے پیچھے سے گھوم کر صاعقہ کی طرف آئے۔  
صاعقہ اس غیر متوقع بات پر بے طرح گھبرا گئی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ سب کی  
نظریں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

”آؤ“ ریحان نے اس کی حیرت سے پوری کھلی آنکھوں میں مسکرا کر دیکھا۔

صاعقہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”آؤ بھی“ ریحان نے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھاما اور تقریباً  
کھینچتے ہوئے گاڑی تک لے گئے۔

اک سناٹا سا طاری ہو گیا۔ گنگ، شہر اور حیرت سے بُت بنے سب دیکھتے رہ  
گئے۔ ریحان نے کسی کی پروا کیے بغیر اسے اگلی نشست پر دھکیلا۔ دروازہ بند کر کے  
دوسری طرف آئے۔ سیٹ پر بیٹھے ہوئے دروازہ بند کیا اور پھر سب کی طرف دیکھے بغیر  
گاڑی چلا دی۔

اسد کے علاوہ کوئی بھی تو کچھ نہ سمجھ سکا۔

”یہ کیا ہے؟“ آنکھوں ہی آنکھوں میں استفسار ہو رہے تھے۔

اپنا خاصہ معمہ تھا۔

جو

نوعیت کے اعتبار سے انوکھا بھی تھا اور دلچسپ بھی۔  
ہر کوئی اس معمے کا حل چاہتا تھا۔  
”بیچاری صاعقہ“ بالآخر سکوت کو سمیرا نے توڑا۔  
”بیچاری!!“

”تو اور کیا۔“ ریحان ساتھ لے گئے ہیں۔ اللہ جانے کیا گت بنائیں گے۔“  
کوئی نیا مذاق سوچا ہے انھیں؟

”میں بھی دیکھ رہا تھا کہ کئی دنوں سے ریحان اس کی حمایت کر رہے ہیں۔“  
”یہی تو ان کے مذاق کی تمہید ہے۔“  
”کچھلے واقعات یاد نہیں آپ کو۔“

”ہاں ہاں۔۔۔ ایک دفعہ پہلے بھی ریحان نے یوں ہی اسے بنایا تھا۔“  
”لیکن ہے بری بات۔۔۔ جب تو خیر وہ چھوٹی تھی۔ اب یہ فعل کچھ  
زرب نہیں دیتا۔“

”اسی لیے تو میں نے بیچاری کہا۔“

”بری بات ہے۔“

”واقعی۔“

اسد سگریٹ ہوشوں میں دبائے یہ تبصرہ سن رہے تھے۔ ان کے ہوشوں میں  
سگریٹ سے کہیں زیادہ مسکراہٹ دبی تھی۔

”اب یہیں کھڑے رہنا ہے؟“

”چلیے۔“

”ایک اور موٹر نکال لائیں۔“

”لانا پڑے گی۔“

”مجھے تو بار بار صاعقہ کا خیال آ رہا ہے۔“ سمیرا نے پھر ہمدردی جتائی۔  
”شاید دل میں اٹھنے والے کسی موہوم خدشے کا رد عمل تھا۔“

سب سمیرا کے ہم خیال نظر آ رہے تھے۔ جذبہ ترحم موج میں آیا ہوا تھا۔ بار بار  
صاعقہ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔

چوتھی گاڑی بھی لائی گئی۔ سب نے اپنی اپنی جگہ سنبھلی اور اسی موضوع پر  
انہماک دینا کرتے ہوئے سینما کی طرف چل دیے۔



صاعقہ پلکیں جھپکا کر انہیں دیکھ کر رہ گئی۔  
 ”بزدل“ ریحان مخمور سے منظر آرہے تھے۔  
 ”وہ سب کیا کہیں گے؟“  
 ”میں بتاؤں۔“

صاعقہ انہیں شاکی نظروں سے گھور رہی تھی۔  
 ”بتاؤں کیا کہیں گے سب“ ریحان چھیرنے کے موڈ میں تھے۔  
 ”جائیے بھی“ صاعقہ کی خفگی میں بھی لگاوٹ تھی۔  
 ”بتا دوں؟“

”نہیں“  
 ”کیوں؟“

”میں جانتی ہوں کیا کہیں گے سب۔۔۔“ اور پھر وہ مغموم سی ہو گئی۔  
 افسردہ آواز میں بولی ”اک قیامت کھڑی ہو جائے گی۔“  
 ”ہونہ“ ریحان کی گرفت سٹیئرنگ پر مضبوط ہو گئی۔ سنجیدہ اور ٹھوس آواز  
 میں بولے: ”اس قیامت سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔“  
 صاعقہ اس آواز کے ٹھوس اور سنگین استحکام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔  
 کاڑی سنجیدہ راستے پر آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔  
 کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد صاعقہ نے گوشہ چشم سے ریحان کی طرف دیکھا۔ وہ  
 اب تک غاصے سنجیدہ منظر آرہے تھے۔

”آپ کس طرف جا رہے ہیں؟“  
 ”کیوں؟“

”سینما نہیں جا رہے؟“  
 ”بڑا شوق ہے فلم دیکھنے کا!“  
 ”نہیں تو۔۔۔۔۔“

”پھر چپ چاپ بیٹھی رہو۔“  
 ”کچھ پتہ بھی تو چلے۔“  
 ”مجھ پر اعتماد کرو۔“

موٹر سینما جانے والی کشادہ سڑک کو چھوڑ کر اس تنگ سڑک کی طرف گھوم گئی۔  
 نصیر آباد کی پہاڑیوں کے دامن سے ہوتی ہوئی اونچائیوں کی طرف دھیرے دھیرے  
 اٹھتی جا رہی تھی۔

صاعقہ کے حواس پر اب تک گھبراہٹ اور خوف کی کپکپی طاری تھی۔ ریحان کی  
 جسارت دھکے چپے رازوں کو مشتہر کر دینے کو کافی تھی۔ اور اس بات سے جن نتائج کے  
 ظہور پذیر ہونے کی توقع تھی۔ صاعقہ ان کے خیال ہی سے سہم گئی تھی۔

ریحان اس کی قلبی کیفیت سے آگاہ تھے۔ دو تین بار بلانے پر بھی وہ نہ بولی  
 تو ریحان شرمسار اور مخمور ٹھکانوں سے اسے مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگے۔

صاعقہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پہاڑیوں کے اٹھتے ہوئے  
 سلسلے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

ریحان نے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ زیر لب مسکراتے ہوئے لاطعلقی  
 سے سٹیئرنگ تھامے بیٹھے رہے۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ سراسیمہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”ہوش میں آگئیں“ ریحان نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ کر کہا۔  
 ”آپ نے بہت بُرا کیا“ وہ جیسے رو دینے کو تھی۔  
 ”کیا؟“

”سب کے سامنے۔۔۔۔۔“  
 ”تمہیں بھگا لیا۔“

صاعقہ انہیں گھور کر رہ گئی۔  
 ”ڈر رہی ہو“ قدرے توقف کے بعد ریحان نے پھر چھیرا۔



”یہ میری بات کا جواب نہیں۔“

”تمہاری اوٹ پٹانگ باتوں کا کیا جواب دوں۔“

صاعقہ مسکرا کر انہیں دیکھنے لگی۔

اک ہیچیدہ موڑ سے کچھ فاصلے پر کھلی جگہ میں ریحان نے گاڑی روک دی۔ سیاہ چشمہ آنکھوں پر تھا۔ کیمرا کندھے پر ڈالا۔۔۔ اور دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے ”آؤ“۔

صاعقہ اس معمول کی طرح جو عامل کے اشارہ ابرو پر نارچ اٹھتا ہے۔ گاڑی سے نکل آئی۔

موسم انتہائی رنگین تھا۔ اونچے لانے درختوں میں الجھی ہوئی پچھلے پہر کی دھوپ ہواؤں کی رندانہ چھیڑ سے کانپ رہی تھی۔ پہاڑیوں کے اٹھتے ہوئے طویل سلسلے بڑے جاذبِ نظر تھے۔ سبز مخملیں گھاس پر خود رو پھولوں کے چمچے بڑی بہار دکھا رہے تھے۔ دور پہاڑی ندی الہ نغمے لگناتی مستی کے عالم میں اچھلتی کودتی جا رہی تھی۔ ایک اونچے پتھر پر ریحان صاعقہ کے قریب کھڑے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”آؤ“ کچھ دیر بعد ریحان پتھر سے نیچے اترے۔

”اب کہاں؟“

”نیچے۔۔۔۔۔ گھاٹی میں“

”وہاں۔۔۔۔۔ وہاں کیا کریں گے؟“

”ان مدہوش فضاؤں میں کھوجائیں گے۔“

صاعقہ کے لب مسکرائے۔ جیسے نازک سی پتھریاں ہوا کے ہلکوروں سے

کانپ گئی ہوں۔

”واپس چلیے۔“

”کیوں؟“

”سب سینما میں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”کرنے دو۔“

”لیکن“

”صاعقی۔۔۔۔۔ خواہ مخواہ اس فضول ذکر سے بور نہ کرو۔“

”فضول ذکر؟“

”تو اور کیا۔ دیکھو کتنا مدہوش کن سماں ہے۔ بھول جاؤ سب کچھ بھول جاؤ ان

لمحوں کو کسی ڈریا خوف سے مغلوب نہ ہونے دو۔“

ریحان نے صاعقہ کا ہاتھ تھام لیا اور محتاط قدموں سے گھاٹی میں اترنے لگے۔

نفیس سفید ریشمی لباس میں صاعقہ کتنی حسین دکھائی دے رہی تھی۔ چہرے پر خوشی کے باثرات بھی تھے اور تفکر کے سایے بھی۔ یہ حسین سا امتزاج اس کے حسن کو چار پانچ لگا رہا تھا۔

کافی دیر دونوں اس گھاٹی میں گھومتے رہے۔ ریحان نے صاعقہ کی کئی تصویریں لیں۔ درختوں کے گھنیرے سایوں تلے، ندی کے کنارے، پتھروں پر بیٹھے ہوئے خود رو پھولوں کے قدرتی تختوں کے درمیان، حسن کے کئی انداز کیمرا کی آنکھ میں مقید ہو گئے۔

دھوپ کے سائے دراز ہونے لگے۔ ہواؤں میں کچھ تیزی آگئی۔ صاعقہ دل ہی دل میں سہمی جا رہی تھی۔ کئی بار واپس چلنے کی استدعا کی تھی لیکن ریحان الجھ پڑے تھے۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن ریحان تو عجیب وقت، ماحول اور اپنے آپ کو بھول جانے کے لیے آئے تھے۔ وہ سبز گھاس پر ایک غمراہ کٹکھ بنائے نیم دراز تھے۔ سگریٹ کے کش اطمینان سے لیتے ہوئے وہ پاس بیٹھی خوف زدہ سی صاعقہ کو دیکھ رہے تھے۔

”ابھی تک ڈر رہی ہو؟“ انہوں نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہا۔

”اب تو چلیے۔“

”کیوں؟“

”یہیں رات گزارنا ہے؟“

”غیر گزار جائے تو پورا نہیں۔“

”یہ شاعری پھوڑیے حقیقت کی دنیا میں آئیے۔ سب سینما سے واپس ہونے

السلہوں کے۔ وہ کیا کہیں گے ریحان۔۔۔۔۔“



کہیں کے صاعقہ اور رحمان اک ان ٹوٹ بندھن میں بندھ گئے۔ وہ لہروانی سے بولے۔ لیکن اس بات کے پس پردہ طوفان کا احساس صاعقہ کے دگ دیپے میں کپکپی پیدا کر گیا۔

”کیوں صاعقی۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے نا۔ یہی کہیں کے مناسب۔“

”صاعقہ نے رحمان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا تنک کچھ زیادہ ہی مفوم ہو گئی تھی۔ رحمان کے شکستہ استفسار کا جواب وہ معمولی سی مسکراہٹ سے بھی نہ دے سکی۔“

”صاعقی؟“

”جی“

”کیا بات ہے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“

”ڈر رہی ہونا۔“

”ہاں“

”پچھی“

”رحمان“

”ہوں“

”آپ نے اچھا نہیں کیا؟“

”کیوں؟“

”سب کیا کہیں گے۔“

”صاعقی اگر میں یہ کہہ دوں کہ یہ قدم میں نے اٹھایا ہی اس لیے ہے کہ سب کچھ کہیں۔۔۔۔۔۔ تو“

صاعقہ حیران سی انھیں دیکھنے لگی۔

رحمان اس کے برابر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولے ”صاعقی اب میری برداشت جواب دے گئی تھی۔ کب تک جم جموں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے رہتے پیدا کرنا کوئی جرم تو نہیں۔۔۔۔۔۔ میں دانستہ آج تمہیں سب کے سامنے یہاں لے آیا ہوں۔ سب جان جائیں۔۔۔۔۔۔ کسی کو کوئی غلط فہمی نہ رہے۔“

”سب کا جان جانا۔ جانتے بھی میں کتنا۔۔۔۔۔۔ اس کے پونٹ کپکپا گئے۔ آنکھوں میں فی سی آگئی۔ سر جھکا کر وہ گھاس کے سٹکے مسٹنے لگی۔“

”میں سب کچھ جانتا ہوں صاعقی۔۔۔۔۔۔ لیکن اپنے حرم میں بھی پوری آن ہے۔ میں سب سے نگرانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ تم ذرا بحر تردد نہ کرو صاعقی۔۔۔۔۔۔ میں کسی بات سے بے خبر نہیں جسے سر نہ کیا جاسکے۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے رحمان“ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

”میرے ہوتے ہوئے بھی۔“

رحمان نے اس کی ٹھوڑی ہچھو کر اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔

صاعقہ نے رحمان کی منظر سے نظریں ملائیں تو اسے یوں محسوس ہوا کہ رحمان اس کے لیے ایک ایسا سہارا ہیں جو خاندان تو ایک طرف، زمانہ بھی نگرانہ ہے تو لرزیدہ نہ ہو۔۔۔۔۔۔

”میرے ہوتے ہوئے بھی ڈرتی ہو صاعقہ“ رحمان نے پھر پوچھ لیا۔

”نہیں“ صاعقہ نے سحرزدہ آواز میں کہا۔

رحمان کو جیسے اس نے جہان بھر کی خوشیاں دے دیں۔ خوشی سے سرشار ہو کر مجھوم گئے۔

”کسی کی پرواہ نہ کرو۔۔۔۔۔۔ کسی کے بارے میں نہ سوچو۔۔۔۔۔۔ بھول جاؤ۔ سب تلخیاں بھول جاؤ۔ ان لمحوں کو ڈر یا خوف سے ملوث نہ کرو۔۔۔۔۔۔ ہنسو۔ مسکراؤ۔۔۔۔۔۔ کاؤ۔۔۔۔۔۔ ایک دوسرے کی قربت میں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ حاصل نہ کانی ہے صاعقی۔“

میں تو صرف یہی جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔ بھول جاؤ۔۔۔۔۔۔ سب کچھ بھول جاؤ۔“

اور صاعقہ

جیسے سب کچھ ہی بھول گئی۔

رحمان کی سنگت میں وہ مسکراتی رہی۔ ہنستی رہی اور زندگی کی شادمانیوں سے اپنی بھولی بھرتی رہی۔

رحمان نے کمانے کی فرمائش کی۔

اور

اس کی جاں گداز آواز سے فضا میں مرتعش ہو گئیں۔ وہ دلفریب انداز میں



ریحان کے قریب بیٹھی حسین نے نفی سناتی رہی۔

خاصی شام ہو رہی تھی۔ جب ان متوالوں کو وقت کا احساس ہوا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے بلندی کی طرف چڑھنے لگے۔

بڑے بڑے پتھروں کو پھلانگتے ہوئے ریحان اک نشیبی جگہ پہ آکر ٹک گئے۔  
”تمہیں ایک یادگار دکھاؤں“ ریحان نے کہا۔

”میں جانتی ہوں۔ یہ ابا مرحوم کی یادگار ہے۔“ وہ عقیدت سے سر جھکا کر

بولی۔

”تم پہلے کبھی یہاں آئی ہو؟“

”کبھی“

”کیلی؟“

”نہیں۔ آیا کے ساتھ۔۔۔۔۔ اس نے بتایا تھا۔۔۔۔۔ یہاں ابا مرحوم نے

گر کر جان دی تھی۔“

”داوی حضور نے یہاں پتھر چنوا دیئے تھے تاکہ یادگار رہے۔۔۔۔۔“

دونوں چند لمحے خاموشی سے ان بے جان پتھروں کو عقیدت سے دیکھتے رہے۔  
جن سے اک شہید وفا کی داستان وابستہ تھی۔

سینما میں ریحان کا سبھی انتظار کر رہے تھے۔ لیکن سمیرا کے انتظار کی نوعیت جدا تھی۔ گھبراہٹ، خوف اور پریشانی کے ملے جلے جذبات سے وہ انتظار کر رہی تھی۔  
ریحان معاہدہ کو ساتھ لے گئے تھے۔ سمیرا نے ان کی یہ حرکت ان کی شرارت سے تعبیر کی  
تھی لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا، اُس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔  
فلم شروع ہو گئی۔

لیکن

کسی نے دلچسپی سے فلم نہ دیکھی۔ سرگوشیاں ہی ہوتی رہیں۔ نعیم، فریدون،  
فرخ، شاہد وغیرہ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ اسد اطمینان سے سگریٹ پیتے ہوئے انہیں  
دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

وقت شروع ہوا۔ سب لڑکے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ سگریٹ کی طلب سے کہیں  
زیادہ انہیں ریحان کے متعلق کُرید تھی۔

”ابھی تک وہ دونوں لاپتہ ہیں۔“

”کہاں گئے۔“

”کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“

”قصہ کیا ہے؟“

”اگر ریحان مذاق کے موڈ میں ہیں تو سراسر زیادتی ہے۔“

سگریٹ پھونکتے ہوئے سب قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ اسد بڑی لا تعلقی  
سے سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔

”یہ کیا قصہ ہے صاحب؟“ فرید نے اسد سے پوچھا۔

”میں کیا جانوں“ اسد راکھ جھاڑتے ہوئے بولے۔



”کچھ تو جانتے ہو۔“

اسد نے سن کر غصی میں سر ہلایا۔

لیکن ہنسی اتنی معنی خیز تھی کہ سب ان کے گرد ہو گئے۔

”کیا بات ہے۔ کچھ تو بتاؤ۔“

”میں کیا بتاؤں۔“

”جو جانتے ہو۔“

”صرف استاجا جانتا ہوں کہ ان کا سینما کا پروگرام نہیں تھا۔“

”ہیں؟؟؟“ ششدر سی ٹھہریں اسد کی طرف اٹھ گئیں۔

”حیرانگی کی کیا بات ہے؟“ اسد نے سب کو چپ دیکھ کر پوچھا۔

”کیا پروگرام تھا ان کا؟“

”کہیں سیر و تفریح کا۔“

”صاعقہ کے ساتھ؟؟“ فرخ نے طنزیہ ہنس کر کہا۔

”ہنسنے کی کیا بات ہے فرخ۔۔۔۔۔“

”عجیب سی بات ہے۔“

”عجیب کیوں؟“

”رحمان اور صاعقہ۔۔۔۔۔ صاعقہ۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ رحمان۔۔۔۔۔“

”کبھی کبھی انہونی بھی ہو جاتی ہے۔“

”یہ بات ہے؟“

”کیا واقعی؟“

چمے کو تیاں ہونے لگیں۔

”چلو تمہیں اس سے کیا۔ معاملہ رحمان اور صاعقہ کا ہے۔۔۔۔۔“ اسد ہنس

کر بولے۔ لیکن سب حیران سے کھڑے تھے۔ فرخ تو اب بھی یقین کرنے کو تیار

تھے۔ فرید البتہ خوش ہونے لگے۔

انکشاف حیران کن تھا لیکن دلچسپی کا پہلو لیے ہونے ضرور تھا۔

بات چیت کا موضوع بدل گیا۔

”محبت غیر اختیاری جذبہ ہے۔۔۔۔۔“ رحمان کی مثال سامنے رکھ کر اچھی خاصی

بٹ ہونے لگی۔

”کہیں یہ کسی مذاق کی تمہید تو نہیں“ فرخ نے ہنس کر کہا۔

”نہیں“ اسد بولے۔

”رحمان سنجیدہ ہیں“ نعیم نے پوچھا۔

”پورے خلوص کے ساتھ“ اسد نے جواب دیا۔

”واقعی؟“

”ہاں“

”چند دنوں سے مجھے کچھ شبہ ضرور ہو رہا تھا۔“ شاہد کچھ سوچ کر بولے۔

”رحمان کا بہ لاہور ویہ میں نے بھی محسوس کیا۔“

”اس دن دیکھا نہیں۔۔۔۔۔ صاعقہ جب تک چمن میں آئی نہیں۔ جناب

نے کھیل شروع نہیں کیا۔“

”اور اس دن جب بڑی ممانی نے اسے منحوس کہا تو کس طرح ان کے پیچھے پڑ

گئے تھے۔“

”یہ جو اکثر غائب رہتے تھے میں بھی کرید میں تھا۔“

”کچھ کھٹک مجھے بھی ضرور رہی تھی لیکن استا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔“

”اب بھی یقین نہیں آ رہا۔ کہ یہ سب کیسے اور کیوں کر ہو گیا؟“

”اچانک۔۔۔۔۔ بالکل اچانک۔۔۔۔۔ آنا فنا“ اسد ہنس کر بولے۔

”مجھے دلی خوشی ہوئی۔۔۔۔۔“ فرید بولے۔

”واقعی۔۔۔۔۔ اب تو صاعقہ کی مظلومیت پر دل کٹ جاتا تھا۔“

”میرا تو دل سہم گیا ہے۔ خوشی کیسی“ فرخ بولے۔

”کیوں؟“

”خدا ہی خیر کرے۔۔۔۔۔ ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔“

”یہ تو ہو گا ہی۔“

”فانی حضور! ہنسی آن اور وقار کی خاطر جلا بھی بن سکتی ہیں۔ انہوں نے تو کچھ اور

سنا رکھا ہے۔“

”ہوں۔“



سب کچھ متفکر سے منظر آنے لگے۔

شاید سلسلہ گفتگو طوالت کہیں چلتا۔ لیکن وقفے کی کھنٹی ہو چکی تھی۔ سب کیبن کی طرف مڑے۔

”میرا تو جی نہیں چاہ رہا۔۔۔ واپس گھر چلیں۔“ نعیم نے کہا۔

”نہیں“ فرید نے جواب دیا۔

”وہ نہیں آئیں گے“ شاہد بولے۔

”کیوں؟“ سمیرا نے جلدی سے پوچھا۔

”ان کا پروگرام کچھ اور تھا۔“ شاہد ہنس کر بولے۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے روکا۔ لیکن وہ یہ اشارہ سمجھے نہیں۔

”کیسا پروگرام؟“ سمیرا بیتابی سے بولی۔

شاہد شاید وضاحت کر دیتے۔ لیکن اس نے بڑھ کر ان کی کمر میں ٹھوکا دیا۔ بتیاں بچھ گئیں۔ اندھیرے میں اس نے شاہد کا کان مروڑ کر یہ وضاحت کرنے کی کوشش روک دی۔

باقی سارا وقت کسی کا دل فلم دیکھنے میں نہیں لگا۔ کھسر پھسر ہوتی رہی۔ سمیرا نے بہت کان دھرے۔ لیکن پلے کچھ نہ پڑا۔

اس کی الجھن یہ قراری بن گئی۔ بار بار دل کو سمجھایا۔ خود ہی دل کو تسلیاں دیں۔

صاعقہ اور ریحان کو ازل وابد کے سرے مان کر سوچا۔ دو مخالف راستے خیال کیا۔ لیکن ہر تسلی پر دل بیٹھتا ہی گیا۔

شاہد کی بات سے تو دوسو سے کچھ تشویشناک ہو گئے تھے۔

واپسی پر سبھی باتیں کر رہے تھے۔

لیکن

وہ خاموش تھی۔ گھر پہنچنے تک طبیعت اچھی خاصی خراب ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھی ریحان کی رہائش گاہ کی طرف گئی۔

ملازم سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک نہیں آئے۔

وہ صاعقہ کے کمرے کی طرف گئی۔

آیا سے پوچھا۔

لیکن صاعقہ بھی ابھی تک نہ آئی تھی۔

اس کی بے قراری بڑھتی گئی۔ معاملہ سوچ کی حدود سے باہر تھا۔ لیکن دل اس واقعے کی سنجیدگی کی گواہی دے رہا تھا۔

ریحان، صاعقہ بار بار دونوں نام اس کے ذہن میں تکرار ہو رہے تھے۔

ریحان کو وہ اپنا بہت کچھ مان چکی تھی۔ گو کبھی ان کی طرف سے اظہار محبت کی طرف قدم نہیں اٹھایا گیا تھا۔ تاہم وہ ان کی دلچسپی سے بے بہرہ نہ تھی اور پھر گھر والوں کے خیال سے بھی تو آگاہ تھی۔ دادی نے جو کچھ سوچا تھا، اس کی بھٹک بھی تو کانوں میں پڑ چکی تھی۔

شام کے دھندلے گہرے ہو چکے تھے۔ وہ بیتابی کے عالم میں بیرونی برآمدے میں ٹھہل رہی تھی۔ وہ ان دونوں کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

کافی دیر ٹھہلنے کے بعد اس نے تھک کر ستون کا سہارا لیا۔ اس کی نظریں الحمراء کے گیٹ پر لگی تھیں۔

خاصہ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جب ریحان کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی گھر بہت سے سمیرا کو اپنا دم گھٹینا محسوس ہوا۔ جلدی سے وہ برآمدے کے ستونوں کے ساتھ لپٹی ہوئی سیلوں کی اوٹ میں ہو گئی۔

ریحان گاڑی پورچ کی طرف لائے۔ تیز روشنی میں ریحان کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر سمیرا کا دل ہی تو ٹوٹ گیا۔

اور

جب انھوں نے ہاتھ کے سہارے سے صاعقہ کو گاڑی سے باہر آنے میں مدد دی تو اس کا دل تو چلتے چلتے جیسے تھم ہی گیا۔

ریحان نے جھک کر اس کے کان میں جالے کیا کہا۔

وہ کھرا کر ایک طرف کو ہٹی۔ اور پھر شرما کر بھگی۔ سامنے والے دروازے میں داخل ہوئے وقت ایک بار بڑی اداسے مڑ کر ریحان کو دیکھا۔ پھر اندھ غائب ہو گئی۔

سمیرا کی جیسے کسی نے ساری قوت سلب کر لی۔ وہ سیلوں کی آڑ میں کسی بے جان بت کی طرح کھڑی تھی۔ ریحان کا ڈیرہ دھڑک رہا تھا۔



سمیرا نے رات جیسے انکاروں پر لوٹتے ہوئے کافی - صاعقہ اور ریحان کی انوکھی  
محبت کا انکشاف ہی دل جلا دینے کو کیا کم تھا - اس پر صاعقہ کا انداز قیامت تھا - رات  
کھانے کے کمرے میں جاتے وقت برآمدے میں اس کا صاعقہ سے سامنا ہو گیا تھا -  
زہر بھرے طنز سے اس نے پوچھا تھا ”کونسی فلم دیکھی آج؟“

لیکن جو اباً صاعقہ نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ کس شان استغناء سے وہ اسے منظر انداز کرتی کھانے کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

سمیرا کے زخموں پر یہ تک پاشی ----- رات اس نے تلملواتے ہوئے گزار دی  
وہ اس شعلے کی طرح بھڑک اٹھی جس کی ہر لپک میں کسی کا خرم من جلا دینے کی بے قناری ہو۔  
رات بھر بے قناری سے کروٹیں بدھنے کے بعد وہ معمول سے کچھ پہلے ہی بستر سے اٹھ  
پڑھی۔

دل گہرا رہا تھا۔ روح میں جلن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ جان سے زیادہ اسے  
صاف عقیدہ پر غصہ آ رہا تھا۔ اس ذلیل اور منحوس لڑکی کی جسارت پر وہ زہریلی ناگن کی طرح بل  
کھا رہی تھی۔

اس نے اپنا کھاؤن پہنا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائ نے اس کے چہتے ذہن کو سکون دیا۔ لیکن اس کی سوچ سے وہی آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ ستون سے ٹیک لگا کر وہ کافی دیر کھڑی رہی۔ ہر گزرنے والا لمحہ اسے صاعقہ سے متاثر کر رہا تھا۔ استغاثی آگ بجھ چکی تھی۔

وہ یونہی گھومتی پھرتی رہی ۔ بیقرار ۔۔۔۔۔ بے چین ۔۔۔۔۔ وہ کافی دور  
بھل گئی ۔ دریا کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ۔

سورج ابھر رہا تھا۔ دریا کی سطح پر سنہری کرنوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ سمیرا اس حسین منظر کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے کھوس گئی۔

دریا کی روپ پہلی لہروں پر اک مہلابی کشتی بڑی روانی سے بہی چلی جا رہی تھی۔ سمیرا کی محویت اس کشتی کو دیکھ کر ٹوٹ گئی۔

سمیرا غور سے کستی کی طرف دیکھنے لگی۔ اتنی دور سے کسی کو شناخت کرنا تو ممکن نہ تھا۔ لیکن اس کا دل بے طرح دھڑک دھڑک کر آگہی دینے لگا کہ یہ صاعقہ اور ریحان کے سوا اور کوئی نہیں۔ لڑکی کا فیروزی آنچل ہوا سے بہا بہا کر لڑکے کے کندھے سے گزرتا تھا۔ سمیرا نے درخت سے ٹیک لگا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے جیسے یہ منظر دیکھنے کی تاب نہ لاتی ہو۔

کستی ایک روانی کے ساتھ بھی چلی جا رہی تھی۔ سمیرا نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔ کستی کو حسرت سے دیکھتے ہوئے اس نے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کوئی اور بھی تو سکتا ہے۔ اسد اور گلرخ کیوں نہیں ہو سکتے۔ انھیں تو کستی کی سیر کا رون ہے۔ طفل تسلیوں سے وہ اپنے دل کو بہلانے لگی۔

کستی درختوں کے جھنڈ کے پیچھے روپوش ہو گئی۔  
وہ کستی ہی دیر انتظار میں کھڑی رہی۔ کستی پھر منظر نہ آئی۔ مایوس ہو کر وہ وہاں  
بٹنی اور آہستہ آہستہ اس جگہ جا پہنچی۔ جہاں محل کے سائیکلو کی تفریحی کشتیاں  
ٹی رہتی ہیں۔

بوڑھا نگہبان چارپائی پر بیٹھا حقہ کڑکڑا رہا تھا۔ سمیرا کو دیکھتے ہی موہنا اٹھ کھڑی

”کشتی کھول دوں سرکار؟“ اس نے انکساریہ ہلچے میں پوچھا۔  
 ”نہیں“ سمیرا نے سوچ میں کھوئے ہوئے غفی میں سر ہلادیا۔  
 بوڑھا کسی استفسار کا منتظر رہا۔

میرا اے دریا کی سمت نظر دوڑائی۔ کستی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ تجس  
بلکہ بہ ستور اکسار ہا تھا۔ آخر اس نے پوچھ ہی لیا "کلبلی کستی میں کون سیر کے لیے گیا

بوڑھا نگہ بیان خاموش تھا۔ سمیرا نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ بوڑھے نے لاعلمی کا  
جواب دیا۔ جب درمیان اور صاعقہ گئے تھے۔ بوڑھا اپنی کوٹھڑی میں تھا۔  
”شاید اسد میاں گئے ہوں۔ اکثر وہی اس سے سیر کے لیے کستی لے جاتے ہیں“



لیکن جانے اندر سے کونسی آواز اٹھ رہی تھی جو بوڑھے کے ان الفاظ کو بھٹلا رہی تھی۔ سمیرا کے چہرے سے بے اطمینانی جھلک رہی تھی۔ وہ محل کی طرف جانے کی بجائے دریا کی سمت مڑ گئی۔

کنارے کے ساتھ درختوں کے گھنے جھنڈ میں وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کشتی میں کون ہے۔ انتظار جان لیوا ہی سہی۔۔۔۔۔ لیکن وہ اس کوفت سے دوچار ہونے کے لیے تیار تھی۔ اپنے زخم خوردہ جذبات تسکین جو چاہتے تھے۔

وہ سامنے دریا کی سطح پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

اک منقرئی قہقہے نے اسے چونکا دیا۔ اس نے جلدی سے دیکھا۔ کلابی کشتی کنارے کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی۔ وہ درختوں کی اوٹ میں نہ ہوتی تو شاید رحمان کی نظر اس پر پڑ ہی جاتی۔ دھڑکتے دل سے اس نے پھر کشتی کی طرف دیکھا۔ وہ پتھر کے ساتھ ساتھ ہو کر گزر رہی تھی۔ صاعقہ کا چہرہ بھاش تھا۔ جانے اس نے کس بات پر قہقہہ لگایا تھا۔

کشتی گزر گئی۔ سمیرا کا دم سینے میں رکنے لگا۔ وہ وہیں بیٹھی کشتی کو دیکھتی رہی۔ کچھ ہی دور کشتی ایک ہموار جگہ پر کنارے سے جا لگی۔ پہلے رحمان اترے۔

اور

پھر

ہاتھ کا سپہارا دے کر انہوں نے صاعقہ کو اتارا۔ صاعقہ ان کے بازو پر چکیلی شاخ کی طرح جھول گئی۔

اور

سمیرا نے گہرا کر آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ قوت برداشت کہاں تک ساتھ دیتی۔ کچھ دیر وہ بے سہارا ناؤ کی طرح ڈولتے جذبات کی کش مکش میں مبتلا رہی۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ اور اس طرف دیکھا جس طرف رحمان کے بازو پر صاعقہ چکیلی شاخ کی طرح جھول گئی تھی۔

رحمان کشتی کا سر درخت سے باندھنے کے لیے کھینچ رہے تھے اور صاعقہ انہیں

باندھنے میں مدد دے رہی تھی۔

چند لمحوں بعد دونوں وہاں سے جانے کے لیے مڑے۔ شاید بشارت چلتے ہوئے مخمور و شادماں وہاں سے درختوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ سمیرا انہیں حسرت سے دیکھتی رہی۔

اور

اس کے سینے میں ناکامی کی آگ کا دھواں اٹھتا رہا۔ وہ اس شکست خوردہ پہاڑی کی طرح منظر آ رہی تھی۔ جس کے اعصاب پر شکست تجھنچھلپٹ اور افسردگی بن کر ہمار جاتی ہے۔

ناشتے کی میز پر جب سمیرا پہنچی تو رحمان کی عدم موجودگی پر وادی بڑی برہم ہو رہی تھی۔

”یہ بھی کوئی وقت ہے سونے کا۔ اس عمر میں اتنی سستی کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ یا تو ناشتے کے وقت آئے گا ہی نہیں۔ یا اتنی دیر سے پہنچے گا کہ سب انتظار دیکھ دیکھ کے تھک چکے ہوں۔ نیند نہ ہوتی نشہ ہو گیا۔ ہوش ہی نہیں آتا۔ آج بچی دیکھ لو۔ جناب ابھی تک سو رہے ہوں گے۔“

سو کہاں رہے ہیں دادی حضور“ سمیرا دادی کے سامنے ہی تو بیٹھی تھی۔ موقع ہاتھ ہی زہرا لکھنے کو تیار ہو گئی۔

”سو نہیں رہا تو ناشتہ کے لیے آیا نہیں؟“

کشتی کی سیر کی تھکن اتار رہے ہوں گے۔“ سمیرا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اندر مغلظروں سے اس نے صاعقہ کی طرف دیکھا۔ کاتنا بے اختیار اس کے کالپتے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا۔ اسد نے سمیرا کی بات سنی اور پھر صاعقہ کی طرف دیکھا۔ فق ہڑلارزستے ہاتھ، سفید ہونٹ۔۔۔ حاضر و ماضی سے کام لے کر انہوں نے فوراً سن بانو کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ باتوں میں یوں الجھایا کہ وہ اور کوئی بات سمیرا سے کر ہی نہ سکیں۔

ورنہ

کوئی عجب نہ تھا کہ سمیرا اسی وقت کوئی ایسی بات اگل دیتی جو رحمان و صاعقہ کے تعلقات کو مشتہر کرنے کو کافی ہوتی۔۔۔ اور وادی کا خطاب بد بختی کی مہر بن کر



صاعقہ کی تہقید پر اسی وقت حجت ہو جاتا۔

صاعقہ سبھی ہوئی میز پر بیٹھی رہی۔ سمیرا کی بات اور بات کرنے کے طریق سے وہ سمجھ گئی تھی کہ اس نے رحمان اور اسے کستی میں جاتے دیکھ لیا ہے وہ پہچانی تو رحمان کی کل کی جسارت سے سبھی ہوئی تھی۔ اس پر یہ انکشاف۔۔۔ خوف اس کے سراپا پر چھائیوں نہ جاتا۔

سمیرا صاعقہ کی طرف دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اس کی دگرگوں حالت اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔۔۔ مسرور تھی کہ اس نے صاعقہ پر واضح کر تو دیا کہ وہ انہیں کستی کی سیر کرتے دیکھ چکی ہے اور یہ دیکھ لینا ہی ان کے حق میں قیامت بن سکتا ہے۔ ان کے خوابوں کو اک لمحہ میں بے تعبیر بنا سکتا ہے۔

میز سے اٹھتے وقت صاعقہ و سمیرا کی ہکھلیں ملیں۔ سمیرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

جس میں ناکامی کی راکھ بھی تھی۔ اور استقام کی آغ بھی۔

صاعقہ اس مسکراہٹ سے بے طرح سہم گئی۔

○

(۳۷)

محل کی بالکنی میں فوزیہ کھڑی تھی۔ وہ باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہکھلیں شوق اور دلچسپی کی غماز تھیں۔

کسی کام کی غرض سے ادھر سے گزر ہوا تھا۔ محاذ اچانک نیچے باغ کی طرف گئی اور اس کی ہو کر رہ گئی۔ وہ جالی دار کٹہرے کو پکڑے دلچسپی سے نیچے دیکھنے لگی۔

پچھلے پہر کی دھوپ کے لائبے سائے خوبصورتی سے گھاس پر پڑ رہے تھے۔

اوپر اونچے درخت۔۔۔ پھیلی پھیلی سیلیں۔۔۔ رہا رنگ پھولوں سے

ہلکی ہوئی روشیں۔ مرمیس فواروں سے پھوٹتی ہوئی پھوار۔۔۔ پہر کے لائبے

سائوں والی دھوپ میں دست باغبان سے نکلا ہوا باغ بڑا دلفریب دکھائی دے رہا تھا۔

فوزیہ کو باغ کی مہکتی فضا نے متوجہ کیا تھا۔ نہ فواروں کی دلکش اور مترنم پھوار

نے۔ اس کی توجہ کا مرکز دور درختوں کے عقب میں دوڑتے ہوئے لڑکی اور لڑکا

نے۔ رحمان کو تو اس نے دور ہی سے پہچان لیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اسی براؤن سوٹ میں

اس کے پاس ہی تو بیٹھے تھے۔

اور

لڑکی؟

سرنگیں آنچلوں والی لڑکی اس نے سمیرا سمجھ لی تھی۔

جوانی کے معصوم کھیل کو وہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ لڑکی آگے آگے بھاگ

رہی تھی اور لڑکا اسے پکڑنے کو لپک رہا تھا۔

رحمان کے ہاتھ میں آنچل کا سرا آگیا۔ فوزیہ زیر لب مسکرا دی۔ وہ کسی

الہستہ ہنسنے کے تحت وہاں سے بٹنے کو تھی کہ:

”ای! پشت سے سمیرا کی آواز پر وہ چونک گئی۔ ایک دم ہلٹ کر اس کی طرف







”گیاباں ہے سمیرا۔۔۔ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔ تمہاری بات کی کچھ سمجھ ہی نہ آئی۔  
صاعقہ تھی ریحان کے ساتھ۔۔۔ یہ کیا قصہ ہے؟“  
وہ پیار سے بیٹی کو بہلاتی پھسلاتی رہی۔ سمیرا سسکتی رہی۔ یہی طریق تھا  
جس سے ماں پر وہ اپنی ناکامی ظاہر کر سکتی تھی۔  
ماں کا دل کٹا جا رہا تھا۔

”یہ سب ہوا کیونکر۔۔۔ ریحان تو اس کے سائے سے بدکتے تھے۔ سب سے  
زیادہ نفرت انہیں ہی تھی اس سے۔۔۔ قصہ کیا ہے؟“  
بڑی دیر کے بعد سمیرا آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔۔۔ ماں بیقرار تھی۔  
سمیرا نے موقع غنیمت جانا۔ داوی سے تو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔ ماں سے  
سب کچھ کہہ دیا۔

ریحان اور صاعقہ کی جتنی ملاقاتیں علم میں تھیں۔ بڑھا چڑھا کر بیان کیں۔

فوزیہ بت بنی بیٹھی تھی۔

سمیرا تکیے پر گر گئی۔ وہ سسکنے لگی۔

فوزیہ گنگ سی اسے دیکھنے لگی۔۔۔ اس کا شعور لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب  
گیا۔ برسوں پہلے کچھ اس کیفیت سے وہ بھی دوچار ہوئی تھی۔ ظاہر اور ناجی کی رنگین  
ملاقاتوں کا حال جب اسے معلوم ہوا تو وہ بھی یونہی سسک سسک کر روئی تھی۔  
وہ سمیرا کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔ اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سمیرا  
نہیں وہ خود سسک رہی ہے۔ ناکامی کی آگ میں جل رہی ہے۔

کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی؟ اس کے ذہن میں یہ سوال اٹھا۔

بے چین ہو کر وہ اپنی بیٹی پر جھک گئی۔ اسے پیار کیا۔ تسلیاں دیں وہ بیٹی  
کو بہلا پھسلارہی تھی اور اس کا ذہن زہریلی گیسوں کا سا اثر قبول کر رہا تھا۔ سسکتا ہوا  
ماضی منقروں کے سامنے آ رہا تھا۔

ناجی ذہن میں تھرک رہی تھی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے ناجی مسکرا رہی ہو۔۔۔ اس کی اپنی ناکامی پر  
مسکرا رہی ہو۔ اس کی شکست پر ہنس رہی ہو۔  
فوزیہ نے گھبرا کر سمیرا کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی سسک رہی تھی۔

فوزیہ کا کلیجہ شق ہوئے کو تھا۔

ناجی

ناجی نے اسے شکست دی۔

اور

اب

ناجی کی بیٹی اس کی بیٹی کو شکست دے رہی ہے۔۔۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ ایسا کبھی نہ ہونے دے گی۔ وہ اپنی مرحوم  
بہن کا بھی ناجی کی بیٹی سے انتقام لے گی۔ سمیرا کی جھولی مسرتوں سے بھر دے گی۔  
صاعقہ کی بہاروں کو ویران کر دے گی۔  
فوزیہ رات بھر نہ سو سکی۔

اس کا ماضی وقت کی دھول تلے دبا پڑا تھا۔ لیکن آج سمیرا کے آنسوؤں سے یہ  
دھول اک لمحہ میں دھل گئی۔ ماضی کے خدو خال واضح ہو گئے۔ فوزیہ کے لیے ہر چہچہ  
نہا ہو گئی۔

ماضی حال کی صورت میں پھر پلٹ آیا تھا۔

ناجی کی بیٹی اس کی بچی کو سرنگوں کرے۔ اس احساس سے ہی اس کا جوش  
وقت فوقانک حد کو چھوئے لگا تھا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے سارے ماحول میں ناجی کے مسخرانہ قہقہوں  
کا گونج ہے۔ وہ پاگل سی ہوا تھی۔

رات بھر وہ زہریلی ناگن کی طرح بل کھاتی رہی۔ اس کے سینے میں آگ سلگتی  
رہی۔ برسوں پہلے کی خونچکاں داستانیں سر اٹھانے لگیں۔

سمیرا کے دل کا درد اسے اپنے درد کا عکس دکھائی دینے لگا۔

وہ اپنی ناکامی سہہ گزری تھی۔ لیکن اپنی بچی کی مسرتوں کے جنازے دیکھنے کی  
گنجائش کہاں تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ صاعقہ کے خوابوں کو چکنا چور کر  
سکی۔ وہ ناجی کی بیٹی سے انتقام لے گی۔ بھرپور انتقام۔ اپنا انتقام۔ اپنی بیٹی کا  
انتقام۔ صاعقہ کو پھل کر رکھ دے گی۔

اس عمل کے لیے اسے خون کی ہولی بھی کھیلنا پڑی تو دریغ نہ کرے گی۔ المراء کی  
بہن سے ایڈٹ بچانا پڑی تو وہ پٹو کے گی نہیں۔



فوزیہ کمرے سے نکل رہی تھی۔

اور

صاعقہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

دونوں کی ٹکڑ ہوتے پچی۔ فوزیہ کے ہاتھ میں کچھ کپڑے تھے۔ وہ کمرے۔

صاعقہ جلدی سے اٹھانے کو جھکی۔

”چربی آگئی۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہوش میں رہا کرو۔ دماغ ٹھکانے پر لے آؤں گی۔۔۔ بہت کچھ سمجھنے لگی ہوا ہے آپ کو۔“

شکر کے کسی کلمے کی بجائے صاعقہ کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے فوزیہ برس پڑی ”مجھے کیا پتہ تھا۔۔۔ چچی جان۔۔۔ آپ اندر سے آرہی ہیں“ ہنکارتے ہوئے صاعقہ صرف استہای کہہ سکی۔

”ہاں ہاں۔ تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا۔ سب کچھ اپنے آپ ہو جاتا ہے۔ بڑی معصوم بنتی ہو۔۔۔ تمہارے سب کچھ توت میں جاتی ہوں“ خشمگین ہنکاپوں سے کھورتے ہوئے فوزیہ بولی ”سنبھل کر رہو۔ ورنہ۔۔۔؟“

فوزیہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

اور

صاعقہ وہیں بہت کی طرح کھڑی رہ گئی۔ فوزیہ نے کبھی اس سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا اپنی ہوش میں اس نے کبھی اس سے التفات نہیں پایا تھا۔ لیکن آج۔۔۔ آج۔۔۔ تو اس کے تیور ہی اور تھے۔۔۔ آنکھوں میں آگ تھی۔ اور یہ آگ وہ الفاظ کی صورت میں اس پر برس رہی تھی۔

رات بھی اس نے یہ آگ فوزیہ کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ کھانے کی میز پر وہ بار بار اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ صاعقہ کا دل سہم سہم گیا تھا۔ ساری

رات وہ ان نظروں سے خوف کھاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ فوزیہ کی ان نظروں کا مطلب کیا ہے۔

سمجھ تو وہ رات ہی گئی تھی۔ لیکن اب اس ٹکڑ کے معمولی سے واقعے نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ صاعقہ کے لیے اس واقعے سے یہ اخذ کرنا مشکل نہ رہا تھا کہ فوزیہ اس کی محبت کے راز سے واقف ہو چکی تھی۔

فوزیہ جیسی کینہ پرور عورت کے ہاتھ میں استہا بڑا راز آجانے سے جو قیامت جنم لے سکتی ہے۔ صاعقہ اس کے خیال ہی سے اپنی جان ہوا ہوتے محسوس کرنے لگی۔ سیر اور ریحان کی نسبت ٹھہرائی جانے والی تھی۔ یہ اڑتی اڑتی خبر اس کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ لیکن ریحان کی محبت کا سیلاب ہر بات کو بہا لے گیا تھا۔ وہ حقائق کی دنیا سے دور ہو گئی تھی۔ اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔

صاعقہ کا دماغ گھوم رہا تھا۔ اور بے ہنگم سی سوچیں اسے نڈھال کیے جا رہی تھیں۔ ریحان پر اعتماد سہی۔

ان کی محبت میں استحکام سہی۔

پھر بھی وہ جانتی تھی کہ داوی کا آہنی اور اٹل فیصلہ اپنی جگہ رہے گا اور فوزیہ اپنی ٹیٹ کے لیے اس پر مظالم ڈھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گی۔

اپنی محبت کے حسرت ناک انجام کا سوچ کر وہ تڑپ گئی۔ افسردگی اور مایوسی کی لہر ہمارے اس کی ساری ہستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اپنی تقدیر کی ہولناکیوں کا تصور ذہن میں لہراتا رہا۔

اور

وہ

ریحان کے حسین وعدوں اور آیا کی خوش گوار تسلیوں کے باوجود کسی اچھے انجام کی توقع نہ رہی۔

ہر طلوع ہونے والا دن اس کی مایوسیوں میں اضافے کا باعث بنتا گیا، ڈر خوف اس کی ہستی کا سردار بن چوڑ لیا۔ اس کی حالت اس انسان کی سی تھی۔ جو توپ کے گولے کھاتا ہو۔ اور کسی بھی لمحہ توپ سے ٹپکنے والا بارود اس کی ہستی کو ریزہ ریزہ کر سکتا



فوزیہ کی شکایں دن بدن خوفناک ہوتی جا رہی تھیں۔ معمولی باتوں پر بڑے بڑے طغیانیے مچنے لگتا تھا۔

اس دن آیا کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ صاعقہ صبح ہی سے اس کے پاس بیٹھی تھی۔ وس بچے کے قرب تکلیف بڑھ گئی۔ صاعقہ ڈاکٹر کو فون کرنے کے لیے جلدی سے گئی۔

راستہ مختصر کرنے کے لیے وہ درمیانی کمروں میں سے ہوتی ہوئی ٹیلیفون کرنے جا رہی تھی۔ بائیں کمرے میں فوزیہ اور سعدیہ بیٹھی تھیں۔

صاعقہ دونوں کو دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی۔ جلدی سے کمرے سے نکل جانا چاہا۔ ”بڑی جلدی میں ہو؟“ سعدیہ نے یوں نہی کہہ دیا۔

”ملاقات کا وقت ٹھکرا جا رہا ہو گا۔“ فوزیہ نے طنز کیا۔

اور صاعقہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی ہو۔ کرسی کی پشت کا سہارا لے کر وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

”کیسی ملاقات“ سعدیہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”یہ اسی سے پوچھ لو“ فوزیہ نے تیر چھوڑا۔

”کیا معاملہ ہے۔“ اب سعدیہ سنجیدہ تھی۔

صاعقہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں سے پسینہ چھوٹ گیا۔ سارا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ جانے کے لیے وہ کرسی سے ہٹی اور کمرے سے نکل گئی۔ نکلتے ہوئے اس نے فوزیہ کے زہر آلود جملے سن ضرور لیے۔

”کم ظرف سے اچھائی کی توقع فضول ہوتی ہے۔ کس ماں کی بیٹی ہے۔ ماں نے عشق لڑایا تھا۔ بیٹی کیونکر پیچھے رہتی۔“

وہ کچھ اور نہ سن سکی لیکن جو سن لیا تھا، وہی استیاء تھا کہ اُس کا وجود اسے ہمارے کا متحمل نہ تھا۔

برآمدے میں رکھی ہوئی کرسی پر وہ گر سی گئی۔ سارا ماحول گھوم رہا تھا۔ توپ کے دہانے سے آگ برسنے کا وقت اب آیا تھا۔ صاعقہ کے جو اس جواب دیے جا رہے تھے۔

جانے کتنی دیر وہ وہیں پڑی رہی۔

خادمہ اسے ڈھونڈتے ہوئے ادھر آ پہنچی۔ آیا نے اسے بلا بھیجا تھا۔ بشکل حواس مجتمع کر کے وہ اٹھی۔ ڈاکٹر کو فون کیا۔

اور

آیا کے کمرے کی طرف چل دی۔

اس دن وہ بڑی دیر تک آیا کے سینے پر سر رکھے روتی رہی۔ بیمار آیا اس کی اس حرکت کو اپنے ساتھ بے پناہ محبت سے تعبیر کر رہی تھی۔ لیکن اس کی تسلیوں و تحفوں سے صبر کے ٹوٹے بند جوڑے نہ جاسکے۔

اسی شام سعدیہ کی کنیز خاص اس کے کمرے میں آئی۔

سرکار آپ کو بلا رہی ہیں۔“

کنیز کا یہ جملہ کسی ہم کی طرح اس کے حواس پر گرا۔ بے حس و حرکت وہ کنیز کا نہ دیکھنے لگی۔

کنیز نے دوبارہ اور دوبارہ اپنے جملے کی وضاحت کی۔

اور

جب وہ سعدیہ کے کمرے میں لرزتے دل اور کانپتے وجود کو لیے داخل ہوئی۔ مدینہ ہند کے اسے ساکت نظروں سے دیکھتی رہی۔

صاعقہ نے اسے دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی یہ قرار شعلہ سعدیہ کے قلب میں مقبذ ہو۔

”میں تمہارے اور ریحان کے تعلقات کے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔ تم سے کچھ پوچھنے کی گنجائش ہے نہ ضرورت۔ صرف استا کہنے کے لیے تمہیں بلایا گیا کہ تمہاری ماں اس خاندان کے وقار و عزت کو سرنگوں کر چکی ہے۔ اب تم اسی منزل پر چل نکلی ہو۔۔۔ لیکن ابھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ ایک بار پھر وہی طوفان اٹھ کھڑا ہو جس کے اثرات اب تک ہمارے خاندان پر شدید ہیں معلوم نہیں تو یہ بھی بتائے دیتی ہوں کہ ریحان و سمیرا کی نسبت تمہارے کا نام ہو چکا ہے۔۔۔ میرے بیٹے کے راستے سے ہٹ جاؤ۔۔۔ ورنہ۔۔۔ شاید تم اس انجام کا تصور بھی نہ کر سکو۔ بس جاؤ۔۔۔ صرف استا ہی



کہہ دینا کافی ہے کہ تم اپنے آپ کو بھولو نہیں۔“

صاعقہ اس منہ لیل پر کٹ کر رہ گئی۔ ندامت سے اس کا سر جھکا جا رہا تھا، سارے بدن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ بے بسی آنسو بن کر آنکھوں میں امنڈ آئے۔۔۔

لیکن جذبہ ترحم کس دل میں تھا۔ سعدیہ ان آنسوؤں کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر کر بولی۔

”تم ان آنسوؤں سے ہمدردی جیتنے کی توقع نہ رکھو۔۔۔ میں نے جو کہنا تھا کہہ چکی۔ یہ بھی میری شرافت سمجھو جو تمہیں بلا کر معاملے کی نزاکت سمجھا رہی ہوں۔ میں چاہتی تو سارا واقعہ ابھی تمہاری دادی کے گوش گزار بھی کر سکتی تھی۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو۔۔۔ سمجھیں۔۔۔ جاؤ۔۔۔ سوچ سمجھ سے کام لو۔ چاند کو چھونے کی کوشش فضول ہوتی ہے۔“

صاعقہ کسی زندہ لاش کی طرح اس کے کمرے سے نکلی۔ اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔ کیا کرے۔ ایک طرف بلکتی ہوئی محبت تھی۔ اور دوسری طرف چنگھاڑتا ہوا خاندانی وقار ریحان سے علیحدگی کا تصور بھی اس کے لیے مشکل تھا۔

لیکن

انہیں پالینا بھی درس حالات ناممکن تھا۔

○

صاعقہ برآمدے کے درمیں کھڑی تھی۔ رات کے اندھیرے گہرے ہو رہے تھے۔ بادیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ کم صم سی کھڑی سوچوں کے دھارے پر بہہ رہی تھی۔ آج شام سعدیہ کے کہنے ہوئے الفاظ اب تک اس کے کانوں میں سیال آگ کی طرح ٹپک رہے تھے۔

وہ واقعی اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ اس خاندان میں اپنی حیثیت کو بھول گئی تھی۔ بکری بھی تو اپنے بال و پر کی کمزوری کو بھول کر چاند کی طرف اڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ دیوانی!

وہ بھی دیوانی تھی۔ چکوری کی طرح۔

بڑبڑاتی کش مکش نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں سوچ گئی تھیں۔ صبح سے شام تک کتنے لرزہ خیز واقعات کا تصادم ہو چکا تھا۔ سبھی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بے بال و پر پرندہ کی طرح صرف پھر پھر رہی تھی اس سبب سے ہکاؤ کی کوئی حدیر اس کے ذہن میں نہ آ رہی تھی۔

صاعقہ! ریحان کی آواز پر وہ چونکی۔

”تمنا انتظار کروایا تم نے۔ بارہ درمی میں آئی کیوں نہیں؟“

صاعقہ خاموش رہی۔ اندھیرے میں ریحان اس کے تاثرات نہ دیکھ سکے۔

”آؤ!“

لیکن صاعقہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔

”سو رہی ہو کیا؟“ ریحان نے اس کا کندھا ہلایا۔

”ریحان۔۔۔“ وہ خوف زدہ سی آواز میں بولی۔

”کیس؟“



”میں۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی آواز سے گھبراہٹ عیاں تھی۔  
 ”کیا بات ہے۔۔۔ آؤنا ادھر چلیں۔۔۔ بارہ دری کی طرف۔۔۔“  
 ”ہمیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی۔“  
 ”کیوں؟“

”کوئی دیکھ لے گا ریحان۔“

”تمہارے حواس پر تو یہی بھوت سوار رہے گا۔۔۔ پگلی۔۔۔ چلو آؤ۔“ ریحان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لیکن

اس نے گھبرا کر جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے صاعقہ۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔“

”تو چلتی کیوں نہیں؟“

”کوئی دیکھ لے گا۔“

”کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہو گا“ جھڈا کر ریحان بولے۔

”طوفان بھوت پڑے گا۔“ وہ سہمی ہوئی بڑبڑائی۔

”پھوٹے دو“ وہ لہر وائی سے بولے۔

ریحان نے جیب سے سکریٹ کیس نکالا۔ ہونٹوں میں سکریٹ دبایا اور پھر سکریٹ کیس واپس رکھتے ہوئے لائٹر سے سکریٹ سلکایا۔

لائٹر کے دم بھر کے خفیف سے شعلے میں انہوں نے صاعقہ کا چہرہ دیکھا۔ انہیں کچھ شبہ سا ہوا۔ دو بارہ لائٹر جلایا۔

صاعقہ نے منہ پھیر لیا۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے صاعقہ؟“

لیکن وہ کچھ نہ بولی۔

ریحان آگے بڑھے۔ اس کا ہاتھ تھام کر برآمدے کی سیڑھیاں اترنے لگے۔ وہ مسخور سی ان کے ساتھ چل دی۔ اسے ہوش تک نہ رہا کہ ابھی ابھی وہ کن ملبوس سوچوں میں ڈوبی تھی۔

ریحان بازو کے سہارے اسے باغ میں لے کر چل رہے تھے۔ صاعقہ خاموش تھی۔  
 ریحان کا دم اس خاموشی سے الجھنے لگا۔  
 ”صاعقی! انہوں نے چلتے چلتے کہا۔“  
 ”جی!“

”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”اپنے آپ کو بھول گئی ہوں۔“

”پیار میں اپنے آپ کو بھول جانا تو بہت بڑی سعادت ہے۔“ ریحان اپنی لے میں کہہ گئے۔ صاعقہ چپ رہی۔

دونوں بارہ دری تک آ پہنچے۔ صاعقہ سیر سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئی۔

”اپنے آپ کو بھول گئی ہو“ ریحان بشاش لہجے میں بولے۔ ”اس احترام کے باوجود ہر شان رہتی ہو۔۔۔ بتاؤ گی نہیں کس بات سے پریشان ہو۔“

وہ ایک پاؤں سیر سیڑھی پر رکھ کر کھٹنے پر بازو رکھ کر صاعقہ کی طرف جھک گئے۔  
 ”صاعقہ!“

”جی“

”چپ کیوں ہو۔۔۔ تمہاری خاموشی میری تشویش بن رہی ہے۔ کئی دنوں سے تمہیں ہر شان دیکھ رہا ہوں۔ ہر وقت سہمی رہتی ہو۔۔۔ تمہارے ”کچھ نہیں“ کہنے کے باوجود تمہاری سراسیمگی چھپی نہیں رہتی۔۔۔“

صاعقہ سر جھکانے اپنی مخروطی انگلیاں عالم اضطراب میں مستغرق رہی۔ ریحان دیکھ رہے تھے۔ چند دنوں سے صاعقہ سہمی سہمی ڈری ڈری رہتی ہے، اس میں پہلی سی ٹوٹی ہے نہ طراری۔۔۔ وہ انداز سپردگی بھی نہیں۔ ناز و ادا بھی نہیں۔۔۔ کبھی کبھی تو انہیں وہم سا ہونے لگتا کہ وہ ان سے خوش نہیں ہے۔

صاعقہ سر جھکانے بیٹھ گئی رہی۔ ریحان کے دل میں پھر وہی وہم جو کبھی کبھی انہیں ہر شان کیا کرتا تھا سراٹھانے لگا۔  
 ”صاعقہ!“

”ہوں“

”کبھی کبھی عجیب سا وہم آنے لگتا ہے۔“



”جی“

”سوچتا ہوں، تم شاید مجھ سے خوش نہیں ہو۔۔۔؟“

”ریحان!“ صاعقہ پارے کی طرح مضطرب ہو گئی۔

”صاعقہ یہ حقیقت ہوئی۔ تو۔۔ تو۔۔ میں نہیں جانتا میں کیا کروں گا۔۔“

”ریحان۔۔۔ بخدا کسی غلط فہمی میں نہ پڑیے۔“

ریحان اس کے قریب بیٹھ گئے۔ صاعقہ نے ان کے ہاتھ پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ

دیا۔ ریحان نے اس کا ٹھنڈا کپکپاتا ہوا ہاتھ دبایا۔ آہستگی سے بولے۔ ”مجھے معاف کر دو

صاعقہ۔ یونہی تمہیں چپ چاپ دیکھ کر یہ بے ہنگم سا وہم دل میں آجاتا تھا۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے ریحان“ وہ بے تابانی سے بولے۔

”کس سے؟“

صاعقہ پھر چپ تھی۔

”گھر والوں سے؟“ ریحان نے پوچھا۔

”نہیں“

ریحان حیران ہو کر بولے۔ ”پھر کس سے ڈرتی ہو؟“

”اپنی تقدیر سے۔“

اس کے رقت انگیز لہجے سے ریحان سر تاپا کانپ گئے۔ اسے بہلانے کو ہنس کر اس کا

ہاتھ دبا کر بولے ”پشیمانی!“

”سچ کہتی ہوں ریحان۔۔ میں ازلی بد نصیب ہوں۔ اپنی تقدیر سے ڈر لگتا ہے۔۔“

تقدیر نے کبھی مجھ سے اچھا۔۔۔“

”تمہاری تقدیر میں ہوں صاعقی۔۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ یہ فضول سے وسوسے دل

سے نکال دو۔ میرے الفاظ پر یقین نہیں تمہیں۔۔ کتنی بار سمجھا چکا ہوں۔۔۔“

صاعقہ کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے گرتی دیوار کو سنبھالا دے دیا ہو۔ بڑی

عقیدت سے اس نے ریحان کے ہاتھ پر اپنا سر ٹکا دیا۔

اور

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹی ہوئی مالا کے موتیوں کی طرح گرنے لگے۔

آنسوؤں کی فنی محسوس کر کے ریحان سڑپ اٹھے۔ اپنا ہاتھ جلدی سے کھینچ کر اس نے

صاعقہ کا چہرہ اونچا کیا۔ اور گھمبیر آواز میں بولے ”یہ آنسو تمہیں زیب نہیں دیتے۔ صاعقہ

تہداری رگوں میں تو ان بہادر والدین کا خون ہے جو اپنے پیار کی خاطر والدین خاندان اور

زندگی تک سے ٹکرا گئے تھے۔

”میں کیا کروں ریحان۔۔ چاروں سمت محاذ ہی محاذ ہیں۔ میں کس کس کا مقابلہ

کروں۔۔؟“ صاعقہ بے بسی کے عالم میں روتے ہوئے کہہ گئی۔ ریحان ان الفاظ کو سن

کر مہبوت سے رہ گئے۔

اور

پھر

اس سے ان چاروں سمت محاذوں کی تفصیل پوچھنے لگے۔

صاعقہ ڈری، سہمی، کترائی لیکن ریحان کے پُر اصرار استفسار پر اس نے سب کچھ کہہ

دیا۔

سمیرا کے متعلق۔۔ فوزیہ کے بارے میں اور آج شام سعدیہ چچی کی کہی ہوئی باتوں

کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

ریحان کی حالت قابل دید تھی۔ گھر والوں کا سلوک صاعقہ سے اچھا نہیں تھا۔ وہ یہ

باتیں تھے۔ لیکن بہیمیت ان حدود کو چھو جائے گی، انہیں گمان نہ تھا۔ غصے سے ان کا

رنگ سرخ ہو گیا۔ سینے میں رنج و غم سے اُبال اٹھنے لگے۔ صاعقہ رو رہی تھی۔

لیکن وہ اس طرح مشتعل تھے کہ صاعقہ کے بہتے آنسو پونچھنے کا بھی خیال نہ رہا۔

نسکین کا کوئی کلمہ بھی نہ کہہ سکے۔

”زندگی نے مجھے کبھی کچھ نہیں دیا ریحان“ صاعقہ سسکتے ہوئے بولی۔ ”اب کچھ دیا

ہے تو یہ لوگ چھین لیں گے۔۔ میں۔۔ میں۔۔ کیا کروں ریحان۔۔ میں کیا

کروں۔۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ بے اختیار

رہنے لگی۔

”پس ہو جاؤ“ وہ انتہائی افسردہ آواز میں بولے۔

صاعقہ رونے لگی۔

”تم نے اتنے دکھ اکیلے ہی جمیل لیے۔ مجھے پہلے سب کچھ کیوں نہ بتلایا!“ بڑی سوگوار

آواز



آواز میں ریحان کہہ رہے تھے۔

پندرہ لمحے خاموشی رہی۔ صاعقہ کی دہلی دہلی سسکیاں اسی خاموشی میں ابھرتی رہیں۔

ریحان بڑی ہی سنجیدگی سے کچھ سوچ رہے تھے۔

”صاعقہ آنسو پونچھ ڈالو۔ ہمیں حالات کے مقابلہ کے لیے تیار ہونا ہے۔ یوں رورو کر زندگی ابھرنے لگے۔“

ریحان نے تسلی دی۔ بہلایا۔ حسین وعدوں کی یاد دہانی کرائی:

”میں جانتا ہوں۔ طوفان اٹھے گا۔ لیکن اس سے ٹکرانے کا میں پورا عزم کر چکا ہوں۔ حالات کو میری مرضی کے مطابق ڈھلانا ہو گا۔ میں اس طوفان کا ہر لمحہ انتظار کرتا ہوں۔ یاد رہے اس دن میں تمہیں سینما کی بجائے گھاٹی کی طرف لے گیا تھا۔ میں نے یہ قدم دانستہ اٹھایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہمارے پیار کا راز مشہور ہو جائے۔ بات بڑوں تک پہنچ جائے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ افتاد کیلئے تم پر ہی پڑے گی۔ خیر اب کچھ نہیں بگڑا۔ میں کل ہی دادی حضور سے خود ساری بات کہہ دوں گا۔“

”ریحان۔۔۔“ صاعقہ کانپ گئی۔ ”نہیں۔۔۔ ان سے کچھ نہ کہنیے گا۔“

”اور تاخیر برداشت نہیں کی جاسکتی۔“

ریحان کے لہجے میں اتنی گونج تھی کہ صاعقہ مرعوب ہو گئی۔

”ہمارا قصور کیا ہے صاعقہ۔۔۔ کہ یوں سسک سسک کر مرجائیں۔ پیار کرنا جرم تو نہیں۔ خاندان حائل کیوں ہوتا ہے۔۔۔ ہم اپنی زندگی کی راہیں خود استوار کر دیں گے۔ کسی کا ناجائز دخل برداشت نہیں کیا جاسکتا۔“

ریحان اس کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔

”مایوسی گناہ ہے صاعقی۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم اس طرح مایوس نہیں ہو گی۔ اگر پھر بھی تم نے افسردگی و مایوسی کو اپنے اوپر مسلط کیا تو میں سمجھوں گا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں۔۔۔“

صاعقہ نے ریحان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس لمس نے ریحان پر آشکار کر دیا کہ اسے ان پر کتنا اعتماد تھا۔

ریحان اسے طوفانوں سے لڑنے اور حوادث سے ٹکرانے پر آمادہ کرتے رہے۔ صاعقہ سہمی ہوئی ان کی باتیں سنتی رہی۔

رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ کچھ کلی تار بخیوں کا چاند فلک کے کسی کنارے پر نمودار ہو رہا تھا۔ دونوں وہاں سے اٹھے۔

شانہ بشانہ چلتے دونوں برآمدے کی طرف آئے۔ دور پورق میں چلنے والی برقی روشنی کا عکس اندھیروں کو چاٹ رہا تھا۔

ریحان نے ہلکی ہلکی روشنی میں صاعقہ کا بھیگا ہوا چہرہ دیکھا ”ہزدل!“ وہ مسکرائے۔ صاعقہ نے سر جھکالیا۔

ریحان نے آہستگی سے اس کا ہاتھ دبایا ”آج تمہارے وہم و ترزدگی آخری رات ہے۔ صبح میں دادی حضور سے۔۔۔!“

”صبح نہیں ریحان“

”کیوں؟“

”پرسوں آپ کی سالگرہ ہے نا“

”تو کیا ہوا؟“

”یہ تقریب تو بخیریت گزر جائے دیں۔“



دادی کا چہیتا اور منظور نظر ہونے کی وجہ سے ریحان کی سالگرہ بڑے متحرک و احتشام سے منائی جاتی تھی۔ جشن کا سارا انتظام دادی اپنی نگرانی میں کروا تیں۔ یہ دن عید سے بھی زیادہ خوشی و مسرت سے منایا جاتا تھا۔

اس دن ناشتے کے بعد پورا کنبہ دادی حسن بانو کے کمرے میں جمع ہوتا۔ یہ اک رسم سی بن گئی تھی۔ دادی حسن بانو نے ایک سونے کی زنجیر بنوا رکھی تھی۔ ہر سالگرہ کے دن وہ اس زنجیر میں سفید قیمتی موتی پرویا کرتیں۔ پھر وہ زنجیر واپس اسی نمکلیں صندوق میں رکھ دی جاتی۔

اس کے بعد وہ سب سے پہلے اپنا تحفہ ریحان کو دیتیں۔ ریحان مسند پر ان کے قریب بیٹھی ہوتے۔ سارا کنبہ ان پر ٹوٹا پڑتا۔ تحفہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ تعریفیں ہوتیں۔ مبارک سلامت کا شور اٹھتا چھینا چھپٹی ہوتی۔ اس دن دادی کے رعب و دبدبے میں خاصی فحک آجاتی۔ شور و غل اور چھینا چھپٹی جسے عام حالات میں وہ کبھی گوارا نہ کر سکتیں، منظر انداز کر دیتیں۔

پھر سارا دن خوشی و مسرت کے بھرپور جذبات سے گزارا جاتا۔ رات جشن میں رشتہ دار، دوست اجنباب شرکت کرتے اور رنگ و بو کی یہ محفل آدھی رات تک جاری رہتی۔ زنجیر میں موتی پر ونا حسن بانو کی رسم تھی۔ جسے ہر سال بڑے اہتمام سے پلورا کرتیں۔ موتیوں کی یہ مالا وہ ریحان کی منگنی پر اس کی دلہن کو دینے والی تھیں۔ کتنی یادگار چیز تھی یہ۔

صافقت بچپن میں اس رسم کو بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ گوا سے بہت کم اس موقع پر قریب پہنچنے دیا جاتا تھا۔ منگوس جو تھی وہ۔۔۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح اس موقع پر وہاں پہنچ جاتی۔ کڑکیوں اور دروازوں میں چھپ چھپ کر یہ رسم دیکھا کرتی۔

جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اور نظروں کی یہ داری کو سمجھنا شروع کیا تھا، وہ اناست کترا جایا کرتی تھی۔ ہاں انجم پہنچو بھی اکثر اسے بلا کر لے جاتیں۔ صافقت ان کے مجبور کرنے پر کبھی چلی جاتی تو مسند کے قریب جانے کی بجائے پر سے ہٹ کر یہ کھڑ سی کھڑی رہتی۔

معمول کے بعد آج بھی ناشتہ کے بعد سب زرق برق لباسوں میں دادی حسن بانو کی نشست گاہ کی طرف جا رہے تھے۔

مسند پر دادی سفید لباس میں اک ٹکنت کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ان کے بوڑھے پہرے پر سرخی جھلک رہی تھی۔ چہرہ خوشی سے قہقہہ رہا تھا۔ دونوں بیٹے اچھر اور فخر دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سعدیہ اور فوزیہ، حسن آرا اور انجم آرا ابھی مسند پر بیٹھی تھیں۔

ریحان دادی کے دائیں ہاتھ بیٹھی تھے۔ وہ کسی افسانوی شہزادے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ کتنی وجاہت تھی ان میں۔۔۔ سعدیہ تو بیٹے کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھ رہی تھی۔ مبادا منظر لگ جائے۔ یہی حال دادی کا تھا۔ دل ہی دل میں بلائیں لے رہی تھیں۔

آج ریحان نے صافقت سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس رسم کے موقع پر ضرور دادی کے کمرے میں آئے گی۔ اس نے بہ منت ریحان سے معذرت چاہی تھی لیکن وہ کسی صورت ماتے کو تیار نہ تھے۔ صافقت کو وعدہ کرنا پڑا تھا۔

اور

اسی وعدے کو نبھانے کے لیے وہ وحوش کے دل اور من ہوتے ہاتھ پاؤں لیے دادی کی نشست گاہ کی طرف جا رہی تھی۔

دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی جانے کہاں سے فوزیہ آن دھکی گئی۔ صافقت انہماک سے چلی جا رہی ہو۔۔۔ معلوم نہیں ہے سالگرہ کی رسم ہونے والی ہے۔ یا منگوس و جود کہیں دور وفاق کرو۔۔۔ کسی زعم میں نہ رہنا۔

اور

صافقت کا دل چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں سوجائے۔ اتنی بے لیل۔۔۔ آہ۔۔۔ وہ ریحان سے کیا ہوا وعدہ، رسول کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔



ریحان اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بار بار سر اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ مسند کے گرد کھائی  
جمع سا جمع ہو گیا تھا۔ چھوٹے بڑے خوش تھے چمک چمک رک باتیں کر رہے تھے۔  
”سمیرا نہیں آئی؟“ حسن آواز نے فوزیہ سے پوچھا۔

فوزیہ نے گرد و پیش دیکھا۔ سمیرا نہیں آئی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازے میں  
کھڑی کنیز کو بلا کر بھیجا۔ لیکن کنیز واپس آگئی۔ سمیرا نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا  
تھا۔

فوزیہ کے کلبجے میں فشر سا چہرہ گیا۔ سمیرا کے نہ آنے کی وجہ اسے معلوم ہی تھی۔  
ریحان کا انتظار شدت اختیار کر گیا۔ تقریباً سبھی لوگ آپہنچے تھے۔ وہ بے قرار سے  
منظر آنے لگے۔

دادی حسن بانو نے مخملیں صند وچھی اپنے سامنے رکھی۔

”ٹھہریئے دادی حضور!“ ریحان اٹھتے ہوئے بولے۔  
”کیوں؟“

”میں ابھی آیا۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“

”بس ابھی آیا۔“ کہتے ہوئے وہ ہشکل جگہ بنا کر محل گئے۔

صاعقہ کی عہد شکنی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

وہ سیدھے اس کے کمرے میں پہنچے۔

وہ کھڑکی میں کھڑی باہر غلاموں میں گھور رہی تھی۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو  
رہی تھیں۔ پلکیں اب تک بھیگی ہوئی تھیں۔ رخساروں کی سرخی بھی نم آلود تھی۔

ریحان نے اسے دیکھا۔ صاعقہ آہٹ پر پلٹ کر کھڑی ہو گئی۔

ان کا غصہ ہوا ہو گیا۔ وہ اس کے سامنے آ گئے۔

چپ چاپ اسے دیکھتے رہ گئے۔

صاعقہ نے سر جھکا لیا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ امنتہ نے والے آنسوؤں کو آنکھوں ہی  
میں پانی جانے کی کوشش کرنے لگی۔

”آج بھی رو رہی ہو۔“ بڑی افسردہ سی آواز میں ریحان نے کہا۔

اور

صاعقہ کا ہیمانہ صبر چھلک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور روتے  
ہوئے بولی۔ ”میری تقدیر میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔۔۔ مجھے کچھ نہیں  
ہاں سکتا۔۔۔ آنسو۔۔۔ ہی ملیں گے۔“  
”صاعقی“ ریحان نے اس کے ہاتھ زبردستی چہرے سے ہٹا دیئے سنجیدگی سے

پوچھا۔

”کچھ کچھ ہوا؟“  
”کچھ نہیں۔ مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں نہیں جاؤں گی وہاں۔۔۔“  
”کیوں نہیں جاؤ گی۔ کسی نے کچھ کہا؟“

صاعقہ روتی رہی۔

”بتاتی کیوں نہیں۔ کس نے کچھ کہا۔“ ریحان غصے سے جھٹکا کر بولے۔  
صاعقہ نے آنکھیں پونچھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ ریحان کے چہرے کے تناؤ اور  
آنکھوں کی خشمناک سرخی دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس موقع پر وہ کسی طوفان  
کو امنڈنے نہ دیکھنا چاہتی تھی۔

”کس نے کہا کچھ؟“ ریحان نے سختی سے پوچھا۔

”کسی نے بھی نہیں“ وہ دانستہ جھوٹ بول گئی۔

”پھر ہوا کیا ہے۔؟“

”کچھ بھی نہیں“

”رو کیوں رہی ہو؟“

”دل بھرا آیا تھا۔ اب نہیں روؤں گی۔“ وہ مسکرا دی۔  
”چلو پھرا“

”نہیں۔۔۔ نہیں ریحان آپ جانیے۔ چھوٹی سی بات کے لیے ضد نہ کیجئے۔“  
ریحان کے بار بار اصرار کرنے پر وہ لجاجت سے انکار کرتی رہی۔

”تو جانے کی وجہ کیا ہے۔ صرف استیاء بتا دو۔“

”کوئی راز نہیں۔“

”پھر بھی۔“

”آپ جانتے ہیں ریحان۔۔۔ ایسے موقعوں پر میری شمولیت منحوس سمجھی جاتی



ہے۔ "بالآخر وہ کہہ اٹھی۔

"صاعقہ! ریحان غصے سے کانپنے پھینچے۔

صاعقہ مشکل مسکرائی۔

"یہ احساس تمہارے ذہن سے کب مٹے گا صاعقہ۔ میری اتھک کوششیں بھی ناکام رہیں۔" جانے وہ کیا کیا کہتے رہے لیکن صاعقہ ان کے ساتھ جانے کی حامی نہ بھر سکی۔

فوزیہ کا خوفناک لہجہ کانوں میں زہر کھول رہا تھا۔ اگر وہ اب وہاں چلی گئی تو کیا عجب سب کے سامنے وہ اس کی تذلیل کرے۔ بھرے مجمعے سے دھکے دے کر نکال دے۔ وہ اپنی تحقیر سے ڈرتی تھی۔

"صرف استابتا دو تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے؟"

صاعقہ نے صبح کا سارا واقعہ انہیں کہہ سنایا۔ احساس کے نازک آبگینوں پر طنز کا یہ ہتھراؤ۔ ریحان خامے مشتعل نظر آنے لگے۔

ریحان کی حالت قابل دید تھی۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ کمرے میں بے تابانہ ٹپکتے ہوئے وہ فوزیہ کے متعلق سوچ رہے تھے۔ اس وقت وہ ان کے سامنے ہوتی تو شاید وہ کوئی گستاخانہ حرکت کر بیٹھتے۔

صاعقہ کھڑکی کی طرف پھر مڑ گئی۔ خلاؤں میں گھورتے ہوئے وہ سوچوں میں ڈوب گئی۔

"صاعقی! ریحان کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"آؤ! وہ سنگین آواز میں بولے۔

"نہیں" وہ گھبرا گئی۔

ریحان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہینچا۔ "آؤ دیر ہو رہی ہے۔"

صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ کتنی سنگین سی سنجیدگی ان پر مسلط تھی۔ وہ ڈر گئی۔

کوئی ہنگامہ پھوٹ پڑے گا۔ اس کے دل سے صد اٹھی۔

اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ پرے ہٹ گئی۔

"تم نہیں جانو گی؟" سنگین سنجیدگی میں افسردگی کا عنصر بھی تھا۔

"بھری محفل میں ذلیل ہونے کی مجھ میں ہمت نہیں ریحان" وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے

کہہ کر بولی۔

"میرے ہوتے ہوئے بھی ایسا ہو گا؟"

"بہرپلی نظریں تو ہوں گی۔"

"تم کسی کی پروا نہ کرو۔"

"نہیں ریحان۔"

"میری خاطر سب کچھ گوارا کر لینا۔"

"فدہ نہ کیجئے ریحان۔۔۔ رسم ہو جانے دیں۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔"

"رسم تمہارے بغیر کیسے ہوگی۔"

"جیسے ہمیشہ ہوتی ہے۔"

"ہمیشہ اور اب میں کوئی فرق نہیں؟"

"آپ کے سوا شاید کسی کے لیے بھی نہیں۔"

"تمہیں میری خوشی دیکھنا ہے صاعقہ۔۔۔"

گھبرا کر صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ لیکن ڈر و خوف اس پر اس طرح مسلط تھا کہ وہ جانی نہ بھر سکی۔

ریحان چند لمحے منتظر رہے۔ لیکن صاعقہ جانے کو تیار نہ ہوئی۔ ریحان کی کشادہ جبین ہاتھوں سی آگئیں۔ بے مہری کا کلمہ ٹکاپوں سے چھلکا۔ بغیر کچھ کہے وہ پلٹے۔

صاعقہ انہیں یوں جاتے دیکھ کر یہ قرار ہو گئی، دوڑ کر ان کے سامنے آگئی، بے ساختہ لٹکے ہاتھ پکڑ لیے۔  
"آپ فضا ہو گئے؟"

"میں نہ جانتا تھا کہ میری خوشی کی خاطر تم اتنی سی بات گوارا نہ کر سکو گی۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بغیر بولے اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

صاعقہ سڑپ اٹھی۔ ریحان کو اداس دیکھنا اس کے بس میں نہ رہا۔ اپنی ذلت کا خوف اور روائی کا ڈر سب کچھ بھول گئی۔  
ان کی طرف دیکھا۔

ابھر سر جھکا کر بولی۔ "چلیے میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں، میں کسی سے نہیں



دُروں کی۔ فوزیہ چچی بھرے مجھے دھکے دے کر بھی ذلیل کر دیں تو میں آپ کی  
خاطر گوارا کر لوں گی۔“

”صاعقی“ ریحان نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔  
اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اور

ہوٹوں پر مسکراہٹ۔

دھوپ چھاؤں کا حسین امتزاج اس کے چہرے کو کتنا پُرکشش بنا رہا تھا۔  
ریحان قدرے جھکے اور مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشی  
کی ”اب آئی ہو راہِ راست پر۔“  
صاعقہ آنکھیں بند کیے مسکرا دی۔

۵۱

ریحان کی خوشنودی کی خاطر صاعقہ انکے ساتھ چل تو دی، خوف اب تک اس کے  
داس پر مسلط تھا۔ دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسنیٹ ہو  
رہی تھی۔ ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ نظریں بہک رہی تھیں۔ کتنے بڑے خطرے سے  
نگرانے جا رہی تھی وہ۔۔۔ آج وہ طوفانِ پھوٹ پڑے گا جس کی ہلاکت آفرینی روزِ روشن  
کی طرح عیاں تھی۔

لیکن

اس کے باوجود ریحان کے ساتھ جا رہی تھی۔ دادی کے کمرے کی طرف بڑھ رہی  
تھی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی معمول کسی عامل سے لگا ہندھا چلا جا رہا ہو۔  
کمرے میں خاصہ شور تھا۔ حسن بانو کی مسند گھر کے افراد سے گھری ہوئی تھی۔ کوئی  
بٹھا تھا۔ کوئی کھڑا تھا۔ کوئی کسی کے سہارے جھکا تھا۔ شانے سے شانہ ٹکرا رہا تھا۔ ہر  
کوئی مسند کے قریب تر ہونے کی کوشش میں تھا۔

خوب خوب باتیں ہو رہی تھیں۔ دادی حسن بانو آج دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔  
صاعقہ کمرے میں داخل ہوتے ہی سہم کر ایک طرف گھڑی ہو گئی۔ ریحان نے  
آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔  
وہ تعمیلِ حکم کے لیے آگے بڑھی۔

”جگہ دو اسد!“ ریحان نے سٹول پر بیٹھے ہوئے اسد کی کمر میں ٹھوکا دیا۔ اسد نے  
گردن موڑ کر دیکھا۔

ریحان نے صاعقہ کی طرف اشارہ کر کے جگہ خالی کرنے کو کہا۔

اسد ریحان کی جسارت پر گنگ سے رہ گئے۔  
”کیا منہ دیکھ رہے ہو۔ جگہ دو۔۔۔ کچھ آداب بھی سیکھو!“ ریحان مسکرا کر بولے۔ اسد



اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آؤ مٹھو صاعقہ“ انہوں نے سٹول قدرے آگے کو دھکیلا۔

صاعقہ سحر زدہ سی بیٹھ گئی۔ وہ کسی مجسمے کی طرح پتھرائی پتھرائی سی تھی۔

ریحان آگے بڑھ کر مسند پر دادی کے دائیں ہاتھ جا بیٹھی۔

صاعقہ کی طرف دیکھ کر وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا دیئے۔ لیکن صاعقہ تو جیسے وہاں تھی ہی نہیں۔ مسکراہٹ کا کیا اثر لیتی۔ اس کا تورسوائی کے خوف سے دم ٹھکا جا رہا تھا۔ فوزیہ کی طرف صرف ایک دفعہ دیکھا تھا۔ اُف ان نظروں میں جہنمی شعلوں کی لپک تھی۔ کس طرح یقین دہانی سے اس نے پہلو بدلا تھا۔ مجسمہ برق منظر آ رہی تھی۔ جو کسی کا آشیانہ بحسم کرنے کے لیے مچل رہی ہو۔

اس کے علاوہ کسی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی۔ نظروں کے تیر وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دم ہوا ہو رہا تھا۔ چہرہ فق تھا اور ہونٹ تک سفید پڑ چکے تھے۔

دادی حسن بانو کی اللہ جانے اس پر منظر ہی نہ پڑی تھی یا مزاج میں ہی آج اتنی لچک آ گئی تھی کہ اس کی موجودگی کو گوارا کر لیا تھا۔ فخر چچا اسے دیکھ کر خوش ضرور ہوئے۔ جانے انہوں نے کیا کہا۔ صاعقہ کے کانوں میں صرف سائیں سائیں کا شور تھا۔ ان کی بات سمجھ نہ سکی۔ نہ ہی کچھ جواب دیا۔

ریحان دادی سے چو نچلے کر رہے تھے۔ سب کی توجہ انہی کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ ”اب نکالے بھی زنجیر“ ریحان نے غمگین صند و پچی دادی کے سامنے رکھ دی۔ دادی نے بسم اللہ پڑھ کر صند و پچی کو کھولا۔ زیر لب دعائیہ کلمے کہتے ہوئے سرخ غمگینی ڈبی میں پڑی ہوئی زنجیر نکالی۔

”واہ واہ سبحان اللہ“ کا شور بلند ہوا۔ سفید موتی طلائی زنجیر میں بڑی آب و تاب سے چمک رہے تھے۔

”کتنے ہوئے ہیں؟“ ریحان نے مالا ہاتھ میں لے لی۔

”چھ بیس ہوں گے“ کسی نے کہا۔

”ہاں۔۔۔ آج ماشاء اللہ تم ستائیس سال کے ہو گئے۔ یہ ستائیسواں موتی ہے۔“ دادی نے پھر اللہ کا نام لے کر ڈبی سے سفید موتی اٹھایا۔ دعائیں پڑھتے ہوئے زنجیر

میں پرو دیا۔

مبارک سلامت کا شور سا اٹھا۔ دادی اماں، پھوپھیوں، چچی سب نے ریحان کے بالوں پر شفقت آمیز بوسے دیتے ہوئے مبارک کہی۔

باپ نے اٹھتے ہوئے انکے کندھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وراثتی عمر کی دعا دی۔ ان کی تقلید میں فخر چچا بھی اٹھے۔ ریحان تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فخر چچا نے بڑی محبت سے انہیں لپٹا لیا۔

دعائیں دی جا رہی تھیں۔ کنیز چاندی کا تحال لے آئی۔ حسن بانو نے کئی طلائی سکے اس میں ڈال دیئے۔ ریحان کا صدقہ اتارا گیا۔ حاضرین نے حسب استطاعت اس میں نقدی ڈالی۔ کنیز جھک جھک کر سلام کرتے ہوئے تحال واپس لے گئی۔

صاعقہ کے کانوں سے شور ٹکرا ضرور رہا تھا۔ لیکن سمجھنے کی قوت جواب دہتی جا رہی تھی۔ اظہر اور فخر دونوں بھائی اس رسم کے بعد اٹھ کر چلے گئے۔ نئی پودان کے سامنے ذرا جھک محسوس کرتی تھی۔ آج اس مبارک موقع پر انہیں کچھ تو آزادی ملنا چاہیے تھی۔

ان کے جاتے ہی محفل میں کچھ حرکت سی آگئی۔ قہقہے خوش گوار ہو گئے۔ باتوں میں بے تکلفی سی آگئی۔

”یہ موتی کب پروئے جائیں گے دادی حضور“ ریحان نے دانستہ شوخی سے پوچھا۔ ”اگے جس مقصد کے لیے یہ مالا بن رہی تھی، وہ جاتے تھے۔ ہر سالگرہ پر ہی تو دادی امانت کرتی تھیں۔“

”یہ ستائیسواں موتی ہے۔“ دادی نے بڑے فخر سے کہا۔

”بہت ہو گئے اب“ ریحان جلدی سے بولے۔

”اتے بے صبر نہ بنو“ پھوپھی حسن آرانے ان کے سر پر ہار سے پچت لگائی۔

”کیوں دادی حضور۔۔۔ بہت لمبی ہو گئی مالا۔ اب اسے بند کر دیں۔“

”فیال تو میرا بھی یہی ہے۔ یہ آخری موتی ہو گا۔“

”پھر کیا کریں گی اس مالا کو؟“

”تمہاری منگنی پر تمہاری دلہن کو دوں گی۔“

”واہ واہ۔۔۔“

”یہ آخری موتی ہے نا“ اسد نے پوچھا۔



”انشاء اللہ“ حسن بانو نے جواب دیا۔

”اللہ مبارک کرے۔“

”آمین“

کافی دیر یوں ہی باتیں ہوتی رہیں۔

”دادی حضور!“

”ہوں“

”اجازت ہو تو اس زنجیر کو آج کرہ لگا دوں۔“

”کیوں؟“ دادی نے پوچھا۔

”اتنی جلدی کس بات کی ہے؟“ انجم پھوپھی ہنس کر بولیں۔

”جو کام ختم ہو جائے وہی اچھا۔ آپ کا کیا ہے، ستائیس کی جگہ اٹھائیس موقی پسند

کرہیں اور اپنا حساب کتاب اگلے سال میں جا پڑے۔“

”اے ہے۔۔۔ پچھلے۔۔۔ انشاء اللہ اسی سال یہ کام ہو جائیگا۔“

”اسی سال“ فرخ نے منہ بنایا ”سال بہت ہے نانی حضور۔“

”کیا پاگل ہیں یہ لڑکے۔۔۔ سال سے مراد بارہ مہینے تو نہیں۔“

”پھر؟“

”بہی دو تین ماہ بعد۔۔۔ عید کے چاند انشاء اللہ منگنی کی رسم ادا کر دی جائے گی۔“

”واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔“ ریحان کے ہم جلیسوں نے نعرے لگائے۔

”تو پھر لائیے میں زنجیر کو آج ہی کرہ لگا دوں۔“

”ابھی کیا ضرورت ہے۔“

”نہیں دادی حضور۔۔۔ فوری ضرورت ہے۔“

سب ہنس دئے۔ ریحان نے کھینچا تانی کی۔ ماں نے ڈانٹا بھی لیکن دادی نے ٹوک

دیا اور ہنستے ہوئے زنجیر ریحان کے ہاتھ میں دے دی۔

”لو اپنی خوشی پوری کر لو۔“

ریحان نے سرے کانڈا ڈرا سا کھینچا اور دوسرے سرے میں اٹکا کر دبا دیا۔

”یہ لیچنے والا مکمل ہو گئی۔“ انہوں نے ہاتھ قدرے اوپر اٹھایا۔

مبارک۔۔۔ مبارک کا طوفان تھا۔ تالیوں کی گونج تھی۔ خوشی و مسرت کا ہنگامہ تھا۔

”لاؤ اب“ دادی نے مالارہ خان کے ہاتھ سے لے کر منہ دھوئی میں رکھنا چاہی۔

”نہیں“

”کیوں؟“

”یہ آپ نے میری دلہن کے لیے بنائی ہے نا؟“

”ہاں تو؟“

”میں اپنی دلہن کو دے کیوں نہ دوں۔“

”ریحان“ سعدیہ نے ڈانٹا۔

”کیوں دادی حضور۔۔۔“ ریحان مسکرا کر دادی کی طرف دیکھ کر بولے ”اس کا خیر

سے ابھی کیوں نہ فارغ ہو جائیں۔“

”اتنے بیتاب کیوں ہو رہے ہو“ پھوپھی حسن آراء نے چھیڑا۔

”پچھلے ہے نا“ دادی پییار سے بولی۔ ”استا شاند ار جشن مناؤں گی اپنے بیٹے کی منگنی کا کہ

کسی نہ دیکھنا نہ سنا ہو گا۔ اس دن یہ مالا دوں گی۔۔۔ تمہاری دلہن کو۔۔۔ بچھے۔“

”نہیں دادی حضور۔۔۔“ ریحان ضد کر بیٹھی ”جشن جتنا جی چاہے شاند ار منائے لیکن

یہ مالا تو میں ابھی پہناؤں گا اپنی دلہن کو۔۔۔“

ریحان نے مالا پاتھوں میں تھام لی۔ سب ان کی ضد پر ہنس رہے تھے۔

فوزیہ البتہ خاصی پریشان نظر آرہی تھی۔ کچھ بھی حال سعدیہ کا تھا۔

اور

صاعقہ کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی۔ دل رک جانے کی حد تک دھڑک اٹھا تھا۔

”پہناؤ گے کسے، دلہن تو یہاں ہے ہی نہیں“ پھوپھی حسن بانو نے سیرا کی حد م

وجودگی کا اشارہ کیا۔

”ہے کیوں نہیں“ ریحان نے ترچھی نظروں سے صاعقہ کو دیکھا۔

صاعقہ نے اک لمحہ کو ان کی طرف دیکھا۔ انکی آنکھوں سے پھلکتا ہوا غم دیکھ کر اس

کے اپنے رہے سبے اوسان بھی غطا ہو گئے۔ ماتھے پر پسینے کی حسی حسی بوندیں آئیں۔

ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے ہو گئے۔

”اجازت ہے دادی حضور؟“ ریحان نے پھر پوچھا۔

”لیکن دلہن کہاں ہے“ حسن آراء نے پھر خوشی سے پوچھا۔



”یہ رہی۔“ وہ اٹھے اور بڑے ڈرامائی انداز میں بڑھ کر مالا صاعقہ کے گلے میں ڈال دی۔

صاعقہ اٹھ کر بھاگ جانے کی کوشش میں تھی۔ لیکن ریحان نے پہل کی۔ مالا اس کے گلے میں ڈال دی۔  
تعب خیز سی سنسناٹ سارے کمرے میں پھیل گئی۔

اور

اس کے بعد

اک جملہ سناتا۔

جو حقیقتِ حال سے باخبر تھے۔ وہ بھی ریحان کی جسارت پر گنگ رہ گئے اور جو بے خبر تھے۔ اسے ریحان کا مذاق سمجھ کر چپ ہو گئے۔  
”یہ کیا بد تمیزی ہے ریحان“ چند لمحوں کا جملہ سناتا واوی کی آواز کی گونج سے ٹوٹ گیا۔  
”کیوں واوی حضور۔“

”مذاق حد سے بڑھ جائے تو یہ ہودگی ہوتی ہے۔“

”لیکن یہ مذاق کہاں ہے واوی حضور۔۔۔“ ریحان نے اس سنجیدگی سے کہا کہ واوی حسن بانو پلکیں جھپکا جھپکا کر انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

”ریحان۔۔۔“ اسد نے جلدی سے انہیں پکارا۔

”ہوں“ وہ مڑے اور پھر تیزی سے لپک کر آگے آئے۔ صاعقہ سٹول سے گری جا رہی تھی۔ اسد نے دونوں ہاتھوں سے اسے سنبھالا دے رکھا تھا۔

”بے ہوش ہو گئیں۔“ اسد نے آہستگی سے کہا۔

”صاعقی“ ریحان نے اس پر جھکتے ہوئے پکارا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور سارا جسم پسیٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ برف کے تودے کی طرح ٹھنڈی تھی۔

”صاعقی، صاعقی“ ریحان نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

”ہوش میں نہیں ہیں۔“ ٹینڈ اس پر جھکتے ہوئے بولی۔

”نہیں لٹاؤ۔“ فریہ قریب آکر بولے۔

”گری جا رہی ہے۔ سنبھالو تو اسے“ انجم پھو پھو بھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ریحان کے مذاق پر انہیں غصہ بھی آ رہا تھا۔ ان لوگوں کی بے حسی پر دل جل اٹھا

نمل۔

لیکن

جب ریحان نے بڑھ کر صاعقہ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور کسی کی پروا کیے بغیر کمرے سے نکل گئے تو سب کے ساتھ انجم پھو پھو بھی بھی حیرت زدہ سی ہو گئیں۔





صاعقہ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھائے ریحان دادی کی نشست گاہ سے نکل تو گئے لیکن پیچھے اک ہنگامہ چھوڑ گئے۔ ان کے مالا ڈالنے کی جسارت ہی کیا کم تھی۔ اس پر بے ہوش صاعقہ کو یوں اٹھا کر کسی کی پروا کیے بغیر چل دینا جلتی پر تیل ڈالنے کے مترادف تھا۔ دادی کے لیے یہ انکشاف نیا بھی تھا اور حیران کن بھی۔۔۔ سب کچھ اتنی جلدی اور غیر متوقع طور پر ہو گیا کہ وہ ہوکھلا سی گئیں۔

”یہ قصہ کیا ہے؟“ بڑی دیر چپ رہنے کے بعد حسن بانو نے جیسے سب سے سوال کیا۔ ”ماں کا مقام بیٹی نہ لے گی۔“ فوزیہ غصے سے بل کھا رہی تھی۔ آخر ابل پڑی۔ دادی نے پلٹ کر فوزیہ کی طرف دیکھا۔ وہ سراپا شعلہ بنی تھی۔

معاملہ منجیدہ تھا۔ دادی نے سب بچوں کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ سب آگے پیچھے سر جھکائے کمرے سے نکل گئے۔ دادی کے حضور کسی کو کسی قسم کا تبصرہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس واقعے سے سبھی متاثر نظر آتے تھے۔

کمرے میں حسن بانو اپنی دونوں بیٹیوں اور بہوؤں سمیت رہ گئیں۔ فوزیہ کی حالت قابل دید تھی۔ سعد پہ بھی پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

حسن آراء اور انجم آراء ماں کی طرح بے خبر تھیں۔ وہ کچھ حیرت زدہ سی دونوں بہنوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”یہ قصہ کیا ہے آخر۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔“ حسن بانو بولیں۔

”سمجھ میں نہ آنے والی بات ہی کونسی رہ گئی ہے۔“ فوزیہ تلخ سی آواز میں بولی۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ حسن آراء متانت سے بولیں ”لیکن۔۔۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے

بات چوٹی کیسے۔۔۔؟ ریحان تو اس کے سائے سے دور بھاگتا تھا۔“

”اسے ستانے میں پیش پیش رہتا تھا۔ اس نے تو کبھی سیدھے منہ اس سے بات نہ

کی تھی۔“ سعدیہ سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولی۔

”اب تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ میں نے کچھ جھوٹ تو نہ کہا تھا۔“ فوزیہ سعدیہ سے مخاطب تھی۔

”اسی بات کی تو حیرانگی ہے۔“ سعدیہ نے جواب دیا۔

”بڑی انہونی بات ہے۔“ حسن آراء کہہ رہی تھیں۔

”جو بھی سمجھو حقیقت تو یہ ہے کہ انہونی ہو گئی۔“ فوزیہ غصے سے بولی۔

کافی دیر اسی بات پر لے دے ہوتی رہی۔ پھر حسن بانو کے استفسار پر فوزیہ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

”بات یہاں تک بڑھ چکی ہے۔۔۔“ حسن بانو کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

”تو اور کیا۔۔۔ بات یہاں تک بڑھی نہ ہوتی تو ریحان آج آپ کے سامنے اتنی جرأت کیوں کر کرتا۔“ فوزیہ نے ان کے غصے کو چانچ کر کہا۔

سعدیہ نے ندامت سے سر جھکالیا۔ انجم آراء خاموشی سے سب کچھ سنتی اور دیکھتی رہیں۔ باتیں ہوتی رہیں۔۔۔ ریحان سے زیادہ صاعقہ کو کوسا گیا۔ جتنی بد دعائیں دی جاسکتی تھیں، دی گئیں۔ اس کی ماں کے قصے کو از سر نو عریاں کیا گیا۔

یہ سب لچھ کر چکنے کے بعد بھی دلوں کی آگ سرد نہ ہوئی۔

”مجھے تو اپنی بچی کا خیال آتا ہے۔“ فوزیہ آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی ”استیاسا منہ نکل آیا ہے اس کا۔ خواہ مخواہ نام لے لیا تھا ریحان کے ساتھ۔ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ خدا جانے اس کا کیا ہو گا۔“

”فوزیہ تم نے ساری بات ہمیں پہلے کیوں نہ بتائی۔“ حسن بانو فوزیہ کے رونے سے بڑی متاثر نظر آرہی تھیں۔

”کیا بتائی۔۔۔ متقدیر میں دیکھ ہوں تو انہیں کون بدل سکتا ہے۔ بیس برس بعد پھر اسی عمدہ دیکھنا پڑا۔“ چچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

سب سر جھکائے سوچ میں ڈوبے تھے۔

حسن بانو نے سر اٹھایا۔۔۔ بھانجی کی چچکیاں سینے میں تلاطم پیدا کر رہی تھیں۔ اس کا دکھ انہیں اپنا دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

”نہ رو فوزیہ۔۔۔ میرے ہوتے ہوئے اتنی مایوس کیوں ہو۔ میں ریحان کی تقدیر کا



فیصلہ کر چکی ہوں اور دیکھوں گی کہ یہ فیصلہ بدلنے کی کس میں مجال ہے۔ تم بچی کو تسلی دو۔ ناکہ الٹا رو کر اسے جیتے جی مار ڈالو گی۔“

”لیکن امی حضور! انجم آراء پہلی دفعہ بولیں۔“ متقدمیروں کے فیصلے سوچ سمجھ کر کرنے چاہئیں۔“

”اے ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟“ حسن بانو نے انجم کو ڈانٹ دیا۔

”حالات کا پوری طرح جائزہ لے کر کوئی فیصلہ کریں۔“

”آپ تو خوش ہیں نا؟ شروع ہی سے اس کی حمایت کرتی آئی ہیں۔“ فوزیہ نے طنزیہ کہا۔

”وہ بھی اپنا ہی خون ہے۔ حمایت کرنے میں بُرائی کیسی؟“

”آپ تو یہی چاہیں گی کہ وہ منحوس میری بچی کے سینے پر مونگ دلتی رہے۔“

”میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہو چکا۔ اسے بدلنا نہیں جاسکتا“ حسن بانو نے عزم سے کہا۔

”وہ ڈائن ہمارے ریحان ہی کے لیے تو رہ گئی ہے۔“ حسن آرا بولی۔ ”آپا آپ بھی تو غضب کرتی ہیں۔ کہاں ریحان کہاں وہ منحوس بلا۔ پیدا ہوتے ہی ابا حضور کو کھانگئی۔ خاندان پر آفتیں ہی ٹوٹ پڑیں۔“

”میں تو اس کا سایہ نہ پڑنے دوں گی اپنے بیٹے پر“ سعدیہ غرائی۔

”بیٹا تو لٹو ہے اس پر۔“ فوزیہ تنگی سے بولی ”کس طرح ہاتھوں پر اٹھا کر لے گیا۔

دادی سے بھی شرم نہ آئی۔ بڑوں کا کچھ لحاظ بھی ہونا چاہیے۔“

”سب ٹھیک کر لوں گی۔ سب ٹھیک کر لوں گی۔“ حسن بانو گردن ہلا کر کہنے لگیں۔

”میرے لڑپیارے اس نے بے جا فائدہ اٹھایا ہے لیکن نا سمجھ ہے۔ میری سختی سے پالا نہیں پڑا۔“

”سختی نے ہمیشہ کام بگاڑا ہے“ انجم آہستگی سے بولیں۔

”تمہارا کیا مطلب ہے انجم۔ اسے من مانی کرنے دوں؟“

”پیارے سمجھا دیکھئے۔ مان جائے تو اچھا ورنہ سختی نہ کیجیئے۔“

”اور اس منحوس بلا کو ہمیشہ کے لیے اس کے پلے باندھ دیں؟“ حسن آرا غرائی۔

”یہی تو مطلب ہے ان کا۔“ فوزیہ پھر رودی۔

”میرے مطلب سے کیا ہوتا ہے فوزیہ؟“ انجم کو بھی غصہ آگیا۔ دیکھنا تو ہیں لڑکی مرضی ہے۔ جبر کسی صورت میں سودمند نہ ہو گا۔“

”میری بیٹی عمر بھر بلکتی رہے۔“ فوزیہ روتے ہوئے بولی۔

”یہ ضروری نہیں۔ ابھی کونسا منگنی کا اعلان ہو گیا ہے۔“ انجم نے کھنکھرات کر لی۔

”صلح مشورہ ہی ہو رہا ہے نا۔ لڑکی کو استماتہ نہیں لینا چاہیے۔“

”یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے انجم! سعدیہ نے گد آمیز لہجے میں کہا۔

”میری بچی کو چپ ہی لگ گئی ہے۔ اور آپ کے لیے یہ اثر لینے والی بات ہی

نہیں۔“ فوزیہ بولی۔

”میں ابھی زندہ ہوں فوزیہ۔“ حسن بانو نے سنگین آواز میں کہا۔

وہ سارا دن اسی قصے کو دہراتے ہوئے گزر گیا۔ رات جشن خاصہ بد مزہ رہا۔ اہل خانہ ہی

کے مزاج درست نہیں تھے۔ مہمانوں کی آمد بھلا کہاں تک ماحول کو خوش گو رہا۔

جوں توں کر کے وہ دن گزرا۔ فوزیہ نے ہر لمحہ سانس کے اشتعال کو بھڑکایا۔ آنسوؤں

کے چھینٹے دے کر آگ پر تیل کا کام کیا۔

حسن بانو کی آن، وقار اور ساکھ پھٹکارتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے دن صبح

ہی صبح انہوں نے ریحان کو اپنی نشست گاہ میں بلا بھیجا۔

ریحان آئے۔ ان کے چہرے پر بریشانی کے آثار تھے، نہ ملاحت کے۔ طوفان سے

ٹکرائے کو تیار منظر آرہے تھے۔

حسن بانو کی مسند کے قریب آکر وہ رک گئے۔ کھڑکی کے سہارے بیٹھی حسن بانو

کے چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ سر تاپا انہیں گھورا لیکن بولنے میں پہل نہ کی۔

”آپ نے مجھے یاد فرمایا دادی حضور۔“

”ہوں“

”فرمائیے!“

”یہاں بیٹھو۔“

ریحان مسند کے کنارے پر بیٹھ گئے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ ریحان اس خاموشی سے الجھ رہے تھے۔ دو ایک بار حسن بانو کی

طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔



”ریحان“ سنجیدہ اور باوقار آواز میں دادی نے مخاطب کیا۔

”جی“ سعادت مندی سے جواب دیا گیا۔

کہنے والوں کے لہجے کا سناؤ ظاہر کر رہا تھا کہ جھکنے والے دونوں ہی نہیں ہیں۔  
”میں نے تمہیں اک خاص بات کے لیے بلایا ہے۔“

”جی“

”میں تم سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتی۔ صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تمہاری نسبت ہم  
سمیرا سے ٹھہرا چکے ہیں۔“  
”دادی حضور۔۔“

”اور تمہیں ہمارے فیصلے کا پابند ہونا پڑے گا۔“

”یہ نہیں ہو سکتا دادی حضور۔“

”یہ ہو گا۔“

آواز میں استعارے اور دبہ تھا کہ ریحان چند لمحوں کے لیے چپ ہو گئے۔

”دادی حضور۔۔“ وہ وقفے کے بعد لجاجت سے بولے۔

”میں کچھ نہیں سنوں گی۔“

”لیکن مجھے۔۔ افسوس ہے۔۔ میں آپ کے فیصلے کا پابند نہیں ہو سکتا۔“

”میں جانتی تھی تمہارا جواب یہی ہو گا۔ لیکن جذبات کی رو میں نہ ہو۔ سوچ سمجھ  
لو۔“

”سب سوچ چکا دادی حضور۔۔ میرے فیصلے میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔“

”بچہ نہ بنو۔۔ جاؤ آرام سے سوؤ۔۔ دو چار دن سوچ لو۔ پورے اطمینان سے۔۔“

”تمہیں میرے فیصلے کا پابند ہونا ہے۔ نہیں تو انجام کا خیال خود کر سکتے ہو۔“

”دادی حضور۔۔“

”جاؤ۔۔ دو چار دن سوچ لو۔ پھر جواب دینا۔۔“

ریحان نے کچھ کہنا چاہا۔

لیکن دادی نے لوک دیا۔

وہ جھکے۔ ہر منت دادی سے اپنی خواہش کا اظہار کرنے کو لیکن دادی غصے میں آ

گئیں۔  
ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئیں۔  
ریحان ہلتے ہوئے پردہ کو دیکھتے رہ گئے۔





کا معاملہ تھا۔  
بچوں کے ہاتھ کھلوانا بنانا دادی کی سراسر توہین تھی۔

اور

یہ توہین وہ مر کر گوارا نہ کر سکتی تھیں۔

گھر میں جو ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ریحان اس سے قطعاً لاپرواہ تھے۔ اپنی ناکامی کے متعلق تو انہوں نے نہ سوچنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ عزم و عقیدہ استوار آخ تھا کہ ہر کام پر منزل نظر آتی تھی۔ فکر تھی تو صرف صاعقہ کی جوان دنوں اس پھول کی طرح کھلا گئی تھی جس کی جھلسا دینے والی گرمی میں بھی آبیاری نہ ہوتی ہو۔

سارا دن اپنے کمرے میں مقید رہتی۔ چہرہ زرد ہو گیا تھا اور آنکھیں سو ج گئی تھیں۔ سہمی ہوئی خوف زدہ سی رہتی۔ ریحان اسے بہتیرا سمجھاتے، تسلیاں دیتے، ہنسائے کی کوشش کرتے۔ جھلا کر غصے بھی ہوتے، خفگی کا اظہار بھی کرتے لیکن وہ تو موت سے پہلے مری جا رہی تھی۔ ریحان کی کوششیں رائجاں جا رہی تھیں۔

دادی وضع داری پر جان دینے والی عورت تھیں۔ رعب و دبدبے سے اپنی من مانی شروع سے کرتی آئی تھیں۔ صاعقہ سے بار مان لیتیں تو ان کی وضع داری کیا ہوتی انجم بار بار سمجھا رہی تھیں۔ حسن بانو نے کئی بار ریحان کو بلا کر ڈانٹنے کا ارادہ کیا۔

”امی حضور۔۔۔ جوان لڑکا ہے۔ کوئی ایسی حرکت یا بات کہہ دے گا۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ آپ بھی جانتی ہیں۔ وہ اپنی ضد میں ہے۔ اس طرح اسے اور مشتعل کرنا اچھا نہیں۔“

حسن بانو کی سمجھ میں یہ منقطعہ آگیا۔

”میں خود اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔“

”تم کیا سمجھاؤ گی۔ جو خود اس کی حامی ہو۔“

”آپ کی خوشنودی کی خاطر اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ ورنہ یہ تو فضیلت ہے اسی حضور! مجھے تو یہ بات معیوب نظر نہیں آتی۔ صاعقہ بھی لپٹا ہی خون ہے۔“

”بس بس۔۔۔ میں کچھ نہیں سنوں گی۔۔۔ میرا فیصلہ تھرہ لکیر ہے۔“

”اگر ریحان کسی صورت اس فیصلہ کا پابند نہ ہو سکا؟“

”کیوں نہ ہو گا۔“

اپنا خاصہ ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

ریحان اور حسن بانو دونوں اپنی اپنی جگہ سنگلاخ پٹان تھے۔ دادی جھکنا جانتی تھیں نہ ریحان۔ گھر کی فضا خاصی مکدر ہو چکی تھی۔ ہر دل سہما ہوا تھا۔

انجم آرمائیں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک چکی تھیں۔ لیکن وہ بیٹی کی نصیحتوں پر کان دھرتیں یا بہو کے آنسو دیکھتیں۔ فوزیہ نے جو محاذ قائم کر رکھا تھا، اسے بھی تو دیکھنا تھا۔

دن کا چین اور رات کی نیند سب کے لیے حرام ہو گئی تھیں۔ بھٹیں ٹکراؤں میں بدل رہی تھیں۔ ریحان کے والد نے چند الفاظ میں بیٹے کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ لیکن سعدیہ کو ایک طرف اپنی عزیز بھانجی سمیرا کا خیال تھا۔ دوسری طرف یہ وہم کہ صاعقہ ازلی منحوس ہے۔ وہ کسی طور ریحان و صاعقہ کا بندھن مانتے کو تیار نہ تھیں۔

فخر چچا بھی حالات کے پیش نظر ریحان کے حامی تھے۔ گو اس زد میں اپنی بیٹی آرہی تھی۔ مہتمم شادی کے معاملہ میں جبر کے قائل نہ تھے۔ بیوی کی ٹکراؤں کے ڈر سے انہوں نے اپنا فیصلہ محفوظ ہی رکھا۔

حسن بانو ریحان کی ضد سے فکر رہی تھیں۔ ریحان جتنا اپنی بات پر اڑ رہے تھے۔ حسن بانو اپنی بات منوانے پر استنا ہی تل رہی تھیں۔

نوجوانوں کی اکثریت ریحان کی حامی تھی۔

معاملہ خاصا الجھ رہا تھا۔ ریحان کو حق پر سمجھتے ہوئے بھی سب متفکر تھے۔ دادی سے گھبراہٹ کوئی آسان بات تو نہ تھی۔ اپنے وقار ظاہری نام و نمود اور جھوٹی عزت پر وہ بیٹے کو قربان کر چکی تھیں۔ پوتے کو بھلا کیا سمجھتیں۔ ریحان یوں ضد میں نہ آتے تو شاید چھٹلی خونچکاں داستان دادی کے منظر سے گزرتے ہوئے میں مدد و معاون ہوتی لیکن یہاں تو ضد



”فرض کیجئے نہ ہو سکا تو۔۔!“

”تو۔۔“

”ایک بار بحر وہی قصہ دہرایا جائے گا۔ طاہر کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ میں تو جب بھی اسے دیکھتی ہوں، بے ساختہ طاہر یاد آجاتے ہیں۔ وہی انداز وہی ضد۔۔“ انجم

آرانے اک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔  
”طاہر کا فعل شاید مستحسن نہ ہو، لیکن ریحان کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتیں“  
”کیوں؟“

”طاہر نے اک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا جسے ہمارا خاندان قبول کرتے ہوئے ہچکچا سکتا تھا۔ لیکن صاعقہ اپنی ہی اولاد ہے۔ اپنا ہی خون ہے۔ اپنے مرحوم طاہر کی بیٹی ہے۔ خاندان اسے قبول کرنے میں ہچکچا نہیں سکتا۔ وقار نام و نمود، آن بان کیوں معترض ہوں گی۔“

”لیکن میرا فیصلہ جو ہو چکا ہے“ حسن بانو کچھ مرعوب سی منظر آنے لگیں۔  
”وہ وقت گئے امی حضور۔۔ جب تنقید یروں کے فیصلے بلا سوچے سمجھے ہو کر بھی کامیاب ہو کر تے تھے۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ ریحان صاعقہ کے بغیر۔۔“  
”جو کچھ بھی ہے میرا فیصلہ اٹل ہے۔“

انجم آرا خاموش ہو گئیں۔ لیکن انہوں نے ماں کو سمجھانے کا خیال چھوڑا نہیں۔ جس وقت بھی موقع ملتا کوشش ضرور کرتیں۔ فوزیہ نہ ہوتی تو شاید انہیں کامیابی ہو بھی جاتی۔ لیکن فوزیہ سے نپٹنا مشکل تھا۔ وہ تو جب بھی حسن بانو کے پاس بیٹھتی، رورور ہی ہانک ہوتی۔ سمیرا بھی کم حسم ہو گئی تھی۔ دادی جتنا اپنی ضد پہ اڑ رہی تھیں، وہ استغابی کامیابی کی امید لگا رہی تھیں۔

بات بڑھتی گئی۔ لڑائی جھگڑے روز کا معمول بن گئے۔ رات گئے تک یہی بحث ہوتی رہتی۔

ریحان کو باری باری سمجھی سمجھا چکے تھے۔ جو حامی تھے وہ بھی، جو مخالف تھے وہ بھی۔ سارا خاندان جو اس جھگڑے کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔

ریحان نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا تھا۔ جس پر سوچنے کی ضرورت ہوتی۔ اپنی بات

اس دن ماں کی ایما پر حسن آرانے ریحان سے اچھی خاصی بحث کی۔ صاعقہ کی فحوسٹ کے قصے کو اچھا لالا۔ اس کی ماں کے فرار کی داستان دہرائی لیکن یہ اوپچھے ہتھیار ریحان کو قاتل بنا کر سکے۔ ان کا ایک ہی جواب تھا۔

”صاعقہ جیسی بھی ہے۔ جس ماں کی بھی بیٹی ہے، مجھے منظور ہے۔“

”لیکن تمہاری دادی اماں! یہ بات گوارا نہیں کر سکتیں۔“

”میں اپنی زندگی کا مختار آپ ہوں۔ فیصلہ مجھے کرنا ہے دادی حضور کو نہیں۔۔“

”لیکن یہ بھی تو سوچو وہ ایک بات زبان سے نکال چکی ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ کتنی

بری بات ہے اور اس کا اثر براہ راست سمیرا پر بھی پڑتا ہے۔“

”قطعاً نہیں۔۔“

”یہی تو تمہاری نا سمجھی ہے۔“

”سمیرا عقلمند لڑکی ہے۔ وہ کسی ایسے شخص کے لیے وبال بننا بالکل پسند نہ کرے گی۔ جو اسے زندگی اور زندگی کی خوشیاں نہ دے سکے۔ پھوپھی جان۔۔ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی صاعقہ ہے۔ اس کے بغیر کسی اور کو اپنانے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”اس ضد کا انجام جانتے ہو!“

”مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کے بہت سے طریق آتے ہیں پھوپھی حضور۔۔“  
”دوسری سب سے بڑا راستہ ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔ میں سب کی خوشنودی چاہتا ہوں۔“

”خاک خوشنودی چاہتے ہو۔ کھر بھر کو ٹگنی کا نالچ نچا رہے ہو۔ کسی کی سنتے ہی نہیں۔۔ سمیرا میں کیا کیڑے پڑے ہیں۔۔“

”پھوپھی جان۔۔ میں اس سے آگے کچھ نہیں سنوں گا۔ میرا پہلا اور آخری فیصلہ یہی ہے۔ اس میں کسی لچک کی گنجائش نہیں۔ دادی حضور نے برضا و رغبت میری خواہش کا خیال نہ کیا تو میں۔۔ میں مجبور ہوؤں گا۔“

”نہاد مجھے کرنا ہے۔ کسی اور کو نہیں۔۔ میں اپنے اوپر زبردستی کا فیصلہ مسلط نہیں کروں گا۔“



کی کوشش کرتے رہے لیکن قابل کوئی بھی نہ ہو سکا۔  
جب ریحان کو سمجھانے بھانے کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو پالیسی کا رخ بدلا گیا۔  
صاعقہ کو ڈرایا دھمکایا جانے لگا۔ فوزیہ تو پہلے ہی اس کی جان کی میری تھی۔ اب سعدیہ اور  
حسن آراء نے بھی اس کا ناک میں دم کر دیا۔  
صاعقہ تو اپنے کمرے ہی میں مقید ہو گئی تھی۔ بہت کم سامنے آتی۔ حالات جو  
سنگین صورت اختیار کر رہے تھے، اس سے وہ بے خبر نہ تھی۔  
اس دن اپنا ناک حسن آراء اس کے کمرے میں پہنچی اور بلا تہید اس پر برسناس شروع کر  
دیا۔

”اگھ لکا کر تھاشہ دیکھ رہی ہو۔ سارے خاندان کو جنجال میں پھنسا دیا ہے۔ ماں کم  
بخت کم تھی، بیٹی اس سے بھی آگے بڑھ گئی۔ اپنے آپ کو بھول کیوں گئی ہو۔ دماغ  
عرش پہ جا پہنچا ہے۔ جو کچھ تمہاری ماں کی وجہ سے ہوا تھا، اب پھر وہی کچھ ہونے والا  
ہے۔ بھس میں اگھ لکا کر خود اگھ ہو بیٹھی ہو۔“  
وہ جانے کیا کیا کہہ کر دل کا غبار نکالتی رہی۔ صاعقہ پتھر کی طرح چپ چاپ ان کا منہ  
تکے گئی۔ وہ تو اس طرح سکتے میں آئی تھی کہ آنکھوں میں آنسو تک منجمد ہو گئے تھے۔



صاعقہ کی حالت اس مریض کی سی تھی جو چارہ گر کی اتھک کوششوں اور تسلی دلاؤں  
کے باوجود موت کو اپنے قریب تر پارہا تھا۔

فوزیہ، سعدیہ اور حسن آراء نے طعن و تشنیع سے اس کا کلیجہ پھلنی کر دیا تھا۔ وہ اب  
اتنا سمجھ گئی تھی کہ ریحان نے خود سری سے اپنی من مانی کر بھی لی تو بھی خوشیاں اسے  
اپنے دامنوں میں نہ لے سکیں گی۔ گھر بھر کا تنفر کچھ کم تو نہ تھا۔

حسن آراء طنز کے تیر برسہا کرکٹی دھمکیاں دے گئی تھی۔ صاعقہ نے رونے دھونے  
کے بعد سارے معاملے پر دجمعی سے غور کیا۔ اس کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ وہ ریحان کے  
رہتے سے ہٹ جائے گی۔ سارے خاندان کو جنجال سے نکالتے کا یہ طریقہ رہ گیا تھا۔

رات ریحان اس کے کمرے میں آئے۔ وہ اتنی دل گرفتہ، مایوس اور مضطرب نظر  
آ رہی تھی کہ ان کا دل کٹ گیا۔ انہیں صاعقہ پر غصہ بھی آیا۔ انکی تسلیوں کے باوجود وہ  
اتنی ہراساں تھی۔

اور جب اس نے رورو کر ریحان سے یہ منت کہا کہ وہ دادی کی بات مان لیں تو ریحان  
مشتعل ہو گئے۔ صاعقہ نے رورو کر اصرار کیا۔ ”سارے خاندان میں بھونچال آیا ہوا  
ہے ریحان۔ آپ دادی حضور کی بات مان لیں۔“

”صاعقہ“ ریحان نے چیخ کر کہا۔ وہ غصہ میں بھر گئے۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ صاعقہ  
کے کندھے سے جھنجھوڑتے ہوئے تیزی سے بولے ”میری ہمت بڑھانے کی بجائے مجھے  
ڈالنے پہ آمادہ کرتی ہو؟“

”اسی میں مصلحت ہے۔“ صاعقہ ان کی مجنونانہ حرکت کو منظرانہ ادا کرتے ہوئے رو  
اٹی۔

”صاعقہ“ ریحان نے بھرپور غصے سے جھنجھوڑ کر اسے پرے دھکیلا۔ ”تم میرے بغیر



شاید زندگی گزار لو لیکن میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ مشتعل سے پٹنے۔ صاعقہ دوڑ کر ان کے سامنے آگئی۔ ”ریحان ریحان۔۔“ وہ بے اختیار ہو کر رو دی۔ ریحان نے اسے بازوؤں میں تھام لیا۔

صاعقہ ان کے کندھے پر سر ٹکا کر بے اختیار سی ہو کر ہچکیاں لینے لگی۔ ریحان کا غصہ دھیماپڑ گیا۔

”مجھے بہت بڑے طوفان سے پنپنا ہے صاعقی۔ تم میری ہمت بندھاؤ۔ تمہاری مایوسی مجھے کہیں کا نہ رکھے گی۔“

اسی رات ریحان دادی کے کمرے میں بلائے گئے۔ دادی سے کئی بار الجھ چکے تھے۔ کئی بار منت و خوشامد سے منانے کی سعی کی تھی۔ عجز و انکساری سے راغب کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ لیکن دادی تو مونگے کی پشان تھیں۔ اپنی بات پر پورے جاوہ جلال سے قائم تھیں۔ ریحان کے صبر کے بند بھی اب ٹوٹ گئے۔ وہ آج طوفان سے آخری بار پنپنے کے ارادے سے آئے تھے۔ ان کی چال میں متانت تھی۔ چہرے پر سنگین سی سنجیدگی۔ در نہیں یا سر نہیں والا معاملہ نظر آتا تھا۔

دادی اپنے پانگ پر بیٹھی تھیں۔ فوزیہ منہ بسورے قریبی کرسی پر نیم دراز تھی۔ انجم پرے کمرے میں کھڑی تھیں۔ آج ماں سے انہوں نے جھڑپ لی تھی۔ خاصہ قائل بھی کر لیا تھا۔ لیکن سعدیہ اور فوزیہ نے وہ طوفان اٹھایا تھا کہ انہیں چپ ہو جانا پڑا تھا۔

سعدیہ حسن بانو کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ کابے کابے ان کے کندھے آہستہ آہستہ دبا رہی تھی۔ حسن آرا مسہری کے ٹیکے سے ٹیک لگائے تھی۔

زیر بحث وہی موضوع تھا۔

ریحان اک متانت آمیز چال چلتے دادی کے پانگ کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ سعدیہ کے ماتھے پر انہیں دیکھتے ہی بل پڑ گئے۔ حسن آرا اور فوزیہ بھی چپ ہو گئیں۔

حسن بانو نے نکاد اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ”دادی حضور!“

”میں نے تمہیں طلب نہیں کیا۔“

”میں خود حاضر ہوا ہوں۔“

”کس لیے“

”آپ جانتی ہیں۔“

”کسی قسم کی گفتگو سے پہلے جواب دو کہ تم نے کیا سوچا ہے؟“

”مگر بھر بھی سوچتا ہوں تو فیصلہ وہی ہو گا جو آپ کے گوش گزار ہو چکا ہے۔“

”ریحان“ سعدیہ نے ڈانٹا۔ ریحان نے اس ڈانٹ کا کوئی اثر نہ لیا۔

”خود سری پہ اتر آئے ہو؟“ دادی نے پوچھا۔

”اسی لیے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے آپ خود سری پر آمادہ نہ کر س۔“ بلجے کی تنک سے

دادی بھڑک اٹھیں۔ ”تمہارے چچا نے بھی خود سری کی تھی۔ جاتے ہو انجام کیا ہوا تھا۔“

وہی حالت پھر پیدا ہو رہے ہیں۔ سمجھ لو کہ ایک ماں اپنے بیٹے کی پروا نہ کر سکی تو تمہاری

کیا کر سکی۔ اپنے وقار کی خاطر ہم سب کچھ سہہ گزر رہے گے۔“

”اس میں وقار کا کیا سوال دادی حضور“ حسن بانو کے اشتعال کے باوجود ریحان بڑے

سکون سے بولے۔ ”کیوں نہیں؟“

”کیا صاعقہ آپ کی پوتی نہیں۔۔؟“ ریحان نے مسہری کے قریب گھٹنوں کے بل

ڈٹ کر دادی کے گھٹنے پکڑ لیے۔ ان کی آواز میں کد بھی تھا۔ رنجش بھی۔۔ احتجاج بھی

اور استفسار بھی۔

دادی کچھ بوکھلا سی گئیں۔ صاعقہ کو پوتی تسلیم کرنے سے انکار کیونکر کر سکیں۔

حسن آراء نے جلد ہی بات سنبھالی۔ ”پوتی۔۔ ہونہ۔۔ ڈائن ہے ڈائن۔“

”پھو بھی جان“ ریحان پیچھے۔

”ریحان۔۔ تمیز کی حدود سے باہر مت نکلو“ سعدیہ نے پھر ڈانٹا۔

”ڈائن جو کہہ دیا اس کی پہچیتی کو“ فوزیہ غرائی۔

”ڈائن نہیں تو کیا ہے۔ پیدا ہوتے ہی ابا حضور کو بھل گئی“ حسن آراء نے پھر وار کیا۔

”وہ پیدا نہ ہوتی تو دادا حضور نے وفات نہ پانی تھی؟“ ریحان نے خشم ناک بلجے میں

کہا۔

”ریحان“ دادی کی آواز میں ڈانٹ تھی۔

”ہی“

”تمہاری ان باتوں کا کیا مطلب؟“

”آپ لوگوں کی تو ہم پرستی نے صاعقہ کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ یہ خود ساختہ

ہمیشہ۔۔“



خود ساختہ!!۔۔۔ فوزیہ تنک کر بولی۔

”تو اور کیا۔۔۔ صاعقہ کا ان سے کیا تعلق۔۔۔ دادا جان فوت ہو گئے، گناہگار صاعقہ۔۔۔ پھوپھا جان کو فضائی حادثہ پیش آیا، مورد الزام وہ بیچارہ۔۔۔ گوداموں میں آگ لگی چونکہ ار کی غفلت سے، عتاب صاعقہ پر ٹوٹا۔۔۔“ ریحان نے جوش میں آکر کئی واقعے دہرائیے:

”ذرا تو ٹھنڈے دل سے سوچئے۔ نحوست کو اس کی ذات سے وابستہ کرنے میں آپ سب کہاں تک حق بجانب ہیں۔“

”مجھے اس تکرار میں پڑنے کی ضرورت نہیں“ حسن بانو جیسے کترانا چاہتی تھیں۔  
”لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ جب سے پیدا ہوئی ہے ہمارے خاندان پر آفتیں ہی ٹوٹی ہیں۔“

”کیا اس کی پیدائش سے پہلے خاندان کسی آفت سے دوچار نہ ہوا تھا؟“ ریحان نے دادی کے کھٹنے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا  
”ریحان!!“ سعدیہ نے ٹوکا۔

لیکن ریحان اپنی دھن میں جوش میں آکر بولے ”دادی حضور آپ کے جواں سال بھائی مینار سے گر کر کب ہلاک ہوئے تھے؟ اور وہ جو قیمتی کاغذات اور دستاویزیں چلنے کا ناقابل تلافی نقصان ہوا تھا، وہ بھی صاعقہ ہی کی پیدائش کے بعد کی بات ہے کیا؟۔۔۔ اراضی کے جھگڑے میں کئی مزارعے جان گنوا بیٹھے تھے۔ یہ قصہ بھی تو صاعقہ کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔۔۔“

ریحان نے جوش سے بھڑکتے ہوئے کئی مثالیں دے ڈالیں۔ انحراف ممکن کہاں تھا۔ دلائل سے سب دم بخود ہو گئے۔

سعدیہ بار بار بیٹے کو ڈانٹ رہی تھی۔ لیکن جوش میں وہ کچھ سن تھوڑا ہی رہے تھے۔ حسن بانو چپ تھیں۔ ریحان کی تقریر کا اثر جو تھا، سو تھا، آج دوپہر سے ہی بچھی بچھی نظر آ رہی تھیں۔ اس پر انجم آرانے جو جھوپ لی تھی، حقائق کو منظر انداز کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ ان کے اندر کی عورت کسمسا اٹھی تھی۔ شام صاعقہ سے بھی سامنا ہوا تھا۔ اس کی پریشان حالی دیکھ کر ایک بار تو دل میں کسک ہوئی تھی۔ فوزیہ اور سعدیہ داویلانہ کرتیں تو شاید آج شام ان کی شفقتوں کے سنے دامن صاعقہ کے لیے خود بخود پھیل جاتے۔ جب

سے اب تک ضمیر برابر ملامت کر رہا تھا۔

”اور پھر ان سب آفتوں کو صاعقہ ہی کی ذات سے جانے کیوں وابستہ کیا جاتا ہے۔ کیا اس کے بعد کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔ فرید ماموں کی موت اسی سے کیوں وابستہ کی جاتی ہے۔ میرا سے کیوں نہیں۔ جو ان دنوں صرف چھ ماہ کی تھی۔ فریدوں سے کیوں نہیں جو صرف دس دن کے تھے۔“

فوزیہ اس زبردست چوٹ سے تلملا اٹھی۔ سعدیہ اور حسن آرا بھی آتش زہر پا نظر نہیں لیکن حسن بانو چپ تھیں۔ فوزیہ انہیں چپ دیکھ کر غصے سے بھرک اٹھی۔ سب کی سب ریحان کے پیچھے پڑ گئیں۔ انجم پرے کھڑکی میں کھڑی سب کچھ خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ ریحان چند لمحے خاموشی سے سنتے رہے۔

”جو کچھ بھی ہے۔۔۔ تم اس کی نحوست سے انکار کر سکتے ہو لیکن اسما بھی جاتے ہو کہ اس کی ماں کون تھی؟“ فوزیہ نے جیسے سب سے بڑا وار کیا۔  
”جو بھی تھی“ ریحان متانت سے بولے ”اتنی واضح ارفع و اعلیٰ تو ہوگی کہ اس کے لیے ظاہر چچا زمانے سے ٹکرا گئے۔“

”ریحان بہت بڑھتے جا رہے ہو۔“ سعدیہ نے سرزنش کے طور پر ڈانٹا۔  
”سوچ کر بات کرو“ حسن آرا غرائیں۔

دادی اب بھی چپ تھیں۔ شاید ان کے اندر کی عورت پھر کسمسا رہی تھی۔ ریحان کسی کی پروا کیے بغیر پھر دادی سے مخاطب تھے۔ ”دادی حضور۔۔۔ آپ اتنی تنگ دل کیوں ہو گئیں!“

ریحان کے لہجے کی رقت نے پتھر کو بھی پگھلا دیا۔

”ظاہر چچا پر پابندی لگانے میں بے شک آپ حق بجانب تھیں۔ ہماری خاندانی روایات مجروح ہونے کا سوال تھا۔ لیکن صاعقہ کے بارے میں آپ کا ایسا رویہ کیوں ہے۔ وہ تو آپ کا اپنا خون ہے دادی حضور۔ آپ کے مرحوم بیٹے کی نشانی ہے۔“

”یہ باتیں سنو میں ریحان دادی کے کھٹنے پر ہاتھ بٹھوڑ رہے تھے۔“  
”یتیم بچی آپ کے ہوتے ہوئے بھی ساری عمر آپ کے سایہ عاطفت سے محروم رہی ہے۔ ہزاروں یتیم آپ کی ذرہ نوازی کی بدولت زندگی کی آسائشیں لوٹ رہے ہیں۔ آپ کی نگرانی میں یتیم خانے چل رہے ہیں۔ لیکن آپ کے گھر میں آپ کا اپنا خون آپ



کے دسے شعلات کے لمس تک سے محروم ہے۔ ابھی چائے آپ نے یہاں کی نظر سے  
ابھی اسے رکھا ہے۔ کیا یہی فرمانِ بدنامہ ہی ہے واوی حضور۔ کیا یہیوں سے لڑا سہی  
سلوک روار کھنچا ہے؟ ”مرحان بوش بندہات سے دل رہے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں۔  
بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے۔

ان کے سیاہ کوٹ کے کندھے پر ابھی تک صاعقہ کے آنسوؤں کے داغ تھے۔ ریحان  
بوسے گئے۔ ان کے الفاظِ جادو کے سانچے میں ڈھلتے گئے۔ حسن آرا اور سعدیہ کو انہیں  
ٹوکنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ہاتھروں میں درندہ پڑنے لگی تھیں۔ سب کے سر جھکے جا رہے تھے۔ اک فوزیہ  
تھی جو ان جھکتے سروں میں اپنی شکست کا عکس دیکھ کر غصے سے بوش کھا رہی تھی۔  
”آپ سب کتنے شقی القلب ہیں۔ آپ نے اک جیتی جاگتی زندگی کو موت سے ہم کنار کر  
رکھا ہے۔ آپ نے بیہیمانہ رویے سے ہمیشہ اس کے زخموں پر ٹک چھڑکا ہے۔ کبھی کسی  
نے پھیلا رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کیا وہ انسان نہیں؟ اس کے سینے میں دل نہیں۔ وہ  
ماں کے پیار کی تمنا نہیں رکھتی۔ وہ باپ کی شفقتوں کی تمنائی نہیں۔ آپ نے اب تک  
اس کی ان مجروح اور سسکتی خواہشوں کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ بن ماں باپ کی بچی کو پیار  
کی نعمت سے کہاں تک نوازا ہے۔ اس خلا کو کہاں تک پورا کیا ہے جو آپ کے بیٹے کی  
وفات سے پریدہ ہو گیا تھا۔ کہیے دادی حضور۔ آپ نے اپنے مرحوم بیٹے کی روح کی آسودگی  
کے لیے اب تک کیا کیا ہے۔ کیا ظاہر پچا کی روح اب تک بھٹک نہ رہی ہوگی۔ کیا اسے اس  
حالت میں قرار آسکتا ہے۔ دادی حضور۔ دادی حضور۔“ ریحان بانپ رہے تھے۔  
انہوں نے دادی کے قدموں پر سر رکھ دیا، نڈھال ہو کر۔

”آپ نے اپنے اندر کی عورت کا گھما کہاں گھونٹ دیا دادی حضور۔“ ریحان نے پھر سر  
اٹھا کر مجنونانہ انداز میں دادی کے پاؤں جھنجھوڑے۔ ”جھوٹی آن، ظاہر داری اور تصنع  
کے لیے اس عورت کو کہاں سلا دیا ہے دادی حضور۔ جس کے سینے میں ممتا بھرا دل  
وجھ رہا ہے۔“

انجم زار زار رو رہی تھی۔ حسن آرا اور سعدیہ کی آنکھیں بھی ڈبڈب رہی تھیں۔

حسن بانو بدستور سر جھکائے منٹھی تھیں۔ وہ تو جیسے پتھر اسی گئی تھیں۔ ان کے  
ہونٹوں پر جلد چپ تھی۔ ریحان بار بار انہیں جھنجھوڑ کر اپنی بات کا جواب مانگ رہے

”آپ نے میرے کچھ نہیں دیا۔ ہر دل میں اس کی طرف سے محبت و عقارت کا  
دارا ہوا ہے۔ بچوں کے ذہن آپ سب نے مسوم کیے۔ ہر کوئی اس کے سایہ سے ڈرتا  
ہو۔ وہ ٹیک دل آیا نہ ہوتی تو امید نہ تھا آپ جیسے جلاوا لوگ اسے زندہ دفن کر دیتے۔ بچے  
میں ہمنندہ ڈال کر ختم کر دیتے۔ آپ اب بھی اسے کچھ نہیں دینا چاہتیں۔ اس کی خوشیوں  
کے بچے یوں کھونٹنے سے بہتر ہے آپ اس کا گھلا کھونٹ دیں۔۔۔ لمحہ لمحہ کی موت سے  
ایک بار ہی مار ڈالیں۔“ اور پھر جانے ریحان کو کیا ہوا۔ وہ اٹھ کمرے ہوئے۔ بوش میں  
پنچے ہوئے بولے ”آپ اب بھی اسے کچھ نہیں دینا چاہتیں تو میں اسے ابھی یہاں لے  
آتا ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے اس کا گھلا کھونٹ دیں۔ تڑپا تڑپا کر مارنے سے ایک بار ہی  
ختم کر ڈالیں۔۔۔ اسے ابھی لاتا ہوں۔ ابھی لاتا ہوں۔“ وہ دیوانہ وار کمرے سے نکلے۔  
اور چند ہی منٹوں بعد وہ صاعقہ کو تقریباً فسیختے ہوئے لے کر کمرے میں آئے۔  
صاعقہ بدحواس تھی۔ چہرہ فق تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھی جم گئے تھے۔  
شاید۔۔۔ کچھ بھی نہ سمجھ پائی تھی۔

ریحان نے پانک کے قریب پہنچ کر اسے وادی کی طرف دھکیل دیا۔ ”یہ لیجئے اپنے  
قلم کے شکار کو۔۔۔ ابھی آپ کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا تو مار ڈالیے اسے۔ گھلا کھونٹ  
دیجیے۔“ ریحان ایک دم رک گئے۔

حسن بانو نے صاعقہ کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا تھا۔ انکی بوڑھی آنکھوں سے  
سیلابِ اشک رواں تھا۔

”میرے بد نصیب طاہر کی مظلوم بچی۔۔۔!“ وہ اسے دیوانہ وار سینے سے لٹائے رو رہی  
تھیں۔

حسن آرا اور سعدیہ بھی یوں رو رہی تھیں جیسے طاہر آج سے دس سال پہلے نہیں ابھی

ابھی مرے ہوں اور ان کی بے یار و مددگار بچی ان کے سامنے پڑی ہلک رہی ہو۔

منظارِ استعارت انگیز تھا کہ ریحان کی آنکھوں کے گوشے بھی نم ہو گئے۔ ہونٹ داتوں

میں دبائے ہوئے انہوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ماسول پہل چکا تھا اور اس کے

ساتھ صاعقہ کی تقدیر بھی۔ واوی اسے سینے سے بچنے جس بے اختیار اور درد سے آنسو

بہا رہی تھیں۔ پکھلی تلخیاں خود بخود دھل رہی تھیں۔



صاعقہ روتے روتے بے دم ہو گئی تھی۔ آج زندگی میں پہلی بار اس نے دادی کی شفیق گود کی پناہ پائی تھی۔ وہ اس گود میں تحلیل ہو جانا چاہتی تھی۔  
آہ محبت و شفقت کو ترسی ہوئی پیاسی روح!

بہار کی نشیلی ہواؤں کی طرح جھومتی صاعقہ اپنی خواب کلاہ کی طرف بڑھتی آج شام کے بہ موقع واقعے نے اس کی زندگی کے رخ اپنا نیک کامرانیوں کی طرف موڑ دیے تھے۔ سرور جذبے اس کے سینے میں ہلچل مچا رہے تھے۔ اس واقعے کے بعد ابھی تک وہ آیا سے نہ ملی تھی۔ آیا۔۔ جو اس کی حقیقی مونس و ٹکسار تھی۔ ”آیا!“ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی و فوراً مسرت سے چلائی لیکن بتی جلاتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ بے آیا سمجھ کر ہائی تھی وہ آیا نہیں فوزیہ تھی۔

اتنی رات گئے فوزیہ کو اپنے کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک جانا قدرتی امر تھا۔ فوزیہ نے سر تپا لے کھورا۔

صاعقہ اور سہم گئی۔ اس کا تنہا سا دل بے طرح دھک دھک کرنے لگا۔  
”آگئی ہو رنگ رلیاں مٹا کر“ وہ تیکھے تیوروں سے اسے دیکھتے ہوئے بڑی کرخت آواز میں بولی۔ صاعقہ گنگ سی دروازے کے قریب کھڑی فوزیہ کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ کمرے میں وسط میں دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھے کھڑی تھی۔ چہرے سے کرشماتی کے آثار صاف مترشح تھے۔ آنکھوں میں اک خوفناک سی چمک تھی جو لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی۔  
”آج تم بہت خوش ہو۔۔ میدان مار لیا ہے نا۔ کھڑوالوں کے دل بیت بے شد۔“ فوزیہ کیٹانی سے مسکراتی۔

صاعقہ آنکھیں کھولے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ زبان گنگ تھی اور گھبراہٹ سے پسینہ آ رہا تھا۔

”تم جانتی ہو۔ سمیرا اور ریحان کی نسبت ٹھہرائی جا چکی تھی؟“ فوزیہ نے بلا تہیہ شک کر سوال کیا۔ صاعقہ نے سر جھکا لیا۔ لیکن کچھ کہنے کی جرات نہ کر سکی۔  
”تم اگر نہیں جانتیں تو میں بتانے دیتی ہوں۔ یہ نسبت قرار پانگی تھی اور تہداری



آگہی کے لیے یہ بھی کہہ دوں کہ یہ نسبت میری میٹھی کی زندگی کی خوشیوں کی ضامن تھی۔۔۔“  
 فوزیہ نے اک قہر آلود نگاہ صاعقہ پر ڈالی۔  
 صاعقہ سر تاپا کانپ گئی۔

تمہارے وجود نے حائل ہو کر ساری بساط ہی پلٹ دی ہے۔ اور آج کے واقعے نے  
 تو میری بچی کی تقدیر پر ابدی ناکامی کی مہر لگا دی ہے۔ آج سے بیس اکیس برس پہلے بھی  
 یہی ہوا تھا۔ تمہاری ماں نے میری زندگی کی بہانہس لوٹ لی تھیں۔۔۔ اور آج تم۔۔۔ تم  
 وہی کردار ادا کر رہی ہو۔۔۔ لیکن۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔“ فوزیہ رعد و باراں کی طرح  
 کڑکی۔۔۔

”چچی حضور۔۔۔“ کانپتے ہوئے جسم کو بمشکل سنبھالے صاعقہ مدحم آواز میں صرف  
 استاکہہ سکی۔

”تم بہانہس لوٹو۔۔۔ اور میری بچی کا تنوں سے لہو لہان ہو۔۔۔ میں جیتے جی یہ  
 برداشت نہیں کر سکتی میں اپنی میٹھی کا دامن مسرتوں سے بھر کر رہوں گی۔۔۔ تمہیں  
 اس کے راستے سے ہٹنا ہو گا۔“

فوزیہ دو قدم آگے بڑھی۔ اس کی آواز میں خوفناک گونج تھی ”تم اس کے راستے سے  
 اب بھی ہٹ جاؤ۔۔۔ نہیں تو یاد رکھنا اک ماں محرومیوں کی اذیت سے آشنا ماں، اپنے لخت  
 جگر کی مسرتیں لوٹانے کے لیے بھیانک قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔“  
 صاعقہ کا رنگ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید تھا۔ پٹ کا۔۔۔ ہمارا لیے کھڑی تھی۔ لیکن  
 ٹانگیں سہارے کے باوجود اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر نظر آرہی تھیں۔  
 ”وعدہ کرو۔۔۔“ فوزیہ آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے بولی۔ ”کہ تم ریحان اور سمیرا  
 کے راستے سے ہٹ جاؤ گی۔“

”چچی۔۔۔ حضور۔۔۔“ صاعقہ نے سراپا درد بن کر اس کی طرف دیکھا لیکن خونخوار  
 نظروں میں رحم کا شائبہ تک نہ تھا۔ صاعقہ بے اختیار ہو کر رونے لگی ”مجھے آنسوؤں سے  
 مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرو۔۔۔ میری بات کا جواب دو۔۔۔“  
 وہ چند لمحے رکی۔۔۔ پھر غرائی ”تم مصالحت پہ آمادہ نہ ہوئیں تو میں دوسرا طریقہ بھی  
 استعمال کر سکتی ہوں۔“

صاعقہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ فوزیہ کے ہاتھ

پستول تھا جس کی نالی کا رخ صاعقہ کی طرف تھا، اپنی جان عزیز ہے تو وعدہ کرو۔۔۔  
 نہیں تو میں اک لمحہ میں تمہیں ختم کر دوں گی۔ میری بچی اگر ناکامی کے دکھ جھیلے گی تو تم  
 کی بہانہس لوٹنے کے لیے نہ رہو گی۔۔۔ بولو۔۔۔ جواب دو۔۔۔ ورنہ۔۔۔!“

ایک ہاتھ لپکا۔ بجلی کی سرعت سے فوزیہ کے ہاتھ پر جھپٹا اور پستول چند گز کے فاصلے  
 پر جا کر۔ صاعقہ اور فوزیہ نے بیک وقت ادھر دیکھا۔ جھپٹنے والی آیا تھی جو صاعقہ کے  
 بے رنگ روم گئے اچانک نکل آئی تھی۔

ایا کی مداخلت پر فوزیہ کا اشتعال اور بڑھ گیا۔ وہ چیل کی طرح پستول پر جھپٹی لیکن آیا  
 نے تیزی سے بڑھ کر پستول اٹھا لیا۔

صاعقہ بت بنی وہیں کھڑی تھی۔ اس کی ساری ہمت جیسے کسی نے سلب کر لی تھی۔  
 لے جان تماشائی کی طرح آنکھیں کھولے ہوئے تھی۔

”پستول مجھے دے دو!“ فوزیہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔  
 آیا دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”میری راہ میں حائل نہ ہو آیا۔۔۔ ورنہ جان لے کر میرے انتقام کی آگ تجھے بھی ساتھ  
 ہی جسم کر ڈالے گی۔۔۔“ فوزیہ خونخوار لہجے میں بولی۔

آیا نے فوزیہ کی طرف دیکھا۔۔۔ چند ثانیے دیکھتی رہی۔۔۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔  
 آنکھوں میں چمک آئی۔۔۔ سانس پھول سا گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا  
 لوہا اس کے سینے کی ہڈیوں سے ٹکرا رہا ہو۔

فوزیہ پستول پر پھر جھپٹی۔  
 ”ہٹ جاؤ!“ آیا نے دھمکا دے کر اسے دور ہٹا دیا۔

”تم کون ہو میرے معاملے میں دخل دینے والی؟“ فوزیہ چنچنی۔  
 ”میں۔۔۔ میں۔۔۔“ طوفان پھوٹ پڑنے کو بیتاب نظر آرہا تھا۔ ”میں بتا دوں میں

کون ہوں۔۔۔ میں تیرے سینے میں بیس سال سے گڑی ہوئی میچ ہوں۔ میں تیری  
 قسمت کی آواز ہوں۔“

صاعقہ نے ششدر ہو کر آیا کی طرف دیکھا۔ فوزیہ خونخواری کے باوجود کچھ بھونکی سی  
 نوا آئی۔

”کواس بند کرو“ فوزیہ پھر آیا سے پستول جھپٹنے کو لپکی۔



”پرے ہٹ جاؤ فوزیہ۔۔ کہیں میری بے صبر دہی ہوئی ناہام جہلتیں مجھے یہی پستول تم پر آزمائے کو مجبور نہ کر دے۔۔“

”تم بہت بڑھ رہی ہو آیا۔۔ زبان بند رکھو!“ فوزیہ غرائی۔

”آج یہ زبان بند نہ رہ سکے گی۔۔ زبان بند رکھنے کا عرصہ ختم ہو گیا۔ آج، آج میری ریاضت کو ثمر مل گیا فوزیہ۔۔ آج میری زبان بند نہیں رہ سکتی۔۔“

”بیہودہ بد تمیز کیا بک رہی ہے۔۔“ فوزیہ آیا پر جھپٹی۔

”آیا نے پورے زور سے دھکا دیا۔ فوزیہ گرتے گرتے بچی۔

”آیا!“ فوزیہ ناکامی سے جھلا کر چیخی۔

”آیا نہیں۔۔ مجھے ناجی کہو۔۔ ناجی۔۔“ آیا کے سینے کا نشیب و فراز طوفان کو روکنے سے قاصر تھا۔ طوفان پھوٹ پڑا۔ صاعقہ نے حواس باختہ ہو کر آیا کی طرف دیکھا۔ اور کچھ دیر کے لیے تو فوزیہ بھی شل سی ہو گئی۔ لیکن آیا کو ناجی سمجھنا فہم و ادراک سے دور تھا۔ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔

”دیکھو۔ غور سے دیکھو۔۔ پہچانو مجھے۔۔ میں کون ہوں۔۔“

فوزیہ جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔

اور صاعقہ! اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جانے اب تک حواس پر قابو کیسے پائے ہوئے تھی۔ ”تم کہاں پہچانو کی مجھے۔۔ تم تو عرصہ ہوا مجھے نیست و نابود کر چکیں لیکن میں سالے کی طرح تم سے چمٹی رہی۔۔“

فوزیہ نے ششمناک نظروں سے آیا کو گھورا۔

”میں اپنی پہچان کروانے کو تیرے ہی دیئے ہوئے لائقہ اوداغ دکھا سکتی ہوں۔ ان مظالم کی داستانیں دہرا سکتی ہوں جو تو نے مجھ پر ڈھائے۔ تو نے میری زندگی کو شمشان بنا دیا۔ اور اب میری بچی کی بہاریں اُٹنے آئی ہے۔۔ میں، میں تیری اس کوشش کا منہ توڑ جواب دینے کو زندہ ہوں۔“

صاعقہ کے ہاتھ شل ہو گئے تھے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہ رہی تھی کہ بڑھ کر آیا سے لپٹ ہی جاتی۔

”میں وہ آہنی حصار ہوں فوزیہ جس نے اپنی بچی کی حفاظت نامساعد حالات میں بھی

”تم ناجی ہو“ فوزیہ نے گھورتے ہوئے بولی۔

”تمہارے شکوک رفع کرنے کو میرے سینے کے داغ اب بھی جل رہے ہیں۔ ظالم ڈائن مجھے برباد کر کے تسکین نہ ہوئی جو اب میری ماستا کو پھونکنے آئی ہو۔“

”تم ناجی ہو؟“ فوزیہ دیوانوں کی طرح اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

آیا اس کی بوالہوا سی طعنے بنس دی۔ ”یقین نہیں تو سینے کے داغوں کے ساتھ پیٹ کے وہ داغ بھی دکھا سکتی ہوں۔ جو صاعقہ کی پیدائش پر آپریشن کے ہونے کے ثامن ہیں۔۔“

اس بنسی۔۔ طعنے بنسی نے جیسے بارود کو آگ دکھا دی۔ فوزیہ کا ذہنی توازن بگڑنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

”تو ناجی ہے۔۔ اگر واقعی ناجی ہے تو میں آج صاعقہ کے ساتھ تجھے بھی ختم کر دوں گی۔ اپنی انتقام کی جلتی ہوئی آگ تم دونوں کے خون سے بجھاؤں گی۔۔ تو ناجی ہے۔ تو میں تجھے مار ڈالوں گی۔۔“

پتھرے ہوئے جذبات لیے وہ پاکلوں کی طرح آیا پر جھپٹی۔ اس کے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش میں وہ خوفناک سے خوفناک تر ہوتی گئی۔ آیا پوری قوت سے مدافعت کر رہی تھی۔

اس ہاتھ پائی میں فوزیہ کا ہاتھ پستول کی لہلی پر پڑا۔ اس نے تیزی سے لہلی دبا دی۔ اک گولی چل گئی۔

بارودی دھماکے سے کمرہ لرز گیا۔ اور نسوانی چیخیں اس دھماکے میں ڈوب گئیں۔



گولی کی آواز سن کر محل کا ہر فرد ہڑا کر اٹھا۔ سب حیران پریشان کمروں سے نکل کر برآمدے میں آگئے۔

دوسری گولی چلنے کی آواز پر سب حواس باختہ ہو کر آواز کی سمت لپکے صاعقہ کی خواب گاہ میں سب سے پہلے داخل ہونے والے ریحان تھے۔ کمرے کا وحشت ناک منظر دیکھ کر ان کا دماغ چکر اگیا۔

صاعقہ دروازے کے قریب بے ہوش پڑی تھی۔ آیا اور فوزیہ کھٹکھٹاتھیں۔ دونوں کے ہاتھ پستول پر تھے۔

فوزیہ وحشیانہ طریق سے چیخ رہی تھی۔۔۔ ”تو ناجی ہے تو میں تجھے ختم کر کے دم لوں گی۔۔۔ تجھے مار ڈالوں گی۔۔۔ مار ڈالوں گی۔۔۔!“

پندرہ ٹائیوں میں کمرہ محل کے افراد سے بھر چکا تھا۔ اظہر نے بڑھ کر فوزیہ کو آیا سے الگ کیا۔

اس کی حالت دیوانوں کی سی تھی۔ وہ اظہر کے مضبوط ہاتھوں سے بھی نکلی جا رہی تھی۔ آیا کو کچا پہنا جانا چاہتی تھی۔

بیشکل فوزیہ کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ آیا سنبھل کر بیٹھی۔ صاعقہ کو بستر پر لٹا کر ہوش میں لانے کی تدبیریں ہونے لگیں۔

ہر فرد ہراساں تھا۔ صورت حال سے نا آشنا۔۔۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ ایک دوسرے سے ایک ہی نوعیت کے سوالات پوچھتے جا رہے تھے۔

پستول میں باقی چار گولیاں تھیں۔ دو گولیاں چھت کے مختلف حصوں میں سوراخ ڈال چکی تھیں۔

حسن بانو بھی موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ ہر کوئی حالات سے آگہی پانے کو بیتاب نظر آ رہا

تھا۔ ناجی کا ذکر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

آیا سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے انداز اب پر سکون تھے۔ پستول اب اظہر کے ہاتھ میں تھا۔

دوسرے کمرے میں فوزیہ اب بھی چیخ رہی تھی۔۔۔ ”ناجی کو میں مار ڈالوں گی۔۔۔“ صاعقہ کو ہوش آگیا اتنے بڑے جھوم کو اپنے گرد دیکھ کر وہ پھر کھبرا گئی۔ آنکھیں بند کر لیں اور بے دم سی غفلت آنے لگی۔

ریحان پریشانی اور بیتابی سے بار بار صاعقہ کا کندھا ہلاتا رہے تھے۔ صاعقہ نے کئی منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیں۔ اب اس کا خوف زدہ ذہن حالات کو سمجھنے کی اپنے میں صلاحیت پارہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آیا اٹھی اور صاعقہ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ صاعقہ نے بھاری اٹھائیں۔ آیا کی طرف دیکھا۔

آیا کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اپنی بے تاب مانتا کو بہ مشکل قابو کیے وہ صاعقہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صاعقہ اسے دیکھتی رہی۔ آیا کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں ممتا کی لہریں اٹھنے لگیں۔ لہریں اٹھتی گئیں اور ان میں صاعقہ کا وجود بہتا گیا۔ بہتا گیا۔ بہتا چلا گیا۔ اور پھر جیسے اسے یہی لہریں کنارے تک لے آئیں۔ وہ اٹھی اور بے تابی سے آیا سے لپٹ گئی۔

”ماں“ وہ اس سینے سے لپٹ گئی جس سے لپٹنے کی تبتا نے بارہا اسے تڑپایا تھا۔

ماں۔۔۔ ماں کے ممتا بھرے سینے سے۔

ناجی نے اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ دونوں کے آنسو روائی سے بہہ رہے تھے۔

کوئی حقیقت حال سے آشنا نہیں تھا۔ صاعقہ کے آیا سے یوں لپٹنے نے ذہن اور الجھنوں میں ڈال دیئے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں کے انداز نے سب کو متاثر کیا تھا۔

کافی دیر کے بعد جب حواس درست ہوئے اور فضا کچھ کہنے سننے کو سازگار ہوئی تو حسن بانو کے استفسار پر صاعقہ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

ہر ذہن جیسے مشاوع ہو کر رہ گیا۔



ہر آنکھ ناجی پر لگی تھی۔ آڑے ترچھے زاویوں سے اسے پرکھا جا رہا تھا۔ یادوں کی راکھ کرید کر کوئی چٹکاری نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن ہر کوشش کے باوجود آیا کو ناجی تسلیم کرنے کا خیال ہی مضحکہ خیز معلوم ہوا۔  
آیا پر کئی سوالات کیے گئے۔

اس نے جواب دیے۔ اس نے گھناؤنے مظالم کی داستان دہرائی۔ اس نے ظاہر کے ساتھ اس محل سرامیں قدم رکھنے کے بعد کے کئی واقعات بیان کیے۔ سرندامت سے جھک جھک گئے۔ آیا خود بھی خجل سی نظر آ رہی تھی۔ نیک خصلت آیا کو کسی کو نادم کرنا مقصود نہیں تھا۔ لیکن اپنا وجود تسلیم کروانے کے لیے یہ ضروری بھی تو تھا۔  
اب اسے ناجی تسلیم نہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ سب حیرت زدہ سے اسے تنکے جا رہے تھے۔

جب ذہنی سکوت دور ہوا تو ناجی پر پھر سوالات کی بوچھاڑ تھی۔ ”تم روپوش کہاں ہوتی تھیں۔ تمہاری شکل و صورت پہ کیا مینتی۔۔۔ تم نے اپنے آپ کو ظاہر کیوں نہیں کیا؟“  
ناجی پلنگ پر بیٹھی بیٹھی مسکرائی۔ پھر اس کی مسکراہٹ آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ مختصر الفاظ میں اس نے سب سوالوں کا جواب دیا۔ بہت کچھ کہنے کے بعد وہ بولی ”زندگی سے اتنی دل برداشتہ ہو گئی تھی کہ مرجانے کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔ سیاں مجھے باہر لے جانے کی تیاری کر رہے تھے لیکن فوزیہ نے اس رات دھمکی دی کہ اگر میں نے سیاں کو لے کر یہاں سے جانے کی کوشش کی تو مجھے سیاں نہیں ان کی لاش ملے گی۔۔۔“  
”کم عمری اور ناتجربہ کاری تھی۔ جینے سے پہلے ہی میزار تھی۔ اس تنبیہ نے رہا سہا سکون بھی لوٹ لیا۔ اسی رات میں نے زندگی کا جوا اتار پھینکنے کا تہیہ کر لیا۔ سیاں کو سوتے چھوڑ کر میں کمرے سے نکلی۔۔۔ اور محل کے پچھواڑے اسی پتھر سے دریا میں کود گئی جہاں اکثر بیٹھ کر اپنے حالات پر آنسو بہایا کرتی تھی۔۔۔“  
سنسنی خیز واقعات سن کر سب کے سانس اوپر کے اوپر رہ گئے تھے۔

”لیکن موت نہ آئی۔ لہریں مجھے بہا کر دور لے گئیں۔ جب ہوش آیا تو میں اک دیہاتی مکان میں تھی۔“

وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر بڑے دردناک انداز میں اپنی پوری داستان سنا ڈالی۔ اس دیہاتی مکان میں اس پر کیا مینتی۔۔۔ اور کس طرح اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے

اس نے تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لکالی۔

ناجی روتے ہوئے اپنے مصائب کی داستان سن رہی تھی۔ سب دم ہنوتے تھے۔

”دو سال میں ہسپتال میں اپنے زخموں کی چارہ جوتی کے لیے رہی۔ موت نے ہر بار مجھ سے آنکھیں چرائیں۔ ہسپتال میں ڈاکٹر بنید کے مشفقانہ رویے سے میری ٹوٹی ہوئی ہمت بندھی اور میں نے زندگی سے مصالحت کر لی۔ میرا حلیہ سرتاپا بدل چکا تھا۔ بڑی مدت تک اس تبدیلی سے میں خوف زدہ رہی۔ اپنی صورت دیکھ کر گھن آتی تھی لیکن صورت کی یہی تبدیلی میرے حق میں رحمت ثابت ہوئی۔۔۔ ڈاکٹر بنید کے ہاں میں بچے کی آیا کی حیثیت سے ملازم ہو گئی۔ اور جب وہ تبدیل ہو کر اس شہر میں آئے تو میں بھی یہاں آ گئی۔۔۔ اپنی مامتا کی تڑپ جو میں نے یہاں آ کر محسوس کی بیان نہیں کر سکتی۔ شاید اس تڑپ ہی نے مجھے میری بچی سے ملا دیا۔۔۔ صاعقہ کی آیا بن کر مجھے اپنے سارے دکھ بھول گئے۔“ وہ چند لمحے پھر رکی۔ آنچل سے آنسو پونچھے اور بھولی ”یہاں کسی نے مجھے پہچانا نہیں۔۔۔ اور نہ ہی اس خوف سے میں نے کسی کو اپنے متعلق بتایا۔۔۔ کہ کہیں ناجی سے دشمنی عود نہ کر آئے اور میں اس سعادت سے محروم ہو جاؤں جو اپنی بچی کو اپنے ہاتھوں پالنے سے میرے نصیبوں میں آئی تھی۔ سیاں کی موت کا اندوہناک صدمہ جھیل کر بھی میں مطمئن تھی۔ یہاں سیاں نہیں تھے لیکن ان کی یادیں ہر چیز سے وابستہ تھیں۔ ان کی یادگار۔۔۔ سب بڑی یادگار صاعقہ میرے پاس ضرور تھی۔ اب زندگی تلخ نہیں تھی لیکن ناگوار ضرور تھی۔“

آیا کی آواز رندہ گئی۔ آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ صاعقہ اس کے بازو میں سمٹی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

ہر آنکھ پر غم تھی۔ ناجی کے لیے عقیدت ہر دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس واقعے ہرگز کو سب احترام سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر سوگوار سی خاموشی رہی۔ پھر رحمان آگے بڑھے۔ ان کے جذبات میں شدید پھل تھی۔ آیا کے سامنے دوڑاؤ بیٹھے ہوئے لہنا سر اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

”آپ کتنی عظیم ہیں۔۔۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولے ”کتنے دکھ جھیلے آپ نے۔“  
ناجی نے صاعقہ کی پشت سے اپنا بازو کھینچا۔ دونوں ہاتھوں سے رحمان کا ہرہ تمام کر چکی اور ان کی فراخ پیشانی پر شفقت سے بوسے دیتے ہوئے بولی ”میرے بچے۔۔۔ بچے



ان وکٹوں کا اس لمحے ذرہ بھر احساس نہیں۔ آج میں کتنی خوش ہوں، کوئی نہیں جان سکتا۔

ناجی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔

”تمہاری خوشیاں تمہیں مبارک ہوں، بچی“ حسن بانو ناجی کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔ ناجی احتیاطاً آنسو کو روکی۔

اور حسن بانو نے اپنی وضع داری کے شکار کو سینے سے یوں لٹکالیا جیسے یہی اُن کا سرمایہ حیات ہو۔ ان کی آنکھیں بھی پُر نم تھیں۔

ناجی کی عظمت کے سامنے سب سرنگوں تھے۔

اس رات کوئی نہ سوسکا۔ صبح خوشیوں اور مسرتوں کی پیہر خاہر تھی۔

فوریہ کا دماغی انتشار ختم ہو چکا تھا۔ سعدیہ نے اسے ناجی کی داستانِ الم کہہ سنائی۔ سو یا ہوا ضمیر جاگ اٹھا۔

وہ حسن بانو کی نشست گاہ میں آئی جہاں ناجی حسن بانو کے پاس بیٹھی تھی۔ صاف و ریحان اس کے دائیں اور حسن آرا و انجم بائیں طرف بیٹھے خوش گیدیوں میں مصروف تھے۔

وہ سیدھی ناجی کی طرف گئی۔ اس کے قدموں پر جھک گئی۔ آنسوؤں میں رندھی آواز سے اپنے ہییمانہ رویے کی معافی چاہنے لگی۔

ناجی نے پاؤں کھینچ کر فوریہ کو اٹھایا اور گلے سے لٹکالیا۔ دونوں رو رہی تھیں۔ ایک اپنے جُرموں کی سیلابی دھونے کے لیے اور دوسری ان جُرموں کی بخشش کے لیے۔ عفو و تقصیر کا یہ مظاہرہ استہاجان گداز تھا کہ کوئی آنکھ نم ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔